



ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR MUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA

JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before
taking it out. You will be res-
ponsible for damages to the book
discovered while returning it.

DUE DATE

CI. No. 320.1

Acc. No. 14946

1689.651

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.

[illegible]

سیاسی افسب العین

کرشن چند رائے سکسینہ
ام۔ اے (تاریخ)
جامعہ عثمانیہ سکسری عالی

کتاب ہذا

اکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی اجازت سے

طبع کی گئی ہے

سلسلہ کتب علم الہیات نمبر (۱)

سیاسی نصیبین

مترجمہ

کرشن چندر رائے سکینہ

ام۔ اے (الہ آباد)

شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

سابق

پروفیسر تاریخ ازبکستان تھورن کالج لکھنؤ
مددکار شعبہ انگریزی کیننگ کالج لکھنؤ
پروفیسر تاریخ لکھنؤ کرپچین کالج لکھنؤ
وغیرہ

۱۳۴۵ھ

۱۳۵۴ھ

(حقوق محفوظ ہیں)

بنامِ جہاں دار جاں آفریں

گر قدم حبشیم ما خواہی نہاد دیدہ ور رہی نہسم تائی روی

پہلی مرتبہ

آنزیل نواب مہدی یا خٹک بہادر

ام۔ اے (اکسفورڈ)

معین امیر جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

(وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی)

و

صدر المہام تعلیمات و سیاسیات عامہ معلومات عامہ بلدیہ وغیرہ

گر شرف قبولیت ہو حاصل سمجھون گا مراد دل برائی

”قیاس کن ز گلستان من بهار مرا“

تقریب

مشہور مسئلہ ہے جنگ و وس و وارو کا
ڈھال سر پہ ہو کہ شمشیر بھری یا لہ کا

۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم چھڑی تو ہر سمت سے سیا و بادل امنڈ اُمنڈ کر
زم پورپ پر محیط ہو گئے۔ سیاسی فضا، اس قدر کدر ہوئی کہ بعض دور اندیش
فکرین کو یہ اندیشہ دامن گیر ہوا کہ جنگ کی دہشت انگریزوں اور پیٹرن کی تخریب
تباہی کے باعث ہوں گی۔ لہذا اس خونریزی اور بربادی کے خلاف صدائے
خارج بلند ہونے لگی۔ لڑائی کو ہر پہلو سے مردود اور ملعون قرار دینے کی کوشش کنگلی
میں اگر ہو ٹھیک تو سب کام بھی ہو ٹھیک
آغاز بھی ہو ٹھیک تو انجام بھی ہو ٹھیک

چنانچہ ۱۹۱۵ء میں مشہور مورخ علامہ ڈیلایل برنس نے سیاسی نصب العین
کے نام سے ایک مقالہ انگریزی زبان میں اسفورڈ یونیورسٹی پریس کے معرفت اسی
رض و غایت سے شائع کیا جو نہایت کارآمد اور مقبول ثابت ہوا۔
بعض جامعات مثلاً آلہ آباد یونیورسٹی نے ٹیلیسٹین (ایم۔ اے) کی جانت
کے لئے ”سیاسیات متقابلہ“ کے انصاب میں اسے داخل بھی کر لیا تاکہ بہائیک
بڑھی کہ عرصہ پندرہ سال میں دس بار اشاعت کی ضرورت داعی ہوئی اور ہر مرتبہ

کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی۔

نیز ایک انقلاب کا یادور پیرح کا
موقوف صلح پر ہے نہ موقوف جنگ پر

آج بھی اطالیہ اور حبش میں غضناک نہرو آزما رہی ہے خطرہ ہر وقت
درپیش ہے کہ خس و خاشاک میں پڑ کر کہیں یہ آگ شعلہ زن نہ ہو جائے۔ اس امر میں
ذرا بھی دریغ نہیں کہ اس نوعیت کی جنگ کو یورپی اصطلاح میں تہذیب کی
اشاعت اور تبلیغ کا موجب تصور کیا جاتا ہے۔ مگر

”تفریق جو ہے قائم و غیب قدرتی ہے“

بہر بھی لڑائی کچھ ایسی شے نہیں ہوا کرتی جسے کوئی قوم بے اعتنائی سے
نظر انداز کر سکے۔

جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینہ میں تصویر نظر آتی ہے

کتاب ہذا مارچ ۱۹۳۲ء کے نسخے کا ترجمہ ہے جو اس موقع پر اس نیت سے
ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے کہ اردو دان اصحاب بھی روزمرہ بول چال کی ہندوستانی
زبان میں ان معنی خیز اور پر اسرار روایات سے وقوف حاصل کر سکیں جنہیں
یورپ کے مختلف اقوام نے بطور نقش غیر فانی صفحہ عالم میں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے
ہیں اپنا احسان مند بنالیا ہے اور جن میں یورپین سیاسیات کا راز سر لستہ ہے۔

قصہ حشمت ماضی کو نہ مہمل سمجھو

تو میں جاگ اٹھتی ہیں اکثر انہی افسانوں سے

یہی ۱۹۱۴ء کی لڑائی اقلیم ہند میں بھی قومی بیداری کے لئے ہمیز کا کام
کر گئی۔ قومیت و وطنیت۔ قوم پرستی کا جوش ہر رنگ ریشہ میں سرایت

۴
 کر گیا۔ علمائے جب اپنے تخیل کو جنبش دی تو عقل رسائے کار ساز بن کر قدیم طرز
 یعنی غیور زبان میں حصول تعلیم کے مضرت رساں اور روح فرسا تقابص کو
 روز روشن کے مانند منکشف کر دیا۔ پھر اس نتیجہ پر پہنچا کیا دشواری تھا کہ تعلیم
 کے لئے صحیح اور فطرتی ذریعہ اپنی ہی زبان ہو سکتی ہے۔

دل میں نازہ عظمت ویرینہ کا احساس ہے

یاس کے عالم میں بھی قایم اسی سے آس ہے

اگر کسی قوم میں الواغزمی اور اخوت کی روح بیہوش نہ ہو تو اس کے
 مایہ ناز نوہالوں کو ابتدا سے انتہا تک ان کی مادری زبان میں تعلیم دلائی جائے
 اور ساتھ ہی ساتھ علوم و فنون کا مکمل ذخیرہ بھی قومی زبان میں ہی لکھا جائے۔

ہر کے راہر کارے ساختند

میلش اندر طبع او انداختند

یہ ہے خلاصہ عرضداشت جسے پرمیل فرمانِ جنہوی رائیٹ انریبل

نواب ڈاکٹر سر اکبر حیدریؒ، نواب حیدر نواز جنگ بہادر بی۔ اے کے

ٹی۔ پی۔ سی۔ یل۔ یل۔ ڈی، صدر المہام مالیات و نائب صدر اعظم باب حکومت

سرکار عالی نے بحیثیت معتمد عدالت و تعلیمات و کو توالی و امور عامہ ۱۹۱۹ء میں

بارگاہ جہاں پناہی میں پیش کرنے کی عزت حاصل کی تھی اور جنکی توجہ و امداد اور

خاص اہتمام سے جامعہ عثمانیہ کے قیام و انتظام کا عظیم الشان کام صورت پذیر ہوا

زبان پہ بار خدا یا یہ کس کا نام آیا

پس حقیقت یہ ہے کہ سرزمین ہندوستان میں اکتسابِ علم کے لئے

جدید قوی نصب العین کو بروئے عمل لانے میں پیش قدمی اور رہنمائی کا طرہ امتیاز

واقفکار اگر کسی مقدس ہستی کو حاصل ہے تو وہ ہے ذاتِ ہمایونی شاہِ جہاں سلطانِ عالم

بزرگوار الیڈ ہائینس - رستم دوران - ارسطوے زمان - سپہ سالار - آصفیاء -
 مظفر الممالک - نظام الملک نظام الدولہ - نواب میر عثمان علی خاں بہا
 فتح جنگ جی - سی - ایس - آئی - جی - بی - ای - یار وفادار تاج برطانیہ
 خسروے دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

جن کی عظیم الممالک علم پروری اور علمی سرپرستی
 نے

جامعہ عثمانیہ

کو

قائم فرما کر اپنی عزیز اور جانثار رعایا کے لئے خود شناسی اور خود داری
 کے بیش بہا جذبات کی تربیت و پرداخت کا سنہرا اور نادر موقع عطا فرمایا
 بام رفعت پہ پہنچنے کا یہی زینہ ہے

اعلیٰ حضرت و اقدس کایہ کارنامہ اس قدر درخشاں اور لاثانی ہے
 کہ اس کا ذکر و تذکرہ ہندوستان کی علمی تاریخ میں ہمیشہ فخر و مباہات سے کیا جائے گا
 کام کرتے ہیں رضا کار رضا مندی سے

بس اگر کتاب ہذا سے جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کسی طرح مستفید ہو سکیں اور
 اردو زبان اور اسی کے وسیلے سے اس دور عہد آفریں میں ملک و ممالک
 کی کچھ خدمت بھی انجام پاسکے تو ناچیز کی محنت رائیگاں نہ جائے گی۔

فردوس کا منظر ہے نگاہوں کے مقابل
 یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ حضور پر نور کی تخت نشینی مبارک کی پچیسویں سالگرہ عید کا

جشنِ مایونی منقریب بڑے نزک و احتشام سے منایا جائیگا۔ لہذا اغفیت و وفا و ایسی کی دلی آرزو یہی ہو سکتی ہے کہ اس مختصر مقدمہ کو شاہی ترانہ پر ختم کیا جائے جو قد زنا زبانِ زوہرِ خاص و عام ہے۔

”تا ابد خالقِ عالم یہ ریاست رکھے پرتجھ کو عثمان بعد احوال سلامت رکھے
جیسے تو فخرِ سلیمین ہے بفضلِ نبی و ابی یوں ہی مت ازتراد و حکومت رکھے
آلِ اولاد کو اللہ دے عمرِ حضریٰ پان سے آباد تراخانہ دولت رکھے
جو وقایم رہے شرمندہ احساں تیرا بہ عدل کہہ ہی کو خجل تیری عدالت رکھے
خندہ زن صورت گل تیرے ہوا خواہ میں آ کے قدموں پہ عدو فرق اطاعت رکھے
سب رعایا کو تری سالگرہ کی تقریب پانشاط و طرب و عیش و مسرت رکھے
بن کے ساتی ترا اقبال نظامِ سابع
تجھ کو صہبائش خمتانہ عشرت رکھے

خالسار

کرشن چندر رائے سکینہ (بھنوی)

”رشی شیش“

حیدر آباد کن

یکم جنوری ۱۹۳۶ء

فہرست مضامین

(۱) نشان صفحہ ابتدائی

عنوان

(۳)

انتساب

(۵)

تقریب

(۱۰)

فہرست مضامین

(۱۳)

غلط نامہ

(۱۱)

پہلا باب

نصب العین کی تاریخ
تاریخ کا مقصد: تاریخ کے اقسام: تاریخ معیار کے طریقے: تاریخ مقاصد
تہذیب کی تاریخ ہے۔

(۲۵)

دوسرا باب

ایتمضہ کی آزادی
ایتمضہ کا نصب العین سیاسی آزادی کے دو اقسام: آزادی کے سیاسی معیار
کی ابتدا ایتمضہ میں کیسے ہوئی۔ ایتمضہ کی خود اختیاری۔ ایتمضہ میں انفرادی آزادی
ایتمضہ میں آزادی قلب۔ آزادی کے متعلق حکماء کا خیال۔ اہل ایتمضہ کی آزادی
کا تنقیدی موازنہ نتیجہ۔

(۵۶)

تیسرا باب

نظام روما
نظام کا موجودہ معیار۔ روما کی پہلی جماعت بندی۔ اطالیہ کا اتحاد نظام
روما میں حکومت ہنشاہی کے اثرات۔ روما کے نصب العین کی علم و ادب میں جہلک
نظام روما پر مکتبہ چینی۔

(۸۰)

چوتھا باب

مساوات عالمگیر
عالمگیر معیار نصب العین کی موجودہ صورت۔ معیار جو قومی علیحدہ گی کا متضاد

روا کی عالم بندی۔ روائی اور عیسائی مذہب کی عالمیت۔ غلامی کا انداز۔ غلامی کے متعلق عیسائیوں اور رواقیوں کے خیالات۔ مساوات کے معیار پر نکتہ چینی۔

پانچواں باب ازمنہ وسطیٰ کا اتحاد (۱۱۳)

قرون وسطیٰ کے نصب العین کی اصالت۔ مقدس سلطنت۔ روم۔ زمانہ حال کا یورپین اتحاد۔ ازمنہ وسطیٰ میں معیار کی ابتدا۔ عملیات میں معیار کی جھلک۔ ادبیات میں معیار کا تذکرہ۔ نصب العین کی موجودہ صورت۔ نکتہ چینی۔ نظام جاگیر پر خیالات کا انجمار۔

چھٹا باب نشاۃ جدیدہ کے دور کی فرمانروائی (۱۵۱)

سیاسیات حالیہ میں معیار کی حیثیت۔ عہدہ گزشتہ میں فرمانروائی کا نصب العین۔ معیار کی حیثیت بلحاظ واقعات۔ زمانہ احیاء کے نصب العین کی تشریح۔ علم و ادب میں نصب العین کا بیان۔ تنقید۔

ساتھواں باب انقلابی حقوق (۱۸۱)

مساواة کا موجودہ نصب العین۔ نصب العین کا آغاز انقلابی ہے۔ روم کا نصب العین۔ واقعات میں معیار کا وجود۔ نصب العین کی حد بندی۔ معیار کے نقائص۔ نتیجہ۔

آٹھواں باب قومیت حالیہ (۲۱۱)

ابتدائی خیالات نصب العین اور اس کے موجودہ معنی۔ معیار کی تاریخی ابتدا۔ نصب العین کی موجودہ کارگزاری۔ ادبیات میں معیار کا تذکرہ۔ معیار پر تنقید معیار کے فوائد۔

نواں باب انفرادیت (۲۴۰)

سلطنتوں کی ابتدا۔ شہنشاہیت اور عالمیت۔ شہنشاہیت تک پڑی

کا علاج ہے۔ اصول شہنشاہیت کی حمایت۔ اعتراضات۔ وفاق

سوال باب انفرادیت (۲۷۵)

موجودہ معاشرتی مسئلہ انفرادیت کا نصب العین اور غیر معمولی قابلیت انفرادیت اور زبردست کے خلاف کمزور کا مطالبہ انفرادیت کی تاریخ ادبیات انفرادیت کا لٹریچر۔ جان اسٹوارٹ مل سچک کے خیالات فرانسیسی اور روسی عدم حکومت۔ حامیان انفرادیت کے معیار پر بحث۔ چینی۔ نتائج ابتدائی خیالات نصب العین اور اس کے عام پہلو۔ معیار کی تاریخی ابتداء کارل مارکس کی اشتراکیت معیار کی موجودہ تشریح۔ واقعہ سنجی

سوال باب جمہوریت ۳۲۲
جمہوریت ابھی حاصل نہیں ہوئی ہے جمہوریت کے معنی معیار کی ابتداء معیار کا اظہار۔ معیار کی موجودہ صورت۔ نکتہ سنجی۔

سوال باب بین الاقوامی اتحاد ۳۷۶
معیار کی قدیم صورتیں۔ حالیہ بین الملکیتی تنظیم اتحادیہ کے فرائض اعتراضات چودھواں باب ختم (۴۰۴)

سیاسی تغیرات میں قدرت کا حصہ حالیہ معیار میں اختراعی قوت کی موجودگی۔ قدیم معیار اور ان کے موجودہ اثرات معیار کا ارتقاء سیاسی مسائل اور سیاسی رواج ضمیمہ اول (۴۲۵)

مضمون کے حدود و بیانیات کی نوعیت۔ نصب العین کی نوعیت۔

ضمیمہ دوم (۴۴۰)
سیاسی ارتقاء میں استدلال کی اہمیت۔

غلط نامہ

عکس پر پروف اپڑھنا اور درست کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ کوشش بیع کے باوجود غلطیاں رہ گئیں۔ معمولی فروگزاشتوں مثلاً اوقات فرات کو چھوڑ کر اہم غلطیوں کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ پڑھنے سے پہلے دستی کر لی جائے تو انسب ہے۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵	۸	رے زنی	رائے زنی	۵۶	۴	کسی نہ کسی	کسی
۱۵	۷	ابتداء	ابتدا	۵۹	۱۰	کے لیے	کے لیے کہ
۷	۱۵	جس	جن	۶۳	۹	سلطنت	سلطنت کا
۱۷	۱۰	کر کے	کر لے	۶۶	۱۸	بود و باش	بود و باش
۱۹	۱۵	آن	اُس	۷۷	۷	کرتا	کرنا
۳۰	۱۷	مسئلہ	مسلمہ	۶۸	۸	زبان میں	زبان کو
۳۱	۱۳	جس	جن	۷۰	۱۴	ڈاڑھیاں	ڈاڑھیاں
۴۶	۶	ہو	ہوا	۶۹	۵	ہوتے ہیں	ہوئے ہیں
۴۸	۱۱	سن	سنہ	۷۱	۱۶	لکھا ہے	لکھنا ہے
۴۹	۱۷	نیش	نیشے	۷۲	۱۷	کہے گا	کہئے گا
۷۰	۱۸	آتی ہیں	آتی ہے	۷۳	۱۳	طور پر	طور پر
۵۳	۱۲	وجود	وجود	۸۱	۷	بھی	ابھی
۵۴	۵	وہ نہیں	وہ	۸۵	۱	عاس	عالمگیر

گمراہ	گراو	۳	۲۰۷	بعد	ما بعد	۱	۹۷
ٹھیکرانا	ٹھیکرانا	۱۳	"	بڑھنا	پڑھنا	۱۱	۱۳۳
دی	دی	۵	۲۰۸	شورش دجوش	شورش خوج	۱۵	۱۳۶
کر لے نیسے	کر لے نیسے	۱۳	۲۱۳	امن دامن	امن دامن	۱۶	۱۴۱
جغرافیہ	جغرافیا	۱۰	۲۱۴	پتھر	پتھر	۱۷	۱
میں	میں	۶	۲۳۰	چاہئے	چاہئے	۱۴	۱۴۸
عمومی	عموری	۳	۲۴۴	ڈالنے	انے	۱۶	"
زنجیر	زنجیر	۵	۲۴۷	اور خراب	در خراب	۱۷	"
سادہ	سلوہ	"	"	خیال	ایخیال	۱	۱۵۶
حب	جب	۹	۲۵۱	آونیاں	رونیاں	۱۰	۱۵۸
بول	بول	۱۷	۲۵۷	کتنی تھی	کتنی تھی	۱۱	۱۵۶
اجزاء	اجزاء	۱۵	۲۶۴	منتظمہ	منتظمہ	۱۰	۱۶۷
وفاقہ	وفاقہ	۸	۲۶۹	میکیاولی	میکیاولی	۲	۱۷۸
ملکہ	ملکہ	۸	۲۷۷	دینے	دیتے	۱۴	"
ذاسی	ذاسی	۱۷	۲۷۹	یا	با	۶	"
صلاحیت	صلاحیت	"	"	بیوریتی	بیوریتی	۶	۱۹۵
سی	سی	۱	۲۸۱	یہ ہی	یہن	۱۹	۱۹۷
طبیعیات	طبیعیات	۱۶	"	شرح	شرح	۸	۱۹۸
لائنجز	لائنجز	۱	۲۹۲	وفاداری	کی وفاداری	۳	۱۹۹
بالغ ہوں	بالغ ہوں	۱۸	۲۹۷	طور	فور	۱۸	"
				ایسے	اسی	۹	۲۰۲

۱۶	۳۰۷	ہوجاتا	ہوجانا	۱۱	۳۵۷	اشراقی	اشراقی
۵	۳۰۹	منتقل خیز	منتقل خیز	۵	۳۶۰	نہیں میں	نہیں میں
۱۷	"	امحاشیات	امحاشیات	۱۶	"	ابتدا	ابتدا
۳	۳۱۸	سیاب	اباب	۱۰	۳۶۵	منتظم	منتظم
۱۷	۳۲۳	کا	کا	۶	۳۶۶	چارمانہ	چارمانہ
۱۹	"	سما	سما	۱۱	۳۶۸	خارجیہ	خارجیہ
۱۷	۳۲۶	دنیا میں	دنیا میں	۱۲	۳۷۱	وو	وو
۶	۳۲۸	میں	میں	۸	۳۷۳	دارون	دارون
۱۶	۳۳۸	تنظیمت	تنظیمت	۲	۳۷۴	کو	کو
۹	۳۳۹	کہ	کو	۴	"	مجموعہ	مجموعہ
۱۹	۳۴۰	اگر	س	۴	۳۷۷	خارجیہ	خارجیہ
۴	۳۴۲	منتظم	منتظم	۵	۳۷۸	ناہرین	ناہرین
۱۶	۳۴۵	احسانات	احسانات	۱۶	"	کے	کے
۱۷	۳۴۷	شعائر	شعائر	۱۴	۳۷۹	کس	کس
۱۴	۳۵۰	سیاہانہ	سیاہانہ	۱۴	۳۸۰	ملائیت	ملائیت
۱۶	۳۵۲	دولت	یادولت	۲	۳۸۲	گوناگوں میں	گوناگوں میں
۱۳	۳۵۳	اخاء	احیاء	۵	۳۸۰	براسن	براسن

۴۴۱ - ۵ - سنیرا - اسپنسر

۴۴۱ - ۷ - فلسفیانہ - فلسفی

۴۴۲ - ۸ - کام لیتا - کام لینا

نوٹ :- اس کتاب میں کس اور کس سے کلیسہ بنایا گیا ہے عربی میں کلیسا ہے۔

اے دستک دیوے تو آغاز

عقائے نظر بلند پرواز

(یعنی)

پہلا باب

نصب العین کی تاریخ

(الف) تاریخ کا مقصد

عہد ماضی زمانہ حال سے اس قدر پیوست ہے کہ مہذب ممالک کے سیاسی حالات کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے متواتر ان واقعات کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے جن کا نقش آئینہ ہستی پر باقی نہیں رہا۔ عام طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو باتیں ہم عموماً کہتے ہیں ان کے لرنے کے واسطے ہم کس طرح آمادہ ہو گئے۔ محض اس امر کی تشریح کا نام "تاریخ" ہے جو کچھ اب تک وقوع پذیر ہو چکا ہے اس میں ہم کو صرف اس لیے دلچسپی حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم ان واقعات کا مدعا و مقصد سمجھنا چاہتے ہیں جو دور موجودہ میں پیش آرہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جو کچھ آئندہ واقع

ہونے والا ہے اس پر اثر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اسے ہم کو عہد گذشتہ کی تاریخ کی ضرورت
 ہے پس تا وقتیکہ کہ نئی خاص معلومات تکمیل نہ ہو، تاریخ کا وجود ہی سراسر بے سود
 ہے یہ جاننے کے علاوہ کہ عہد سلف نے دور ماضیہ کی صورت کیونکر اختیار کی
 ہم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ثانی الذکر ایک بہتر مستقبل میں کیونکر تبدیل کیا
 جاسکتا ہے۔ یہی ایک خاص کام مورخ کے لیے درس تاریخ میں بنائیت و ستوار
 ہے کہ عہد ماضیہ کی تاریخ سے بہرہ یاب ہونے پر بھی وہ ہمیشہ مستقبل کے لیے
 غور و فکر کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کی توجہ ماضی میں محدود
 و مرکوز ہو جائیگی اور زمانہ مستقبل کی طرف اس کا رخ ہی نہ ہوگا تو وہ زمانہ فاسدہ
 کے لن و دق صحرائیں پھنس کر رہ جائیگا۔ ممکن ہے کہ مورخ اس تحقیقات و تجسس میں
 گم کردہ راہ بھی ہو جائے اور اس کو ابتدائی کیفیت اور اس کی تصبیح و غور ہی کے
 ذکر و فکر میں مزہ آنے لگے جس کے باعث بالآخر وہ بیرونی حالات سے بالکل غفلت
 ہو جائیگا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح کی سیاسی نجات کے متعلق چھوٹے چھوٹے
 رسائل و جرائد قلمبند کرنے لگے۔ اس حالت سے بچنے اور تاریخ کا مقصد ہمیشہ
 مد نظر رکھنے کے لیے شاید ہی ایک صورت ہے کہ وہ عہد گذشتہ کو مستقبل
 ہی جیسے جیسا کہ وہ کسی زمانے میں تھا اور تبدیلی کے خیال کو ختم شدہ ماننے
 کے بجائے ایسا تصور کرے کہ وہ ہمارے آگے آگے چل رہی ہے۔ اس لیے
 اس امر کے سیاسی پہلو کے متعلق کہ کون کون چیز حاصل کرنے کے قابل ہے
 "نشوونما" کے خیال کا محض یہی مفہوم ہونا چاہیے جو سلور بالائی ہم درج
 کراے نہیں۔

زمانہ حال میں جو حالات اور واقعات ہمارے سامنے موجود ہیں یہی ظہورِ پراپا نہیں سے مطلب رکھنا مناسب ہے اگر فی الواقع بیسویں صدی کے بالمقابل کوئی ایسی صدی ہے جس کے ساتھ ہم کو دلچسپی ہو سکتی ہے تو وہ اکیسویں صدی ہے۔ ہم گزشتہ واقعات پر نظر اس لیے ڈالتے ہیں کہ ان کے امتداد سے اُن انقلابات کا اندازہ کر سکیں جو آئندہ رونما ہونے والے ہیں جس چیز سے ہمیں کام لینا ہے پہلے اُس کی نوعیت کی تحقیق کرنا پڑے گی۔ اور اس کے ساتھ تبدیلیوں کا تجسس کر کے وہ طریقہ دریافت کرنا ہو گا۔ جس سے اس قسم کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں انسان اور دولت کے موجودہ تعلقات میں خرابی کے ساتھ کچھ خوبی بھی موجود ہے اور وہ خوبی کچھ ایسی ہے جس کی بنیاد پر آئندہ ترقی کی دیوار تعمیر ہو سکتی ہے جتنے موجودہ نقائص ہیں ان میں سے بعض خیالات اور اصول ایسے پیدا ہوتے ہیں جن سے بہتری کا پتہ چلتا ہے مگر ان کی ابتداء حال ہی میں ہوئی ہے یہاں ان تمام خیالات کے درس اور تفہیم کی اس لیے ضرورت ہے کہ اس کی مدد سے ہم اُن قوتوں کو جو سیاسی زندگی میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ ایسے راستے پر لگائیں جو ہم کو پسند اور مقبول ہو لیکن ایسے خیالات کی تیاری ابھی تک ممکنہ نہیں تیار ہوئی ہے۔

(ب) تاریخ کے اقسام

نسل انسانی کے صعود و اضمحلال کے درس کے لیے مستند طریقے ہیں۔
مجملاً ہم اُن طریقوں کو چار اقسام پر منقسم کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔ تاریخ سنسن و

واقعات (۲) تاریخ شجاعت (۳) تاریخ جمہور (۴) تاریخ موالید۔

تاریخ سنین و واقعات۔ واقعات کو سنوں کے لحاظ سے

قلبند کرنا کار آمد ہے۔ اس سے ہر ایک واقعہ کی یکتائی کا پتہ چلتا ہے۔ اور آخر کار اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ کبھی خود کو دہرائی نہیں یعنی جو کچھ اب تک ظہور پذیر ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے اُسذ وہ پھر واقع ہونے کا نہیں۔ دراصل اس کو ایک ایسا مقبرہ کہنا چاہیے جس میں گذشتہ واقعات مدفون ہوں۔

ابھی تک صرف تاریخوں اور واقعات کی فہرست ہی کو تاریخ سمجھا جاتا تھا کہ فلاں زمانہ میں کس کس وقت اور کیا کیا واقعات نمودار ہوئے لیکن نہ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد موجودہ کیوں کر ظہور میں آیا اور نہ یہ معلوم ہوگا کہ اُسندہ مستقبل کس طرح اور کیسا بنیاد ہوگا۔ محض ان باتوں سے کہ بادشاہوں کی شادیاں کس کے ساتھ ہوئیں یا یہ کہ کتنی لڑائیاں کس کس زمانے میں ہوئیں ہم ہرگز اپنے موجودہ عادات و خوارق کا اندازہ نہیں کر سکتے پُرانے طرز کی تاریخ چند چدیدہ واقعات کی ایک فہرست ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے اُس تاریخ سے زمانہ موجودہ کی زندگی عا پر ذرا بھی روشنی نہیں پڑتی تھی۔ اور نہ اس سے کوئی ایسی بات ہی ملتی تھی جس کی اعانت سے ایک بہترین مستقبل کی تیاری میں مدد مل سکے۔

منتخب اور خاص واقعات کی فہرست کی حیثیت سے تاریخ سے

اگر کوئی کام نکلتا۔ یہ تو وہ قصے کے پیرایہ میں وقایع نگاری کرنا ہے۔ اور اُن کی صرف اسی قدر قیمت ہو سکتی ہے جتنی کہ کسی اخباری جزو ن کی ہو اگر ترقی ہو لیکن ایسی تاریخیں قلبند کرنا جس سے اتنا ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ کس

زمانہ میں کون واقعات کس کس وقت عہد پذیر ہوئے۔ ایک قسم کی اخبار نویسی ہے اخبار میں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ حالانکہ اس میں تمام دزمرہ پیش آنے والے حالات کا مکمل حال ہم پہنچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے لیکن دراصل اس کی تو وہ چیز واقعات تک محدود رہتی ہے۔ قتل۔ طلاق۔ اور جماعتی سیاسیات پر تفصیل سے بحث کی جاتی ہے۔ لیکن ہر شخص کما حقہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ انسانی زندگی فقط انہیں چند منتخب واقعات اور حالات پر مشتمل نہیں۔ اگر اتنی ایسا ہوتا تو لوگوں کو اس میں ذرا بھی دلچسپی نہ ہوتی۔ واقعہ جس قدر معمولی ہوگا اُسی قدر اس میں دلچسپی کم حاصل ہوگی۔ اسی وجہ سے اگر کوئی اخبار طلوع آفتاب کے متعلق کوئی خاص لکھنی نہیں کرتا ہے یا اس بارے میں اس کا قلم صفحے کے صفحے سیاہ نہیں کرتا کہ دینا میں انسانوں کی ایک کثیر تعداد اطمینان اور فراغت کے ساتھ بسر اوقات کرتی اور قتل و غارتگری کے گناہ سے باز رہتی ہے اور سیاسی نزاکتیں اس کو سرسبز اور پریشان نہیں کرتی ہیں تو ہمیں شکایت کرنے کا مطلقاً حق نہیں حاصل ہے۔ بایں ہمہ اسی قسم کی عام باتوں پر ہماری ترقی کا دار و مدار ہے اور اس امر سے قطع نظر کر کے کہ وہ کیسی ہی غیسر و پچسپ کیوں نہ ہوں۔ اُن سے ہمیں اپنی موجودہ صورت حالات کو سمجھنے میں بڑی اعانت مل سکتی ہے۔ ہم اخبار نویسی کے شاکہ نہیں ہیں لیکن اس قسم کی اخبار نویسی سے ہم کو ضرور گلا ہے جو گدزے ہو عہد کی تاریخ کہلائی جانے کی دعویدار ہے۔ یہ خیال اور بھی زیادہ مزیدار معلوم ہوتا ہے کہ اخبار نویسی کی بدولت تاریخ نویسی کا فن زیادہ آسان ہو جائے گا کیونکہ اگر کوئی ذرا اس سے ہو سکتا ہے تو وہ یہ کہے کہ آئندہ زمانے کے مورخوں کو یقینی طور پر یہ سہل ہو جائے گا کہ

اخبارات میں جتنی باتیں شائع ہوتی ہیں اُن کی اپنے زمانہ کے حالات زندگی کے لحاظ سے کچھ بھی وقعت نہیں ہوتی۔

ایک وحشی برق و باران کا طوفان دیکھنا ہے اور اس کا زور و شور کا اندازہ کرنے سے کانپ اٹھتا ہے لیکن اُس کو اُن برقی لہروں کی مطلق خبر نہیں جو ہمیشہ سطح زمین پر گزرتی رہتی ہیں جو تارخ میں تبدیلیوں اور بجلی کی چمک سے کہیں زیادہ طاقت کا اظہار کیا کرتی ہیں۔ جو شخص اخبار میں ہوتا ہے وہ اس لحاظ سے ہمیشہ ایک وحشی بنا رہے گا کہ وہ مخصوص اور چیدہ کیفیتیوں کو اہم سمجھ بیٹھا ہے۔ مگر ہمداراً کہنے کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہے کہ منتخب اور خاص حالات کا حضرت انسان پر اثر نہیں پڑتا۔ اس بیان سے کہ ایک قاتل گرفتار ہوا اور اس کو سزا ملی۔ ایک بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ بایں یہ ایسی تاریخ کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جس میں کسی زمانہ کے مخصوص واقعات کے جلوہ نما ہونے کی تاریخوں کا ذکر کیا گیا ہو۔ لوگوں پر ان کے زمانہ کے معمولی سرگزشت کا زیادہ اثر پڑتا ہے خواہ وہ علانیہ طور پر کم معلوم ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج جو کچھ حالات پیش آرہے ہیں وہ کل کے کوالت کی بنا پر رونما ہوئے ہیں۔ لیکن تاریخ کے اس بیٹھ بھاٹھے میں بھی جوگزشتہ واقعات کے منقول ہماری ذاتی یادداشت پر مشتمل ہے۔ یہاں یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ ہمارا موجودہ وجود ہمارے عالم لفظی کے معمولی واقعات ہی کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح سے بنی آدم کی ترقی کی تاریخ میں ان باتوں کے پڑھنے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہوتی کہ والدین اپنی اولاد سے چوتھی صدی میں محبت کیا کرتے تھے یا بعض لوگ بارہویں صدی میں تعلیم و تربیت دے جانے سے زیادہ

دانشمند ہوئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ صورت حالت پیدا کرتے ہیں جشیوں کے ہفتہ ملک روم کی برابری یا عالم جید و فاضل جل امبارڈ کے مصائب کے مقابلہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا زیادہ اثر پڑا ہے۔ معمریات کی تاریخ غالباً غیر ممکن سی ہے۔ اگر مسلسل اس تاریخ سے اس امر کی صراحت مقصود ہے کہ زمانہ حال کے ظہور پر گزرے ہوئے عہد کا کیا اثر پڑا تو عہد ماضیہ کی تاریخ میں مدت ہائے دراز کی عام حالت کا ذکر اس زمانہ کے خاص واقعات کے مقابلہ میں زیادہ ہونا چاہیے

تاریخ میں ایک علم ہونے کی خصوصیت پائی جاتی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تمام زمانوں کے ایک ہی قسم کے حالات کے متعلق عام معلومات حاصل ہوں اور یہ کہ ایک بہادری کا کام یا ایک یادداشت ایسے واقعات کی ہے جو دوبارہ ظاہر نہیں ہو سکتے ہذا دونوں باتیں یعنی اولاً یہ کہ تاریخ کا اعادہ ہوا کرتا ہے اور دوم یہ کہ کوئی واقعہ جو کہ ایک مرتبہ ہو چکا ہے پھر اس کا ظہور نہیں ہو سکتا اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔

جو مورخ اصولی طور سے تاریخ لکھتے ہیں وہ جس وقت عام قانون پر بحث کرنے لگتے ہیں تو انفرادی نظائر کو نظر انداز کر دیتے ہیں اس کے برعکس جب کوئی وقائع نگار تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ اس علم قانون کو بھول جاتا ہے جو ہر ایک واقعہ کی تہ میں اپنا کام کر رہا ہے۔ تاریخ میں سنیں اور واقعات کو جگہ دی جاتی ہے لیکن ان کو خاص مسرت حاصل نہیں اور اگر بڑے بڑے مورخوں کا ذکر کیا جائے تو یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ انہوں نے

سین اور واقعات والی تاریخوں کی اہمیت بجا طور پر کم کر دی ہے۔

جب سے سین اور واقعات کی تاریخ کا طرز رائج ہے اس وقت

سے اب تک اس باطنی طاقت کو نمایاں کرنے کے تین طریقے چلے آتے ہیں جس

نے عہد گذشتہ کی تکمیل میں حصہ لیا تھا۔ ایک طریقہ ناول کا ہے جس میں

بڑے آدمیوں کی مہمات کا تذکرہ درج کیا جاتا ہے اس کو تاریخ شجاعت کہہ سکتے

ہیں کسی بزرگ کے زمانہ میں جو کچھ حالات ہوئے ہیں ان کو سمجھنے کے لیے

اس کی شخصیت کی نسبت یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ بس اس کے بعد اب کوئی ہستی

اور نہیں پیدا ہو سکتی اور نہ ان مخفی رموز کی تشریح کی جا سکتی ہے جنہوں نے ایسے

شخص کے ذریعہ سے اس کے زمانہ کے واقعات کے نمودار ہونے میں حصہ لیا ہے

لیکن بڑا آدمی اکثر اپنے زمانہ کا پیغمبر ہوتا ہے اس کی جو کچھ ذاتی شخصیت ہے وہ

انہیں لوگوں کے اثر سے بنی ہوتی ہے جن کے درمیان اس کی بود و باش رہا

کرتی ہے۔ حالانکہ تاریخ شجاعت میں دلیل سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ کسی

وقت پر کسی بڑے آدمی کے ظہور کا سبب بتایا نہیں جا سکتا ہے پھر بھی اس سے

ترقی کی پوری طاقت کا پتہ نہیں چلتا اس لیے تاریخی استدلال کا دوسرا طرز مروج

کیا گیا جس میں خاص طور پر جمہور کے خوارق و رسوم کا حال درج کیا جانے لگا

اس کو تاریخ جمہور کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے اس میں عہد حاضر کے

علوم کی حالت کا درس کیا جانے لگا کیونکہ اس کی ہستیا سے ہر آدمی کی موجودہ

حالت کا سبب دریافت ہو سکتا تھا۔ زمانہ ماضی کے خلق تحقیقات و تجسس کے لیے

معاشی زندگی پر مبنیوں کی نظر ڈالنے لگی اور مہم کو یہ بتایا جانے لگا کہ ہم سے پیشتر

جو لوگ گزر گئے ہیں وہ کس طرح کھانے اور بات چیت کرتے تھے اس میں بھی کچھ
 فروگزاشت ہوئی۔ زمانہ قدیم میں جو لوگ کچھ کرتے تھے اس کے تذکرے ہی سے
 اس بات کا جواب نہیں ملتا کہ موجودہ زمانے کے لوگوں کے دستور اور طرز معاشرت
 وغیرہ ان لوگوں سے کیوں مختلف ہیں۔ ماضی و حال کی مماثلت کا سبب تو جمہوری
 تاریخ کی مدد سے ضرور معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کے اہل جو کچھ اختلاف ہے اس کے لیے
 کوئی دلیل اس تاریخ سے دستیاب نہ ہوئی۔

چوتھا طریقہ تاریخ مولید کا رائج ہوا جس میں قدرتی اسباب پر بحث کی جاتی
 ہے اس میں شک نہیں کہ دنیا کی تہذیب میں جس قدر انقلابات پیش آئے ہیں
 وہ ملک کی آب و ہوا یا نسل کے اثرات سے رونما ہوئے تھے ان اسباب کے ساتھ
 ہی ان طاقتوں کو بھی شامل کرنا پڑ گیا۔ جن کا درس کم سے کم سیاسیات کے قدیم
 طریق پر کیا جاتا تھا۔ رسد و مطالبہ اور بازاری نرخ وغیرہ کے قوانین کا اثر گردہ انسانی
 پر ضرور پڑتا ہے اور اس بات کا جواب کہ موجودہ حالات نے اپنی یہ صورت کیوں
 اویس طرح اختیار کی۔ ان چیزوں سے کافی طور پر مل سکتا ہے۔

انسانی زندگی کے ساتھ قدرت جو کچھ اپنا کام کرتی ہے اس کے اور موا
 قانون کے دریافت سے تاریخ نہ یہی کہے اس طریقے میں بھی سیالانہ تمیزی ہونے
 لگی۔ لیکن اس وقت سے یہ ظاہر ہو گیا کہ حالات کی اگر پوری تصریح بھی کی جائے
 تو وہ بھی ناکافی ہے۔ کیونکہ انسان کا پوشاک اور خوراک ہی سے تمام تر تعلق نہیں
 علیٰ شخص کو ہست و نیست کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کوئی انسان بھی
 مستزاد یا عامل نہیں ہوتا۔

ایک پانچواں طریقہ اور بھی ہے۔ عہد گزشتہ کے انسانوں کا مقصد زندگی
 کیا تھا؟ وہ کیا کرنے کی امید باندھتے تھے۔ ان باتوں کا درس تاریخ نویسی کا ایک
 طرز ہے اور اس کو تاریخ نصب العین کہتے ہیں۔ ہمارا یہ کہنے کا غرض نہیں کہ ان تمام
 پانچوں طریقوں میں سے صرف ایک ہی واحد طریقہ تاریخ نویسی کا ہے اور باقی طریقے
 مہمل ہیں لیکن ہمیں یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ اگر آپ مستقبل بنانے کے لیے موجودہ حالات
 سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہی نہیں دیکھنا ہوگا کہ بڑے آدمیوں نے کیا کیا اور
 عوام الناس کس طرح رہتے رہتے تھے۔ بلکہ ہم کو اس امر کی بھی تحقیقات کرنا پڑے گی
 کہ اس وقت کے لوگوں کے توقعات کیا تھے جن جن مقاصد کی تکمیل کے لیے
 انہوں نے امیدیں لگائی تھیں۔ ان میں سے کچھ مقاصد پورے ہوئے۔ لیکن پھر
 بھی امید سے وہ کبھی غیالی نہیں رہتے تھے۔ ان کا حوصلہ ان کا ارمان ترقی باقی
 رہ گیا۔ اس کے علاوہ کوئی شخص کسی ایسی بات کو جو ظاہر ہو چکی ہے۔ مگر نہ سمجھ سکتا
 تاوقتیکہ اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس وقت لوگوں کے دل میں کون سے واقعات
 ظاہر کرنے کی خواہش تھی جس حد تک واقعات گزشتہ کے ظہور پذیر ہونے میں ہمارے
 بڑے چھوٹے اہل پیشین کے ارادوں کا اثر پڑا تھا۔ اسی حد تک ان مقاصد یا
 نصب العین کی تقسیم کرنا نہایت ضروری ہے جو ان کی خواہشات کے آگے آگے
 چلتے تھے۔ رائے سلف کے معیاروں کا تذکرہ کر دینے ہی سے یہ سمجھ میں نہیں آسکتا
 موجودہ زمانہ نے اپنی یہ شکل کو بیکراختیار کیا۔ کیونکہ انسانی تاریخ کے واقعات پر تمام
 انسانی خواہشات کی طاقت ہی کا اثر نہیں پڑتا ہے بلکہ ان کا اثر جزوی ہوتا ہے
 اور اسی جزوی اثر کے اعتبار سے ہم موجودہ حالت کی تفہیم درس کی اعانت کو کچھ

آئیں گے چل کر ہیں یہ نپہ چلتا ہے کہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جنہیں زمانہ سلف کے لوگوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی امید تھی مگر وہ پوری نہ ہوئیں۔ اسی امید سے اس فرق کی وجہ ظاہر ہوتی ہے جو ہماری موجودہ اور اہل پیشین کی کارگزاریوں کے مابین واقع ہے کیونکہ جن باتوں کا ہمارے پیشینہ و خواب دیکھتے تھے وہ اکثر اچھے دُنیا سے گزر جانے کے بعد نمودار ہوئی ہیں۔ یضرب العین یا معیار کی تاریخ سے ان معنوں میں عہد ماضیہ اور زمانہ موجودہ کے درمیانی اختلافات و تفرق کا سبب معلوم ہوتا ہے۔ زمانہ حال، عہد ماضیہ میں ایک امید نوا امش، یا مقصد کی شکل میں اپنی ہستی رکھتا تھا اور وہ خواب بھی تھا جس کی پہلے کبھی تعبیر نہیں ہو سکی۔ موجودہ زمانہ میں اس تدبیر کی طرح ایک اہم اثر رکھ سکتا ہے۔ جس میں پہلے ہی کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔

اسی لیل سے معیاروں کی تاریخ ہمارے لیے اس امر کے سمجھنے میں ہماری بہترین رہنما ہے کہ موجودہ زمانہ ایک بہتر مستقبل میں کیونکر تبدیل ہو سکتا ہے کیونکہ جس طرح کسی زمانے میں حال، ماضی میں مضمر تھا اسی طرح مستقبل بھی یہ شکل مقصد حال میں موجود ہے۔ تاریخی پیشین گوئی کا دائرہ محدود کر کے اس امر پر غور کرنے سے کہ ہم کیسے مستقبل کے خواہشمند ہیں کم از کم ہمیں جزوی طور پر تعلق ہے کہ ہماری آئندہ حالت کیسی یا کون سی صورت اختیار کرے گی۔ اسی وجہ سے ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر واقعی ہیں کوئی زمانہ مستقبل نصیب ہو گا تو اُس میں ہمیں یا تو مالی طور پر فارغ البالی میسر ہوگی یا ذہنی ترقی کا خوب دور دورہ رہیگا۔ یہ ممکن ہے کہ اگر اُن حالتوں کا ٹھیک اندازہ نہ کر کے جن میں ہم آج اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں ہم

اپنا معیار قائم کریں تو ہماری خواہش پائیگیل کو نہ پہنچے۔ لیکن ایک معنی کر کے ہم یہ صداقت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے تدابیر کا بہت بڑا اثر ہماری آئندہ حالت پر پڑتا ہے جس طرح ہمارے موجودہ خواہشات ہمارے مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اُسی طور پر موجودہ حالت ہماری پچھلی خواہشات کے تابع ہے اور جس قدر ہم پیچھے نظر دوڑائیں یہ اثر بابرکام کرتا ہوا پایا جائے گا۔ اس طرز سے بہت سے قوانین کا بھی پتہ لگ جائے گا۔

ایتھنز کو اپنے باشندوں کی تمدنی آزادی کے بدولت وہ زاید نصیب ہوا جس میں سقراط موجود تھا۔ اس کے اثر سے روم میں تہذیب پھیلی اور اہل روم کی نظام بندی نے یورپ کو متحد کر دیا۔ ان اثرات کو بخوبی ذہن نشین کر لینے سے اس امر کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے کہ ہمارے اصلاحی تدابیر کس طرح زیادہ کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عام نتیجہ جو اخذ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں کبھی کوئی معیار ٹھیک اپنی صورت میں پورا نہیں ہوا ہے جس شکل میں پہلے پہل اس کا خیال دل میں پیدا ہوا تھا۔

مناخ معیار کے طریقے

لیکن کسی مقصد کا کسی معیار یا کسی ایسی بات کا درس جس کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں کیسے ہو سکتا ہے؟ مقصد اور معیار ایک دوسرے قرض کے مانند دلکش تو ضرور معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کو بخوبی ذہن نشین کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ بظاہر ہماری

رسانی کبھی اس مقصد تک نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اُس مقام کی طرف جہاں پہلے وہ مدعا
 مرکوز تھا ہم جتنی نگاہ پوئی کرتے ہیں اسی قدر یہ مقصد ہم سے روزمرہ دور بھاگتا جاتا
 ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا ایک ایسا موضوع ہے جس پر اس قدر کہا سنا جاسکتا ہے
 کہ تقریباً ہر ایک مقصد اُس طرح و تائید کی آڑ میں نام نہاد ہو جاتا ہے جس کی
 اُس پر بوجھ کی جاتی ہے اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مدعا کی جانب
 ہم اس قدر متوجہ ہوں کہ آخر میں اس کو اسی شکل میں تسلیم کر کے اس کی تعریف
 کرنے لگیں جس صورت میں یہ پہلے پہل داغ میں آیا تھا ہم کو محض معدنیات کے
 درس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خطہ زمین پر کسی زمانے میں کون ایسے جانور موجود تھے
 جن کا اب کہیں نام نشان بھی نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح موجودہ رواج کی زمین پر بھی
 گذشتہ معیاروں کے چھوڑے ہوئے نشانات موجود ہیں۔ یہ باتیں زبان میں
 بھی نظر آتی ہیں۔ بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن سے کسی زمانہ میں بڑا جوش ظاہر
 ہوا تھا۔ وہ جذبات سے ملو ہوتے تھے۔ لیکن وہ بھی بالکل عام ہو گئے ہیں تیشیلاً
 لفظ حریت بااختیار ہی لے لیجئے۔ ایک لفظ میں ابھی تک جان باقی ہے دوسرا
 ایک مہمل اور متروک لفظ ہو گیا ہے لیکن لفظ آزادی یا حریت میں بھی اب وہ
 بات نہیں پائی جاتی ہے جو اس میں پہلے موجود تھی اس کی جو زبردست روح
 تھی وہ تو محض ہی گئی ہے ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اگر کوئی ایسا جوش یا شخص اس کا
 نام زبان پر لائے جس میں ایک مدبر کی سی خوبو نہیں آئی ہے تو اس کے کلام
 میں طاقت ضرور ہوگی۔ اکثر عام تفریروں میں لفظ آزادی کا استعمال ایک معمولی بات
 ہو گیا ہے۔ جسے دستور اس کی عزت ہوتی چلی آئی ہے۔ لیکن زیادہ تر اس کے

استمال میں وہ اہمیت نہیں رہتی باقی جو پہلے اس کو حاصل تھی۔ اب یہ ایک آزادانہ ہی
آواز رہ گئی ہے۔ ذکر ہر شخص حریت کا کرتا ہے مگر تذکرہ کرتے وقت کسی کو یہ خیال
نہیں رہتا کہ وہ اس کو کسی خاص معنی میں استعمال کر رہا ہے۔ اظہار اختلاف کے لیے
الفاظ کی ایجاد و اختراع ہوئی تھی۔ اب اس کا بہترین زمانہ اس وقت ختم ہوتا ہے
جب ان فظوں سے کسی کو نفرت نہیں ہوتی۔ کیونکہ جب کسی لفظ کی نفرت دل
سے چلی جاتی ہے اس وقت کوئی شخص بھی اس کے ساتھ صدق دل سے محبت نہیں
کرتا۔ عہد ماضیہ کے لوگوں نے جس آزادی کے حصول پر اپنی جانیں تک تلف کر دی
تھیں اب وہ محض ایک رسمی لفظ رہ گیا ہے اس کو کوئی خاص اہمیت دے کر نہیں
استمال کیا جاتا۔ پہلے زمانہ میں اس کا زبان سے نکالنا گویا اس کا دل سے احسا
کرنا تھا۔ اب اس کا استعمال صرف اظہار خیال کے لیے کیا جاتا ہے تاہم اس لفظ کی
موجودہ حالت میں بھی ہم کو اس کے اندر کم از کم ایک قوت اب بھی کام کرتی نظر آتی
ہے۔ جس کی بدولت گذشتہ زمانہ بے عہد حالیہ نمودار ہوا اس کی صدا اس کے معنوں کا ایک
بسم ہے اور معنی دراصل اُس کی رُوح ہے۔ یہ کہنے سے کہ ہم کو یہ معلوم ہونا چاہیے
کہ لفظ حریت قومیت یا سلطنت کے استعمال سے لوگوں کی کیا مراد ہوتی ہے ہم کو
جذبہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس نے پہلے پہل اس لفظ کو جائیداد ہستی پہنایا تھا۔ اس
امر کے ذہن نشین کرنے سے ہم کو اُس طاقت کا عیاں بخشنا ہے جس نے عہد موجودہ
کو عہد ماضیہ سے مختلف بنا دیا۔ اور اس کے بعد بھی اگر لفظ حریت یا قومیت کے معنی
باکمال مفقود نہیں ہو گئے ہیں تو ہم کو آخر میں معلوم ہو جائیگا کہ کون سی باتیں گذرے
ہوئے زمانہ کو ایک بہترین مستقبل میں تبدیل کر سکتی ہیں کیونکہ ہمیں یہی فرض کرنا پڑیگا

کہ اگر ایسے الفاظ لگے معنی کتم عدم نہیں مستور نہیں ہو گئے ہیں تو سیاسیات میں قوتوں کی حیثیت سے وہ اب بھی موثر ہو سکتے ہیں جس زور و طاقت کے ساتھ ابتدائاً ان الفاظ سے تاریخ مرتب ہوتی تھی اس کے مقابلہ اب بہت ہی کم تو انسانی تاریخ کی تیاری میں صرف ہوتی ہے۔ لیکن ان میں وہ سچائی باقی ہے جس کے ساتھ انہوں نے گزرے ہوئے زمانہ کی تاریخ کو ہستی کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس قسم کی تاریخ اس تاریخ سے تراصر جداگانہ ہے جس میں صرف سینیں و واقعات درج ہوتے ہیں کیونکہ کسی لفظ کے معنی اس کی تشریح یا ذکر کھنے سے ہی نہیں بلکہ اس کو محسوس کرنے سے زیادہ سمجھ میں آتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کوئی شخص حفظ سوال پوچھ کر اس احساس کا امتحان نہیں لے سکتا۔ لیکن جس سبب سے اس قسم کی تاریخ کو یاد رکھنا ناممکن ہے اُسی حد تک دنیا کی عام زندگی میں یہ کارآمد ہے تو یادداشت کی نشو و نما نو عمری میں کی جاسکتی ہے لیکن احساس میں بلوغت ہی پر پہنچنے کے بعد ہو سکتا ہے کیونکہ اگر انسان کے دل پر بھی وہی بات لگ جائے جس کا احساس اس کے بزرگوں کو ہوا تھا تو اس کے دل میں ایسے احساسات کا جاگزیں ہو جانا بہت اعلیٰ ہے جس سے عہد موجودہ کی خرابیاں دور ہو جاتی ہیں اور ایک نہایت شاندار مستقبل بن سکتا ہے۔ اس لیے پھر اسی کا اعلاوہ کرنے کے لیے کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ مقاصد کا مدعا نہیں ہے کہ انسان کے قلب پر واقعات نقش ہو جائیں بلکہ خواہشات کی تحریک کو معرض ظہور میں لانا اس کا کام ہے تاکہ ان خواہشات کا احساس کیا جائے۔ اگر مضمون میں جذبات کا ذکر ہے تو جذبات ہی کے ذریعہ سے اس کی تعریف بھی کی جائے گی۔ جذبات چاہے کتنے ہی حتمی رکبوں نہ ہوں

اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ انسان کے دل پر کس باتوں سے اثر پڑتا آیا ہے یا پڑا کرتا ہے تو خود بھی متاثر ہونے بغیر رہ نہ سکیں گے۔ ایک خالی اور جلد قابو میں آجانے والے جذبہ سے احتراز کرنے کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ متاثر ہونے کا منشا وہ ہے کام کے لیے جوش کے ساتھ آمادہ ہونا۔ ہمارا یہ خیال نہیں ہے کہ ایسا جذبہ جو ایک قسم کی مجہول تعریف یا لفظی جوش ہے وہ کسی طرح ہمارے لیے چراغ ہدایت بن سکتا ہے جن لوگوں نے حریت ایسے لفظ کا استعمال کر کے موجودہ زمانے کو دہو میں لانے کی کوشش کی تھی۔ وہ جذبہ حریت کو ابھارنے والے ہی نہ تھے بلکہ انکے حصول کیلئے انہوں نے جادہ عمل میں قدم بھی رکھا تھا۔ اسی لیے قبل اس کے کہ کوئی شخص اس لفظ کی اصلی قوت کا اندازہ کر سکے، لفظ سے اس کو خود کچھ نہ کچھ کام کرنے کے لیے تحریک ضرور ہونا چاہیے۔

یہ تو ہوا عام طریقے کا ذکر۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون تہذیبی عمل میں لانا چاہیے پرانی باتوں کے ذکر میں نہ پڑے کے لیے ہمیں زمانہ حال کو اپنا نقطہ آغاز مقرر کرنا پڑے گا۔ جس عہد ماضی پر ہمیں بحث کرنا ہوگی۔ وہ ایسا نہیں ہے جس کا اب نام و منشا بھی نہ رہا۔ بلکہ جس کی ہستی عہد موجودہ میں سستہ ہے اس میں شک نہیں کہ جو وقت گزر گیا ہے اور اب لوٹ کر آنے کا نہیں۔ اس کے مطالعہ کی بھی ضرورت سے کیونکہ یہ یقینی طور پر طے نہیں ہے کہ اس کا ہر ایک جزو اب فرسودہ ہو چکا ہے گزشتہ زمانہ کی تحقیقات و محسوسات کے اب ان باتوں کو پھر زندہ کرنا بھی جو اس زمانے میں پیش آنی تھیں بعض عالموں کا کام ہے محض یہی نہیں اس سے بھی زیادہ وہ یہ دکھاتے ہیں کہ ان پچھلی باتوں میں بھی جادو انیت کی ایک جھلک موجود ہے

یقیناً یہاں ہمارا مقصد محض اُن باتوں کا ذکر کرنے سے ہے جو ہر شخص کی زبیل پر پاب تک موجود ہیں۔ یعنی وہ لفظ وہ خیال جس سے انسان کے احساسات پر اثر پڑتا ہے ہم اسی کو لیکر اس کے متعلق بتائیں گے کہ جو قدر و منزلت اس کو نصیب ہے اس کے حامل ہونے کے کیا ذرائع اور صورتیں ہو کر تی ہیں۔ ہم اُن الفاظ کا ذکر کریں گے جن کو خود پسند مدبرین بھی متبرک سمجھتے ہیں اور دکھائیں گے کہ اُن الفاظ کے اندر یہ عجیب و غریب تہک کس طرح معمور ہوتی ہے جو اُن سے باہر نکل کر اس طرح پھیل جاتی ہے کہ جس سے نہایت نصیب و بلیغ فرقے بس جاتے ہیں۔

ڈارون نے جس روز سے لکھا ہے اسی وقت سے یہ عام طور پر ہر شخص تسلیم کرنا ہے کہ اگر انسان صرف اس بات کی تحقیقات کرے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی تو وہ ہر ایک بات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ آجکل کسی بڑے آدمی کے حالات زندگی میں اُس کے ماں باپ کے ذکر کے لیے بھی صرف محدود و محدود سطور وقف کیے جاتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں سوانح نگار جس شخص کے حالات قلمبند کرتے تھے تذکرے میں اُس کے ماں باپ کے متعلق صرف اتنا ہی لکھ دیتا کہ کافی سمجھتے تھے کہ وہ غریب مگر باعزت تھے۔ گرجا کی صورت حال اور یہی ہو گئی ہے جس شخص کی سوانح عمری لکھی جاتی ہے وہ بذات خود کتنا ہی غیسر معمولی شخص کیوں نہ ہو۔ مگر اس کی زندگی کا مطالعہ اور اس کو بخوبی ذہن نشین کرنے کے لیے اس کے حسب و نسب کا با التفصیل تذکرہ ضروری سمجھا جاتا ہے یہی حال کسی بڑے نصیب العین۔ بڑے بھاری لفظ اور اُس کے معنی کا ہے۔ ہم اس

نصب العین یا لفظ کو اس کی موجودہ صورت میں پیش کر کے یہ دکھانے کی کوشش کریں گے کہ جب وہ شہسوار معیار یا لفظ پہلے پہل صفحہ ہستی پر ایک محرک قوت کی شکل میں نمودار ہوا تھا اس وقت اس کے کیا معنی سمجھے جاتے تھے وہ مادہ موجودہ سے اس بحث کا آغاز کریں گے کیونکہ اس کی تشریح کرنے کی بھی ضرورت ہے اور اس کے بعد یہ دکھایا جائے گا کہ کس نصب العین کی کہاں ابتدا ہوئی اور اس کے علاوہ اس کی تالیخ پر بحث کی جائے گی۔ اس لیے ہم گذشتہ پر نظر ڈالنے سے ہم کو معلوم ہوگا کہ حریت کا ذکر کرتے ہی ہمارے سامنے ایٹھنز اور نظام روما کا ایک نقشہ کشیج جاتا ہے موجودہ تخیل، قرون وسطیٰ میں اتحاد اور نشاۃ جدیدہ کے دور میں دول کی فرمانروائی کے نصب العین کا نتیجہ ہے۔ لیکن اپنے خیال کے مطابق ہم قدیم ایٹھنز کی طرف خاص توجہ نہیں دے سکتے۔ بلکہ ہم آریاوی ایٹھنز کے اس جزو کا مطالعہ کریں گے جو موجودہ زندگی میں سائر دور ہے۔ روم کے قدیم نہیں بلکہ نظام روما پر بحث کرنے سے کام ہوگا جو دنیا کی حکومت کے موجودہ طرز عمل کے پس پردہ اپنا کام کر رہی ہے اور اسی طرح ہمیں صرف اتحاد ازمنہ وسطیٰ اور احیاء یورپ کے دور دورہ سے غرض ہے۔ کلمہ صفت نہیں بلکہ کلمہ اسم سے ہیں خاص مطلب ہے کیونکہ کلمہ صفت سے صرف معیار اعظم کی ابتداء کا حال معلوم ہوتا ہے اور یہ سب چیزیں تو اس مقصد کی پہچان ہیں اور ان گھروں کے افراد جن کے متعلق یہ تحقیقات و تجسس کرنا ہے اسے بھی تک زندہ ہیں

ہمیں اپنا مطلب بھی یاد رکھنا چاہیے ورنہ تفصیل میں پڑنے سے گمراہ ہو جائیگا احوال ہے۔ حریت کا مادہ پہلے کیا تھا۔ اس امر کے ریفہ کرنے کے

بعد ہم کو یہ معلوم کرنا ہے کہ آج کل اس لفظ سے کیا مراد ہے اور ایسا کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ آئندہ زمانے میں نسل انسانی اس لفظ کے کیا معنی سمجھے گی۔ یہی حال اتحاد یا قومیت کا ہے۔ ان کا مفہوم زمانہ گذشتہ میں بھی وہی تھا جو عہد حالیہ میں ہے لیکن یہاں الفاظ کی تعریف کرنا مقصود نہیں ہم ان الفاظ کو استعمال کرنا چاہتے ہیں اور اگر فی الواقع وہ ابھی تک کارآمد ہیں تو ان کے معنی تبدیل ہو جائیں گے اس لئے ہماری نظر اب اس امر پر زیادہ رہنا چاہیے کہ اس نظام اتحاد یا قومیت سے مزید کیا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے یا یہ کہ آدم زاد کے مفہوم میں ان چیزوں کو کس طرح کام میں لاسکتے ہیں۔ استعارہ کے طور پر اس کو سمجھنا چاہیے کہ کسی درخت کی عمر کا اندازہ ان حلقوں سے جن سے بن کی عمر کا ایک ایک سال ظاہر ہوتا ہے اور جو اس شجر کے تنے میں ہوتے ہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک نصب العین ہماری موجود تہذیب کے ارتقاء میں ایک منزل قائم کر دیتا ہے اور انہیں منزلوں پر جو اس طرح قائم ہو جاتی ہیں ہمیں غور کرنا ہوگا لیکن اگر وہ درخت موجود ہے اس کے تنے کے گھیرے خود بخود تبدیل ہوتے جائیں گے کیونکہ شجر کی بلندی اور جسامت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ عہد ماضیہ میں جو کچھ ترقی اس زمانے کی خواہشات کے ذریعہ سے ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے تو زمانہ حال کا قیام اور استحکام ہوتا ہے اور اس کے بعد سستہ بل۔ پتھر رکنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم اس امر کو سستہ فرض کیے لیتے ہیں کہ سیاسیات اور تاریخ درس کے دو مختلف اجزاء ہیں۔ سیاسیات کی ہستی اس وقت تک کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ جب تک تاریخ کی وساطت سے

وہ آزاد نہ ہو جائے اور تاریخ کی منزلت بھی گھٹ کر محض علم اور ہجلی صورت اختیار کرے گی۔ جب تک یہ سیاسیات کے ساتھ اپنے فتن کو نظر انداز کرتی رہے گی خواہ تاریخ میں سیاسیات کی جھلک آجانے کے متعلق باہمی اختلاف بھی کیوں نہ ہو یا جیسا کہ سیکرٹری کا قول ہے۔ تاریخ سیاسیات گزشتہ اور سیاسیات تاریخ گزشتہ ہے۔ اس لیے جو خاص نتیجہ اس زمانہ بحث سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں واقعات قلب بند کرنے کے بجائے مسائل کی توضیح پر زیادہ زور دینا چاہیے اور کوئی بات بھی جو ضبطِ تحریر میں آئیگی وہ ہمیشہ کے لیے متحرک سمجھی جائے گی۔ کیونکہ ہمیں ابھی تک اس بات کا علم نہیں کہ آئندہ انقلابِ نظام اور آزادی قومیت یا شہنشاہیت کیا منشاء سمجھا جائے گا۔

تاریخ مقاصد تہذیب کی تاریخ ہر

یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ ابھی تک کہا جا چکا ہے اس میں ہمارا مطلب صرف مغربی تہذیب کی تاریخ سے ہے حالانکہ عام طور پر ایک وسیع نظر ڈالنے سے تاریخ کا مدعا مذکورہ بالا نقطہ خیال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جس مسئلہ کی تشریح کرنا مقصود ہے وہ یورپی روایات سے متعلق کچھ نوائی اقوام یعنی مغربی یورپ اور اس کے مقبوضات اور شمالی و جنوبی امریکہ کی سیاسی حالت ہے اسی لحاظ سے ہم سیاسی زندگی کے ان مسائل کا ذکر نہ کریں گے جن میں اختلافِ رائے ہے کیونکہ مقاصد ہی وہ اہم شے ہیں جن کے متعلق کوئی اختلافِ رائے نہیں اور جو مسئلہ سمجھے جاتے ہیں۔ آزاد تجارت اور

تھنلی تجارت کے مسئلے میں باہمی اختلاف ہو یا اس بارے میں متضاد رائے ہوں۔
 کہ زمین کی ملکیت کا حق سلطنت کو حاصل ہے یا نہیں۔ لیکن حصول آزادی یا
 نظام کے متعلق کسی کو کچھ اعتراض نہیں۔ حالانکہ انہیں خواہشات کے بارے میں
 جن کی نسبت بظاہر یہ خیال ہے کہ ان کو بالعموم محسوس نہیں کیا جاتا آگے چل کر
 سوال ہو گا۔ یہ خواہشات وہ ہیں جن کا منشاء شہنشاہیت یا اشتراکیت ایسے
 الفاظ سے ادا ہوتا ہے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی حالتوں میں اکثر اہل خیال
 کے درمیان اتفاق آراء کی جھلک نظر آتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جو جماعتیں خود کو شہنشاہیت پسند یا اشتراکی کہتی
 ہیں ان کے اصلی مقاصد میں اختلاف موجود ہے مگر ان کا ہم سے کوئی ٹکراؤ نہیں
 ہماری توجہ تو اُس خواہش کی طرف مبذول ہونا چاہیے جو اس جماعت کے
 پیش نامہ کی تہ میں مضمر ہے اور جس کا مفہوم اکثر غلط سمجھا جاتا ہے۔ مذکورہ کم
 اس کی غلط ترجمانی ضرور کی جاتی ہے۔ اسی لیے ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے لیے
 یہ سمجھا جائے کہ ان کو ایسی خواہشات سے تحریک ہوتی ہے جس سے شہنشاہیت
 پسندوں کو تحریک ہوتی ہے اور ہاں ہر وہ شہنشاہیت پسندی کے اصولوں سے
 متفق ہوں اور اسی طرح بہت سے ایسے اصحاب ہیں جو اشتراکیت پسند تو ہیں نہیں
 لیکن ان حالات کے متمنی ہوتے ہیں جن سے اشتراکیت کی دنیا میں بڑی بڑی
 امیدیں باندھی جاتی ہیں۔ لیکن اگر یہ موضوع یورپین ممالک ہی تک محدود ہے
 تو اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہ انگریزوں یا انگریزوں کی سی تہذیب کے پیروں ہی پر ختم
 ہو جاتا ہے کیونکہ انگلستان کے نسب ایس کو فرانس یا جرمنی کے مقاصد سے

علحدہ کردینا ایک نا واجب تقسیم ہے ہیں خود اپنی مقامی مشکلات سے یا مقامی مسائل کے حل سے سامنا ہو۔ لیکن ہلدی تہذیب بلحاظ جبلت ایک ہی ہے خواہ ہم لندن میں رہیں یا برلن میں۔ پیرس میں قیام کریں یا نیویارک میں۔ جو خیال ہم نے مہذب زندگی کا قرار دے لیا ہے وہ ہر جگہ یکساں ہے۔ اسی ترکہ آبائی سے ہیں تحریک بھی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے آبا و اجداد مختلف ہوں پھر بھی ہم کو سبق دینے والے ایک ہی تھے جس زمانہ سے مختلف قومی علیات کی نشو و نما ہوئی ہے۔ تمام یورپین ممالک کے خیال کا رُخ ایک ہی طرف رہا ہے۔ زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے سیاسی اصطلاحات کے انفرادی وجود یا اسمائے مقاصد کو ذرا بھی مدد نہیں پہنچا اور وہ باوجود اس فرق کے بدستور قائم ہیں۔ اس لیے زیادہ وسیع سیاسی مسئلوں کو بین الاقوامی قرار دینا نہایت مناسب ہوگا۔

ہم لوگوں کی یہ عادت ہے کہ ہمیشہ سیاسیات پر اپنے ملک کے نقطہ خیال سے غور کرتے ہیں۔ ہم اس طرح باقیں بنتے ہیں گویا برطانوی آئین ایک پُر اسرار طریقے سے ظہور پذیر ہو گئے ہیں۔ جس کے لیے ساری مدح و ستائش ہمیں سزاوار ہے۔ کیونکہ ہمارے اجداد اب عالم مہستی میں نہیں ہیں اور نہ اس مدح و ستائش کے لیے دعویٰ داریں سکتے ہیں۔ اس بات کا ہمیں بہت کم خیال ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی اس ترقی کے لیے اپنی قوم کے علاوہ اس زمانہ کی دیگر اقوام کی عقل و محنت کے لیے کتنا مشکور ہونا چاہیے۔ جب ان جزائر کے باشندے غیر مہذب اور جاہل ہوتے تھے اور لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو ان بیانات کی شہادت کا پتہ ہے۔ اُن سب پر ظاہر ہے کہ ہم پر منشورِ اعظم کے وجود میں لانے والوں کے مقابلہ میں پانچ صدی قبل

تحقیقات تجسس نہیں کر لیتے یہ بھی درست ہے کہ مقامی حب الوطنی کی بھی کچھ اصل قیمت ہوتی ہے۔ لیکن جب مقامی حب الوطنی مقامی تاریخ اور دیہی سیاسیات میں تبدیل ہو جاتی ہے تو ایک مذاق سا ہو جاتا ہے۔

اس لیے سیاسیات کو زیادہ وسیع نظر سے دیکھنا اور تاریخ کو تنگدلی سے آزاد کرنا گویا اپنی زندگی کے لیے نئے معنی پیدا کرنا اور اس کو ایک جدید قدر و قیمت دینا ہے کیونکہ تاریخ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور ہم سیاسیات کی صورت میں اس کو تیار کرتے ہیں۔

اگر تمام انسانی تاریخ فقط ارادوں کے حسرت خیز انجام تک محدود ہے تو پانچواں باب اب بھی لکھنے کے لیے باقی رہ جاتا ہے۔ اسی نقطہ خیال سے تاریخ کو ہم کسی عالم کی دلچسپی کے شغل کے بجائے کچھ اور ہی چیز بنا دیں گے۔ یہ ایک ایماندار و تدبیر کے لیے عداوت غیب ہو جائے گی اور وہی عہد حال کے مستقبل تنقید اور مستقبل کی ساخت کے لیے حقیقی بنیاد ثابت ہوگی۔ اس وقت یہ اپنی اصلی صورت میں یعنی تاریخ معیارات کی شکل میں تسلیم کی جائیگی ۛ

دوسرا باب

ایتھنز کی آزادی

ایتھنز کا نصب العین

ایتھنز سے خود سروں کے اخراج کا تذکرہ کرنے کے بعد ہیردوٹس نوایا ہے۔

”اسی تخیل سے نہیں بلکہ ہر جگہ متعدد مثالوں سے یہ امر صاف طور پر ظاہر ہے کہ مساوات ایک نہایت اعلیٰ چیز ہے۔ کیونکہ اہل ایتھنز نے بھی جس وقت وہ مطلقاً اعلانیٰ کے محکوم اور اپنے گرد و نواح کی اقوام سے ذرا بھی زیادہ بہادر نہ تھے۔ سب پر کلیتہً سبقت پاتے ہی خود سروں کی غلامی کا طوق اپنی گردن سے نکال کر پھینک دیا اس سے ظاہر ہے کہ جس وقت ان کے گلوں پر ظلم و تعدی کی ٹھہری پھیر رہی تھی وہ نشانہ زد و کوب بننے کے لیے خود ہی تیار رہتے تھے کیونکہ وہ ایک سرغنہ کے لیے کام کرتے تھے۔ لیکن آزادی حاصل ہوتے ہی ان میں کا ہر ایک

فرد اپنی ذات کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لیے سسہ گرمی کا اظہار کرنے لگا۔

نیل نے اپنی تصنیف آزادی میں ہر وڈوٹس کے ان الفاظ کو بہت مبالغہ آمیز قرار دیا ہے لیکن اس میں جو معیار شامل ہے وہ یکساں ہے۔ محض آزادی ہند زندگی کی بنیاد نہیں ہے بلکہ تہذیب کی ترقی کا دار و مدار ذاتی مطلق العنانی، یا مقامی خود مختاری پر ہے۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ اہل ایتھنز کا معیار ہی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک مرتبہ حاصل ہو گیا تو اس کے بعد کچھ تحصیل کرنے کو باقی ہی نہیں رہا اور جس کو ہم تسلیم کر کے خوش ہونے لگیں۔ نہیں بلکہ وہ معیار ابھی تک ایک معیار ہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حالانکہ ہم نے جس قدر ترقی کی ہے وہ اہل ایتھنز کی تکمیلات سے خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ تاہم ہمیں ابھی اور بہت کچھ حاصل کرنا باقی ہے اس طرح آزادی یا حریت صرف ایک قوت خیز لفظ بنی رہتی ہے اور اس امر پر تمام جامعیت متفق الرائے ہیں کہ جس قدر حصہ ہمیں اس حریت کا حاصل ہو چکا ہے ہمیں اس کو محفوظ رکھ کر اس کے مزید صعود و نمود میں سعی کرنا چاہیے۔

چونکہ ہمارا مقصد علم آثار قدیمہ کی تفصیلات کا درس نہیں ہے بلکہ ہم اُس جزو خاص کی تفہیم کرنا چاہتے ہیں جو عہد حالیہ میں موجود ہے۔ ہمیں اس مدتوں کی قائم ہوئی دنیا میں اس حقیقت کی تلاش سے آغاز کرنا چاہیے۔ جسے کسی زمانہ میں اہل ایتھنز کی آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمیں اس کی شکل صحت کچھ بدلی ہوئی ضرور نظر آئے گی۔ جس طرح سب رسیدہ انسان و حقیقت دوسرے رنگ و روپ میں ایک طفل ہی ہوتا ہے لیکن ہم کو کسی نہ کسی طرح اس حقیقت کا

امتیاز ضرور ہو جائیگا۔

آزادی کو خواہ ایک قابل تحفظ بیش بہا ملکیت یا ایسی چیز سمجھا جائے جس میں آئے دن اضافہ ہوتا رہنا چاہیے۔ ہر حال دونوں طرح سے لفظ حریت یا آزادی کے رائج الوقت استعمال میں ہیں اسی سیاسی واقعہ کا تپ چل جائیگا۔ جس کی تشریح اپنے دور سے ۵ صدی قبل کے ایتھنز کی حالت کا موازنہ کرنے سے ہو سکتی ہے لیکن ہمیں شروع کرنا چاہیے اس لفظ کے، عا کے ایک خلاصہ بیان سے۔ اور اس غرض کے لیے یہ نہایت مناسب ہے کہ حقیقی یا باطل حریت کے درمیان جو لفظی امتیازات ہوں ان کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیا جائے۔ جھوٹی آزادی آزادی نہیں ہو سکتی۔

سیاسی آزادی کے دو اقسام

سیاسی آزادی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ اولاً اس سے اُس طبقہ کی خود مختاری کا نود ہوتا ہے۔ جس سے انسان کا تعلق ہو اور یہ اس چیز کی ضد ہے جس کو عام طور پر غیر ملکی حکومت کہتے ہیں۔ ثانیاً اس کا منشاء یہ ہے کہ شخص وہ کام کر سکے جو اس کو بہتر معلوم ہو۔ اول پہلو میں اس سے یہ مراد ہے کہ کم از کم سیاسی مسائل کے تصفیہ میں مختلف طبقوں کو خود اختیاری حاصل ہو۔ اس قسم کی خود مختاری انگلستان، فرانس، اور جرمنی میں موجود ہے۔ ہم اس کو ایک ایسی چیز سمجھتے ہیں جو حاصل کرنے کے لائق اور مزید ترقی کیلئے نادر ہے۔

خود مختاری یا جمہور کی آزادی

جمہور کی آزادی ملک یا قوم کے قدرتی ارتقاء و نمود کی بنیاد قرار دیکھائی ہے اور ہم اس پر صلو کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی غیر ملکی حکومت کا انتظام ستنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ کوئی مہذب قوم اس کا بار اپنے اوپر برداشت نہیں کر سکتی۔ غیر مہذب اقوام کو بھی ”اسلحہ جات“ کے زور سے اُن لوگوں کی رہنمائی قبول کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جو ان پر اپنے ذاتی فائدہ کی غرض سے حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ غیر ملکی حکومت کے خلاف ایک قدرتی اور نہایت قدیم قصب دنیا رہا کرتا ہے جو ایک مہذب قوم میں سیاسی آزادی کی ایک خواہش بیدار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جمہور خود کو ایک نمود پذیر عضو تصور کر لیتا ہے۔ جو آزادی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر سکے۔ اور جس کو اپنی خصوصیات نمایاں کرنے کے لیے ایک بے روک ٹوک موقع مل سکے۔ اور یہ بھی جمہوریہ کی اندرونی کیفیت کے لحاظ سے درست ہے۔ کیونکہ جو گروہ خود اپنی آزادی کے لیے مطالبہ کرتا ہے وہ دوسروں کو اُس آزادی سے محروم کرنے کی کوشش سے شاذ و نادر گریز کرتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی طبعیت کی باہر ہی حالت دیکھ کر اُس سے زیادہ بڑے طبقہ کے دل میں چھوٹے جمہور کو محض فتح کر لینے کی خواہش ہی نہ پیدا ہو جائے بلکہ اس کی یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی یہ فتح چھوٹے کے حق میں مفید بھی ہے۔ ہم کو اس شعبہ موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ امر واقعی ہے کہ ہر ایک جمہور یا گروہ

یہی خود مختاری کو اپنے لیے علاوہ تصور کرتا ہے۔

انفرادی آزادی

انفرادی آزادی کے متعلق ہیں اُن باتوں کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے جو مل نے قلمبند کی ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک بخوبی تربیت یافتہ انسان کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کے واسطے کون چیز فائدہ مند ہے۔ اس امر سے ہم سب کو اتفاق ہے کہ جو شخص سبقِ بدوغیت کو پہنچ چکا ہے اس کو بچہ نہیں سمجھنا چاہیے اور یہ کہ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف اس کو ایسا مطیع بنائے خواہ ایسا کرنے سے اس فرد کو فائدہ بھی کیوں نہ پہنچتا ہو۔ اس طرح حریت یا آزادی خود سرانیا یا فرقہ داری حکومت کے مخالف ہے۔

آزادی سے حسب ذیل باتیں مراد ہیں :-

(۱) جسمانی و باؤ یا پابندی کی عدم موجودگی۔

(۲) انسانوں کے افعال سے جو افسوسناک نتائج رونما ہوں۔ اُن کے

خوف سے انفرادی میلان طبع پر اخلاقی و باؤ کا ہونا۔

مجملاً یہ صورت ہے اُس سیاسی آزادی یا حریت کی جس کو ہم ہمیشہ قیمت قرار دیتے ہیں جس قدر حصہ اس سیاسی آزادی کا ہیں حاصل ہے ہم اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ ہمیں مزید آزادی حاصل کرنے کی امید رہتی ہے۔ گویا آزادی یا حریت مذکورہ بالا مفہوم کے لحاظ سے ایک

نصب الیمن ہے ایک معیار ہے۔

آزادی سیاسی سر کی ابتداء، اتھینز میں کیسے ہوئی

اس نقطہ خیال کا آغاز اتھینز میں پایا جاتا ہے۔ اس کے پیشتر دیگر دیار نے فاتحوں کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ مگر ان میں سے کسی کو اپنی کارروائیوں کے نسبت کوئی صاف اندازہ نہ ہوا تھا۔

دوسرے شہروں نے خود برقرار رہنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ ہر ایک شہری کو فرداً فرداً آزادی کا حق دیدیتے تھے لیکن کسی نے اس پر بھی تراز نہ کیا۔ اور نہ اس کو ترقی دے کر ایک وسیع پیمانہ پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس قسم کی آزادی جمہوریت کا ایک دوسرا نام ہے۔ اور یہ ہم کو معلوم ہی ہے کہ اتھینز کی عظمت کے دور آخری میں اس لفظ کی وقعت کس قدر کم کی جاتی تھی۔ تاہم اس کے زوال کے زمانہ میں پائینیاس جس نے ایک زیادہ شاہدارانہ عہد ماضیہ کے آثار شکستہ کے متعلق تحقیقات کی ہے یوں رقم طراز ہے کہ

”جمہوری طریقہ حکمرانی میں اب تک اہل اتھینز کے علاوہ اور کسی قوم کو فلاح الہیالی نصیب نہیں ہوئی۔ اہل اتھینز فی الواقع خوش حال تھے کیونکہ ان میں عقل و فراست افراط سے موجود تھی“

اس جیسے یہ خیال مدتوں سے جاگزیں رہا ہے کہ جو آزادی اتھینز کی تقدیر میں آئی وہ ایک اس قدر متشنی حالت تھی کہ اس کا حاصل کرنا یا برقرار رکھنا

بڑا مشکل کام ہے اس لیے ہم کو حتی الامکان اس آزادی کے ہستیازی خصوصیات
 کا پتہ لگانا چاہیے۔ کیونکہ اگرچہ اہل ایجنڈہ کے قبل دیگر اقوام کو بھی آزادی حاصل
 ہوئی۔ اور ان کے بعد بھی اکثر اقوام کو یہ دولت نصیب ہوتی رہی ہے۔ مگر اہل ایجنڈہ
 کی آزادی عظیم النظم تھی۔ اس امر کی شہادت بڑی حد تک ایسی کوس تھو سی دائیں
 یا استراط کی پُرانی کتابوں میں پائی جاتی ہے اور ہم کو اس کے لیے مزید شہادت
 پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جن موزوں نے اہل ایجنڈہ کی سیاسی زندگی
 کی تشبیہ کی ہے۔ وہ اس خاص بات کو ظاہر کرنے میں ناکام رہے ہیں جو
 اس زندگی کو دوسری زندگیوں سے ممیز کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لیے اس موجود
 دلیل میں خاصی دلچسپی کے لیے ہم اس عجیب و غریب خصوصیت پر اعتبار کر سکتے
 ہیں اور ایجنڈہ کی مقامی خود مختاری اور انفرادی آزادی کے متعلق جو کچھ کہا جا چکا
 ہے اس کا صرف اجمالاً اعادہ کرینگے۔ سیاسی آزادی کی یہ معمولی معمولی خصوصیتیں
 اس میں ملیں گی لیکن سب سے زیادہ اہم جو بات ہے وہ یہ ہے کہ اہل ایجنڈہ
 کی آزادی با-آرغی۔ ایسی آزادی میں کھانے پینے کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف
 سے بغیری رہتی تھی۔ اس میں اکثر نہیں تو تھوڑے بہت ایجنڈہ دانوں کے تنگ
 علم و ہنر کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔ اسی سے ایسا پل دستیاب ہوا کہ وہ لوگ
 اس پر نازل رہے ہیں اور جس کے مقابلہ میں بہتر شرد دیگر زیادہ دولت مند ممالک
 اقوام میں کسی کو بھی ہاتھ لگ سکا۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی آزادی کو سیاسی آزادی
 کے نام سے سوہوم کرنا غیر معمولی بات ہو۔ لیکن سیاسیات کی نوعیت کے غیر معاشی
 پہلو سے اس کو حق بجانب ثابت کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال اہل ایجنڈہ کی آزادی کے

اُن پہلوؤں پر پہلے روشنی ڈالنا نہایت ضروری ہے جو عام طور پر اہم قرار دیے جاتے ہیں۔

اتھنز کی خود اختیاری

غیر ملکی متابعت کے خلاف اہل اتھنز نے جو جدوجہد کی۔ اس کا اندازہ اولاً اُس حیثیت کے لحاظ سے کیا جاسکتا ہے جو تھیرا و ڈوٹس نے اُس کو دی ہے۔ تھیرا و ڈوٹس کی تاریخ زیادہ تر اہل یونان کی اس کشمکش سے تعلق رکھتی ہے جو انہوں نے مشرقی مطلق العنانی کے خلاف کی تھی۔ واقعات نے اس کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اہل اتھنز پہلے ہی سے بڑھے چڑھے تھے۔ اس نے اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ جس زمانے میں اُس نے اپنی تاریخ تصنیف کی ہے۔ اس عہد میں ابسا لکھنا ایک قسم کی دلیری معلوم ہوگی۔ کیونکہ اہل اتھنز کے دشمن اُن اقوام میں بھی موجود تھے جن کی آزادی اُس نے خود پہلے پہل حاصل کرانی تھی پھر کیا اس کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص اتھنز کی نسبت یہ کہے کہ یونان کو ان کے ہاتھوں سے نجات حاصل ہوئی تو وہ حقیقت سے تجا دز نہ کر گیا۔ کیونکہ دیوتاؤں کے بعد اگر خدا اور کسی قوت سے پسپا ہوئے تو وہ انہیں کی طاقت تھی۔

اس طرح اتھنز کے مدبر ارس ٹائیڈز کے مشورے سے یونان کی حریت کی یادگار قائم رکھنے کے لیے مقام پلائئیر میں آزادی کے کھیل جلدی کیے گئے اور لائی سیم میں وعظ کرتے ہوئے ارسطو نے یہ بیان کیا تھا کہ اہل یونان خود کو

غلام کہنا نہیں پسند کرتے۔ بلکہ انہوں نے اس اصطلاح کو وحشی قوموں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اور اسی سے آزادی یونانیوں کے لیے ان کی قوم کی سب سے زیادہ خصوصیت ہو گئی۔

ایتھنز خود اپنے باشندوں کی نظر میں ایک شہر بے سرغہ تھا۔ اس طرح ایسکی لوس نے کتاب اہل فارس میں لکھا یا ہے کہ کس طرح فویدرازو نے یہ کہہ کر اٹوسہ کو انگشت بندھاں کر دیا تھا کہ اہل ایتھنز کسی شخص کو اپنا آقا نہیں کہتے اور اس میں شک نہیں کہ اس پورے ڈرامہ میں غیر ملکی مطلق العنانی کو دور کرنے میں اہل یونان کی فتح کاراگ کا یا گیا ہے

اُس زمانے میں نصرت حاصل ہونے پر بڑا جشن کیا جلا تھا مگر اس فتح کے مکمل معنی کسی اہل ایتھنز پر آشکارا نہ ہوئے ہوں گے۔ اور تاہم شہر کو اس بات کی خبر تھی کہ وہ مجسم آزادی تھا۔ اس طرح پہلو پانی سس کی لڑائی کے بعد بھی جس نے دنیا سے یونان کے لشکرے کھڑے کر دیے۔ غیر ملکی متابعت کے خلاف یونانیوں کے عقائد قائم رہے اور انہیں سے یونان کی محافظت ہوتی رہی۔ ڈیموس تھینز نے اسی عقیدہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے خیال کے مطابق یونان والے اُس قدیم جوش سے متاثر تھے کہ خلافت کم از کم کچھ عرصہ تک جدو جہد کر سکتے تھے جس زمانے میں سلطنت مقدونیہ یونانی آزادی کے لیے خطرہ کا باعث ہو گئی تھی اس کا قبل ہی سقراط نے اپنے معاصرین کے دماغ میں ایتھنز کو آزادی کا محافظ اور حامی قرار دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کی تصنیف ”مدح“ تقریباً ۳۸۰ سال قبل ولادت مسیح یعنی اسپارٹ کے ایتھنز کو مطیع کرنے کے بیس سال بعد قلمبند ہوئی تھی۔ اس میں اُس نے اس شہر کی

تعریف میں گہرا فاشی کی ہے ان کا بیان ہے کہ امتیختز میں محض زندگی ہی مس نہیں پیدا ہو گئی۔ بلکہ وہ تمام باتیں حاصل ہو گئیں جن سے زندگی بسر کرنے کے لائق ہو جاتی ہے لائی فرائض کی تکمیل میں حمایت کرنے کے بعد امتیختز نے دوسرے فرائض سے پہلوئی نہیں کی۔ بلکہ اس نے مفاد عامہ کے خیال سے یہ اپنا پہلا فرض سمجھا کہ حاجت مندوں کے لیے خوراک بہم پہنچائی جائے اور یہ وہ فرض ہے جو اسی قوم کے لیے حمایت ضروری ہے جو عہد حکومت کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد اہل امتیختز کو خیال ہوا کہ ایسی زندگی جو پیٹ پائے ہی تک محدود ہے۔ لوگوں میں زندگی بسر کرنے کی خواہش پیدا کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ انھوں نے انسان کے دیگر اغراض کی جانب توجہ اس طرح منحرف کی کہ ان تمام فوائد سے جو خدائی فضل و کرم سے نہیں حاصل ہوتے ہیں بلکہ ہم خود اپنے ہمجنسوں کو بہم پہنچاتے ہیں۔ کوئی فائدہ ایسا نہیں ہے جو اہل امتیختز کی مدد کے بغیر رونما ہو اور اس میں شک نہیں کہ اکثر فوائد ایسے ویسے سے حاصل ہوتے ہیں۔

امتیختز میں انفرادی آزادی

اب رہا ایسی انفرادی آزادی کا سوال جو کسی شخص کو اپنے طبقہ کے دیگر اشخاص کے لحاظ سے حاصل ہو۔ امتیختز والوں نے عدیدہ یا خود سہرا حکومت کو ہٹا کر اس کے بجائے جمہوری حکومت کا طریقہ رائج کیا لیکن اس بات کو علماً ثابت کرنے میں حکومت کا قیام انفرادی آزادی کی بنیاد پر کیونکر ہو سکتا ہے اسے بے انتہا دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

ہمواید رکنا چاہیے کہ اہل امتیختز کو ایک ایسے طریقہ حکمرانی کا تجربہ کرنا تھا جس کی ایک مرتبہ آزمائش کی جا چکی تھی اور یہی تجربہ ان کے حق میں ستم قائل ثابت ہوا۔ جو وہ اقوام اہل امتیختز کے بالمقابل انفرادی آزادی کی بظاہر ناپائیدار بنیاد پر زیادہ مستقل اور دیر پا نظام سلطنت قائم کر سکتے ہیں۔

سیاسیات میں کسی جدت کی ضرورت ہی وہ ضرورت ہے جس کی آزمائش جدت پسند قوم کو کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ اس سے ایسے نتائج رونما ہوں جو خود اس قوم کے لیے خود بھی مفید ہوں۔ لیکن اگر یہ جدت اس کی دوامی مسرت کے حق میں مضر بھی ثابت ہو جائے تو دوسروں پر اسی قوم کا ایک بے اندازہ احسان ہوتا ہے اور یہی حال امتیختز کا ہے۔

انفرادی آزادی کا پہلا اصول یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہر شخص اپنے کام کے لیے خود مختار ہے۔ اسی طرح اہل امتیختز کسی فرقہ یا فرد واحد کی نگرانی سے نفرت کرتے تھے۔ حکومت مطلقہ یا اثرافیہ سے جاسوس پیدا ہو گئے اور خود سر حکومت جس قدر صاحب فراست یا نیک نیت ہوتی تھی اسی قدر زیادہ عالمگیر اور تاراضی کے باعث وہ دیکھ بھال ہوتی تھی جو ایک فرد شہری کے متعلق رکھی جاتی تھی لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حق کی حفاظت کا ہر شخص اپنے اپنے کام کے لیے خود مختار ہے صرف اسی طرح ممکن ہے کہ اس بات کا مطالبہ کیا جائے کہ تمام قوم نگہ دار بار عامہ کی نگرانی اور انتظام کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ خواہ ہم پر جمادی ہی بھلائی کے لیے حکومت کی جاتی ہو جو شخص صاحب عقل اور معقول پسند ہو گا وہ ہمیشہ خزانہ کا محتالہ کرنے کے لیے تیار رہے گا۔ اگر اس کو اس بات کا یقین ہو کہ جو کچھ مصیبت اس پر

پڑتی ہے وہ خود اسی کے تصور کا نتیجہ ہے ایک نفع بخش خود حکومت کا مقابلہ ایسی ناکام حکمرانی سے بھی نہیں ہو سکتا جس کا انتظام خود ہمارے ہاتھوں میں ہو۔ دوسروں سے متوازن فوائد حاصل ہونے پر ہم خود اپنے ہاتھوں تکلیف اور مصیبت برداشت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے شخص سے جس کو ہم اپنے مساوی سمجھتے ہیں اتنے زیادہ فائدہ حاصل ہونے کے باعث جن کا ہم معاوضہ نہیں دے سکتے۔ محبت میں فرق آنے لگتا ہے اور خیر نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ فوائد سے احسان ہوتا ہے اور احسان کا ہونا ایک قسم کی غلامی ہے البتہ احسانات کا معاوضہ ادا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ہمیشہ اس لیے غلام بنائے رہتے ہیں اور ہم پانچ شخص کے دل میں اس سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

اور اگر خود سرائے حکومت یا فرمانروائی عیسیٰ کا سیلاب اور بادل پر درہے تو یہ قول بالکل درست ثابت ہوتا ہے لیکن اصلیت یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی قسم کی بھی حکومت کبھی قابل اور بے غرض نہیں پائی گئی۔

جو حقوق مطلق العنان حکومت کے ہاتھوں پامال ہوتے ہیں لوگ ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے لیکن حکمرانی کے ان طریقوں کی ممانعت محض اس وجہ سے ہوئی کہ یہ خاص طور پر ایذا رساں تھے۔ انسانی آزادی کے خیال یا کسی معقول غرض کی وجہ سے ان کا استیصال نہیں کیا گیا بلکہ اس قسم کی حکومتیں اس لیے برباد کر دی گئیں کہ اول ان کا رویہ سراسر خود غرضی پر مبنی تھا اور دوم فرمانروا کا نظم و نسق اچھا نہ تھا بلکہ اہل امتیاز کی آزادی سے معاشرتی تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کیونکہ کسی تہذیب میں غمزدگی کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی طاقت کم مقدار میں

کبھی نہیں دی گئی۔ آزادی کے سبب سے ہر شخص کے لیے یہ لازمی ہو گیا کہ وہ کاروبار عامہ میں دلچسپی لے۔ اور حکومت کو انفرادی اغراض پر کامل فوقیت حاصل ہو گئی مملکت کا منشا کبھی یہ نہ سمجھا گیا کہ فرد واحد سے اطاعت گزاری کا مادہ سلب کر دیا جائے۔ یا اس پر کسی دوسرے کی طاقت کا دباؤ نہ جو صرف ایک قسم کی فراں برداری سے ضرور مخالفت کی جاتی ہے۔ یعنی ایک شخص یا ایک خاص طبقہ کی تابعداری ایک شخص کی حکمرانی خود سہرا نہ حکومت کہلاتی ہے اور ایک خاص طبقہ کی فرازداری کو حکومت عدیدہ یہ کہتے ہیں۔

ن آزادی امتیاز میں قانون کی متابعت ایک جزو لا ینفک ہے اور اہل لونا کے صحیح اور قطعی نقطہ خیال کے مطابق یہ کہہ سکتے ہیں کہ قانون کو ایک فوق الانسان قرار دیا جاتا تھا۔

اسی لیے سقراط کو قانون میں فرزند اور شاگرد کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے اور ڈیوس تھیننز کی قریب قریب تمام تقریروں میں قانون پر بار بار توجہ دی گئی ہے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ اہل امتیاز کے دل پر یہ بات اچھی طرح نقش معنی کہ قوانین کا احترام انسان کے فطرتی ادنیٰ اغراض کا اس کی عقل خالق کا آج ہونا تھا۔ قانونی تعزیرات کے خوف سے جتنی جتنی آزادی سلب کی جاتی ہے یہی قدر نہیں بلکہ اس سے زیادہ ترواتی جبر و تعدی کا زور گھٹتا جاتا ہے۔ یہ یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ جس حد تک حکمرانی کے دباؤ سے افراد کے بدترین تشدد کا انداد ہوتا ہے اسی حد تک کسی حکومت اور قانون کا مقصد آزادی کی توسیع کرنا ہے۔ اہل امتیاز کے خیال کے مطابق آزادی کا جو مدعا ہے یہ الفاظ اس مدعا سے بالکل متفق ہیں

اور انہیں محض میں افلاطون کا قول ہے کہ اگر انسان اپنے نقائص کی پیروی کرتا ہے تو وہ غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈالتا ہے اور آزاد و صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ صرف عقل کا پابند ہوتا ہے۔ اسی طرح ارسطو نے کہا ہے کہ انسان کو ضابطہ و دستور کے مطابق چلنا غلامی نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اُسی میں اُس کی نجات ہے۔

ایتھنز میں دل کی آزادی

لیکن اہل ایتھنز کی آزادی محض غیر ملکی تشدد کی مخالفت اور ایک شہری کی دوسرے شہری کے معاملات میں دخل اندازی ہی تک نہیں محدود تھی۔ اس سے ایک ننھوڑی سی وہ لطیف آزادی بھی پیدا ہو گئی تھی جس کا دوسرا نام غیر مادی اغراض سے انسان کی رستگاری ہے۔ چھوٹی چھوٹی فکروں اور محض کھانے پینے اور سایہ کی ضروریات سے مستعد شہروں میں لوگوں نے آزادی حاصل کی ہے۔ لیکن بہت کم شہروں میں اس قسم کی آزادی کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایتھنز کی آزادی کا خاص و یہ تھا کہ یہ "بار آور" تھی۔ عرصہ دراز ہوا کہ متجسسوں آرنالڈ نے کہا تھا اور یہ ٹھیک بھی ہے اگر ہم کو یہی معلوم نہیں ہے کہ ہم آزادی سے کیا کام لے سکتے ہیں۔ تو ہمارے لیے آزادی کا حاصل کرنا بہت کم وقت رکھتا ہے۔ ان باتوں سے انسان کو کچھ بھی فائدہ نہیں حاصل ہوتا کہ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے لیے آزاد ہے جب تک اس انسان کو خود یہ نہیں معلوم کہ اس کو کون طریق عمل اختیار کرنا چاہیے لہذا اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آزادی ایک وسیلہ ہے ایک ذریعہ ہے بذات خود

ایک مقصد یا منشا نہیں ہے۔

وقت تو عموماً اس وقت شروع ہوتی ہے جب ایک فرد یا گھارہ آزاد ہوتا ہے
آزادی کے لیے اس کی کشمکش نسبتاً سادہ ہوتی ہے اور اکثر دماغی جدوجہد و تھکائی کے
نفاذ کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں ایسے میں جن میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ آزادی کا استعمال
کر سکیں کیونکہ آزادی حاصل کرنے کے لیے ضرورت تو ہے نیک نیتی کی بلکہ ان کو
استعمال کرنے کے لیے ذہن درکار ہے۔ نیک ارادے سلوایت کے مقابلے میں زیادہ
عام ہوتے ہیں۔

اب ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اتھنز کی آزادی کے دو نتیجے ہوئے۔

(۱) علم و ہنر میں عام دلچسپی

(۲) اصلی شروں کا حصول۔

جب ہم ان باتوں پر غور کریں جو عقل کے ذریعے سے پیدا ہوتی ہیں
تو ایسے مسائل میں انسانی دلچسپی کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے۔ کیونکہ اکثریت
سے ذہنی فضا پیدا ہوتی ہے حالانکہ بہت کلم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کچھ نتائج
کا اظہار کر سکیں۔

کوئی شخص ناگوار موازنہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن کیا رافائل کا زیادہ تر بچے
بعد انگلستان کو علم و فن میں دلچسپی مٹی۔ معلوم ہوتا ہے اس کو اپنے ذاتی آرام و آسائش
اور شخص کی آمدنی کا زیادہ خیال تھا۔ شاید یہ مقابلہ نازیبا ہو۔ کیونکہ ایسے موازنہ سے
جو پہلو پیدا ہوں گے وہ ان مسائل سے زیادہ پیچیدہ ہیں جو ہمارے سامنے
پیش ہیں اور تاہم ہم کو یہ نہیں فرض کر لینا چاہیے کہ کسی قوم کے اندر جنگی کامیابی

ذہنی دھچکیاں پیدا ہو جاتی ہیں یا بہترین عاقلانہ نتائج حاصل ہونے لگتے ہیں۔
 اس لیے یہ بات نہایت اہم ہے کہ ایجنٹ کی آزادی شر اور مصلحتی اور اہل ایجنٹ
 خود جانتے تھے کہ اس کا یہ ایک خاص وصف ہے۔ اسی طرح پریکٹیز کی تعزیر سے رخصت
 اور مدعا کے اعتبار سے بالکل سچائی کے ساتھ اس فخر و ناز کے مسئلہ اسباب ظاہر ہوتے
 ہیں جو ایک ایجنٹ کے باشندے کو اپنے شہر پر تھا۔ وہ گویا ہے کہ ہم ہنر کی حمایت کرتے
 ہیں، مگر کسی قدر ہاتھ روک کر اور علم کے معاون ہیں مگر دائرہ انسانیت سے باہر
 نہ ہو کر۔“

ہماری بڑی چڑھی تہذیب سے سینکڑوں برس مشیر یہ لکھا گیا تھا لیکن
 ہم ابھی تک وحشیانہ طور پر قوموں کی جبروت و سلطنت کا اندازہ اس کی فوجی آرٹنگی
 کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ ایجنٹ والے اپنے شہر کو محض ایک جنگی قوت ہی نہیں سمجھتے
 تھے بلکہ ان کی گنجائشوں میں اس کا پایہ کچھ اور ہی تھا ان میں جو بہترین اشخاص ہوتے
 تھے ان کو صاف طور پر معلوم ہوتا تھا کہ غیر ملکی اطاعت گزاری اور اندرونی جبر و تشدد
 سے مخلصی مل جانے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ نعمتیں ان کو حاصل ہو گئی تھیں اس
 میں شک نہیں کہ دوسرے شہروں کے بمقابلہ ایجنٹ کی تیاری کا تعلق اہل ہنر شعرا اور
 حکما سے زیادہ رہا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ زمانہ بہت تھوڑا ہے جس میں اس کو اصلی
 سیاسی آزادی حاصل تھی۔

اس قلیل عرصے میں ایجنٹ کی تمام دیکھی علم و فن کی طرف مائل تھی۔ سلامتی میں
 اہل ایجنٹ کو غیر ملکی متابعت کے خلاف آخری فتح نصیب ہوئی اور اس کامیابی کے حاصل
 ہونے میں بڑے بڑے نامک نویوں کی کارگزاریوں کا ذکر نہایت دلچسپی باعث ہوا

جن کی بدولت اہل اتھینز کو آزادی مل گئی۔

ایلیوس کا باشندہ ایسکی لوس جس کی عمر جنگ مراقن کے زمانہ میں ۵ سال تھی۔ غالباً اپنے بھائی امینیاں کے جہاز پر تھا جو اہل فارس کے مقابلہ میں جہازی بیڑہ کا سپہ سالار تھا۔ جو کچھ اس نے دیکھا اور محسوس کیا۔ اسی کی بنیاد پر اس نے اپنا نہایت مشہور و معروف اندر جاتا مرسوم بہ اہل فارس تصنیف کیا۔

کوانس کے عالم، سوفوکلیز کو شخص اس کے ذاتی حسن و جمال کی بدولت اس طائفہ میں پیشوا بنایا گیا جو حصول فتح پر عوام الناس کی طرف سے شکرگزاری کے لیے منعقد ہوا تھا۔

یوری پیڈیز نے اُس سال ہی نہیں بلکہ جیسا کہ کچھ اصحاب کا بیان ہے اُنکی روز اس عالم کائنات میں اپنا قدم رکھا جس دن محارب عظیم ہوا تھا۔ ہرے ڈراما نویس اور فتح عظیم کے درمیان اس قدر قریبی تعلق کا ہونا ممکن ہے کہ ایک امر اتفاقیہ ہو۔ لیکن اس سے اسی نوعیت کے انسانوں کا صاف پتہ چلتا ہے جن کو آزاد اتھینز میں آزادی سے اپنی فہم و فراست کے جوہر ظاہر کرنے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ غیر ملکی حملہ آوروں پر دنگو دبار کو بھی اسی قسم کے فتوحات حاصل ہوئے تھے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنے ان فتوحات سے اہل اتھینز کی طرح بخوبی فائدہ نہیں اٹھایا۔

یہ جس قدر بھی ذکر ہے اس کو اتھینز کی مدح و ستائش ایک ایسے شخص کی زبانی نہ سمجھنا چاہیے۔ جو وہاں کے جملہ معائب دور ہو جانے کے بعد عالم ہستی میں موجود تھا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سلامیز کے بعد جس قدر زمانہ گزرا وہ ایک عہد زریں تھا۔

لیکن ان تمام خرابیوں کے باوجود ایجنٹ کو ایک ایسی چیز حاصل ہو گئی تھی جس کی قدر و قیمت سے خود اس کے باشندے باخبر تھے۔

سقراط کو اس کے رفقاء نے خطا وار قرار دیکر نشانہ ستاومت بنایا۔ لیکن پھر بھی اس نے قوانین ایجنٹ کیلئے زبان حال سے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ "تم کو ستر سال کی عمر ملی جس میں اگر بے اطمینانی سے زندگی بسر ہوئی ہوتی تو تم کب کے یہاں سے چلے گئے ہوتے۔ لیکن تم کو ایسی دین پسند آیانہ کر میٹ۔ نہ کوئی اور ریاست اچھی لگی خواہ وہ یونانیوں کی تھی یا وحشیوں کی۔ حالانکہ تم یہ کہنے کے لیے بیتاب رہتے تھے کہ ان پر حکومت نہایت عمدہ طریقہ سے کی جاتی ہے۔ تم بالنگستہ تابینا اور بے وسیع آدمیوں کے پابند بہت کم ایجنٹ سے باہر گئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تم دیگر اہل ایجنٹ کے بالمقابل اس شہر سے زیادہ مطمئن رہتے تھے۔"

سقراط نے جلا وطنی کی حالت میں زندہ رہنے سے ایجنٹ میں مر جانے کو زیادہ بہتر سمجھا۔ ایجنٹ کی آواز منکروہ اس کے دلکش وجود سے روگرواں نہیں ہو سکتا تھا خواہ موت بھی اگر اسے چونکا کیوں نہ دے۔

ایجنٹ کو اپنے تمام باشندوں میں ایسی ہی منزلت حاصل تھی۔ البتہ اسطو ایسے ایک نہایت غیر مصلحت پسند شخصیت کی نگاہ میں اس طرح کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہی نہ تھی جو کسی اصول پرستی پرستی ہو۔

ایجنٹ کی آواز ایسی کہ تمام میں علم و مہر کی جانب لگا مار دیتی اور جدوجہد کا اظہار ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کے مقابلے میں آج تک کسی قوم نے اس قدر نفیل عرصہ کے اندر فنی تعمیر۔ نقاشی۔ ڈراما نویسی اور فلسفہ میں اتنی ترقی ہی نہیں کی

اور یہ تمام باتیں محض اُن چند اشخاص کو نہیں ملیں جن کو ہر طرح کی تفریح البالی نصیب
 غنی بلکہ ان کے حاصل کرنے کا سہرا ایک کثیر تعداد کے سر ہے۔ اسی وجہ سے قدیم
 اتھنز کے حالات میں ایک عقل مند انسان کو اس قدر گہری بچسپی حاصل ہوتی ہے
 کہ اب یہ ایک قوم کے تہذیب و تمدن کا نمونہ بن گئے ہیں۔ حکومت اشرافیہ کی
 بلند زندگی کا اثر اس طبقہ انسانی پر نہیں پڑتا ہے جو اس کے زیر فرمان ہوتا ہے
 بلکہ وہ گروہ غیر اصلاح شدہ ہی رہ جاتا ہے۔ یہ عید و مسخرہ مکر و کھلی چھکی منگول
 جہوریت کا مرقع بنتا ہے۔ اس کا سہرا صرف ادنیٰ اور متوسط درجے کے تربیت یافتہ
 انسانوں کے سر ہے جو ان جماعتوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ایسے ہنر سے کثیر التعداد
 اشخاص کو بچسپی تھی جو اُن اعلیٰ فنون سے کم تر اور کسی شے سے آسودہ نہ تھے۔

جو مکالمات افلاطون زنون نے قلمبند کیے ہیں جن کی بدولت آزادانہ
 مگر مہذبانہ بحث و مباحثہ کے لیے تمام مہذب دنیا کا لہجہ درست ہو گیا ہے۔ ان میں
 زیادہ حصہ اتھنز کے دو کا مذاروں اور تجارت پیشہ لوگوں کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی
 نمائش کرنے والے کے علاوہ اور ہر ایک شخص کو ہماری آج کل کی ہمعصر اقوام کی
 کرٹڈس سال کی تیاری میں اتنی زیادہ بچسپی نہیں دستیاب ہوتی۔ جتنی اتھنز کی صرف
 دو ہزار سال کی تیاری میں حاصل ہوتی ہے۔ دو ہزار سال کا عرصہ گزرا کہ سقراط
 نے لکھا تھا کہ اتھنز نے اپنے بقیہ بنی نوع انسان کو غور و خوض اور اظہار خیالات
 میں اس قدر پیچھے ڈال دیا ہے کہ اس کے شاگرد تک ایک دنیا کے استاد ہو گئے
 اور اس نے یونان کو ایک قوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی ذہن و ذکاوت کے
 لحاظ سے نہایت ممتاز بنا دیا ہے۔ اسی کی بدولت خطاب ”یونانی“ ایک نسلی نام

ایک طرہ علیت بن گیا ہے۔ ایٹھنز نے فن تعمیر۔ نقاشی۔ ڈراما نوپی فلسفہ اور سیاسی اصولوں کے شعبہ جات میں اس قدر کار نمایاں کیے ہیں کہ ان کے شمار کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اسی لیے سیاسی موضوع پر جو کتاب قلمبند کی جائے اس کا آغاز قدرتی طور پر ان کلاہائے عظیم سے ہونا چاہیے جو ایٹھنز میں افلاطون اور ارسطو کے ہاتھوں انجام پائے تھے۔

آزادی کے متعلق ایٹھنز جگہ کا خیال

متنِ بکرہ بالامعیا۔ ایٹھنز کے عظیم اشران فلسفہ سیاسیات میں جھلکتا ہوا خطر آئینگا۔ لیکن اس امر کو مد نظر رکھنے سے کہ افلاطون اور ارسطو کا اپنے زمانہ سے ایسا ہی تعلق تھا جیسا رومو کو موجودہ زمانہ سے ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان مردِ وفیوں کے اعراض زیادہ مانگیر ہیں اور اسی سے سیاسی معیار کے جو کچھ معنی انہوں نے اخذ کئے ہیں اس میں علم سیاسیات کے اکثر مختلف اصولوں کے مطالب مضمر ہیں۔ معاً سمجھ کو آزادی کے بابتہ ایک واحد نقطہ خیال تک اپنی توجہ مبدیہ رکھنا چاہیئے۔ ارسطو یا افلاطون کے تمام و کمال فلسفہ سیاست کے متعلق بحث و مباحثہ میں حصہ لینے کی ضرورت نہیں۔ ایٹھنز پر ان دونوں کی نظر رہی تھی اور ان میں سے ہر شخص اپنے خاص جداگانہ طریقہ سے سیاسی زندگی کی ہر ایک قابلِ تدرج چیز کے بارے میں عوامِ اناس کے نقطہ نظر کے خلاف کام کرتا تھا۔

ان دونوں کا ذکر ہم اب معیار قائم کرنے والوں کے اختیار سے نہیں بلکہ معیار قائم ہو جانے کے بعد ظہور پذیر ہونے والوں کی حیثیت سے کریں گے۔

۲۔ افلاطون آئیٹھنز کے معیار آزادی کے خلاف تھا کیونکہ اس کے دل پر جمہوریت میں فرویت کا ناجائز استعمال دیکھنے سے بڑی چوٹ لگتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک فرد واحد ایک تعظیم شدہ طبقہ یعنی حکومت کے ماتحت ہو کر رہے اور ایک شہری کسی اور دوسری جماعت کا تابع نہ ہو۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جو لوگ واقعی دانشمند ہیں ان میں ہم سب کو اس طرح ایک نظام کے اندر لانے کی قابلیت موجود ہے کہ شخص کو حقیقی معنوں میں آزادی حاصل ہو سکے اور اس میں شک نہیں کہ ایک نقطہ خیال سے افلاطون جمہوریت میں نظام قائم کرنے کا اس قدر متنبی نہیں ہے جس قدر وہ ایسی آزادی کے حصول کا دلدادہ ہے جس میں ہر شخص ان فرائض کا انصرام کر سکے جس کے لیے وہ بخوبی موزوں ہے۔ اس لیے آزادی کا مشاہیر ہی ہیں کہ ”جس شخص کو قدرت نے پاپوش سازی کے لیے پیدا کیا ہے اس کے لیے پاپوش سازی ہی کا کام کرنا درست ہے“ اور اس کے بعد ”ہر شخص کو حکومت میں کوئی نہ کوئی پیشہ ضرور اختیار کرنا پڑے گا اور ہر پیشہ ایسا ہونا چاہیے جس کے لیے وہ اپنے قدرتی رجحان طبع کے مطابق موزوں ہو“ افلاطون کا خیال ہے کہ جس کام کی انسان میں خاص طور پر قابلیت ہو اسی کام کے لیے خود کو محدود کروینا غلامی نہیں بلکہ آزادی ہے اور یہ جمہوریت پسند انسان کے اس بیان کے بالکل خلاف ہے کہ تمام خواہشات یکساں ہیں اور ان کی تنظیم بھی مساوات کے ساتھ ہونا چاہیے۔“

افلاطونی سیار کے مطابق جو حکومت قائم ہو اس کی آزادی اُس حد تک
 امتیاز کی آزادی کے مانند نہیں ہے جہاں تک وہ آزادی رائے عامہ کے مطابق
 نہیں ہے یا اگر ہے تو اس کا انتظام ٹھیک طریقہ سے نہیں کیا جاتا۔ لیکن یہ کہنا غلط
 قیاس نہ ہوگا کہ کام کرنے کی آزادی کا خیال صرف امتیاز ہی میں پیدا ہو سکتا تھا
 اسی لیے ایک معنی ہیں امتیاز کی آزادی ہی کی جھلک افلاطون کے دماغ میں
 نظر آتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ واقعہ کسی قدر انجھا ہوا ہے اور اس کے بارے میں مختلف
 آراء ہیں اس لیے افلاطون کے دماغ میں جو صاف و شفاف پانی کے مانند ہے
 اس کا عکس اس طرح پڑتا ہے کہ یہ ایک پیچیدہ اور تکمیل شدہ نقش معلوم ہونے لگتا
 ہے۔ افلاطون امتیاز کے بمقابل اسپارٹہ کی تنظیم کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوگا۔ لیکن وہ
 امتیاز کی فطرت و کثرت تنظیم سے اجتناب نہ کر سکا۔ اس کی تہ میری تھی کہ خوبی
 تنظیم میں بھی شہری فردیت کا اصول رائج ہو جائے جو ایک امر ناممکن تھا۔ لیکن
 باوجودیکہ جو ذرائع مل افلاطون نے تجویز کیے وہ اسپارٹہ کے اصولوں پر مبنی
 تھے۔ اپنے مقصد و دھماکے لحاظ سے اس کا نقطہ خیال امتیاز ہی کے مطابق
 رہا ہے۔

بغلاف اس کے جن خوابوں کا مشاہدہ افلاطون نے کیا تھا۔ ارسطو
 کے قلب پر ان کا کم اثر پڑا۔ اس کو اپنے استوار کے انجام اور غیر مخصوص حکومت
 کی ناقابلیت میں اس خالص آزادی کے فوائد بھی نظر آتے ہیں جو امتیاز والوں کو
 حاصل تھی۔ اسپارٹہ کی تنظیم پر اس نے زیادہ شک و شبہ کی ہے اور وہ صاف طور پر
 لکھتا ہے کہ مملکت کو بجا طور پر ایک فوج کا پایہ اس وجہ سے نہیں حاصل ہو سکتا جو

کہ اس میں انفرادی افعال کے متعدد انواع و اقسام ہوئے ہیں۔

ارسطو کے قول سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے آزادی کو محض ایک خاص معیار ہی نہیں قرار دیا۔ بلکہ اس کو ایک تکمیل شدہ واقعہ کا جامہ پہنا دیا۔ اس کے خیال کے مطابق آزادی غلامی کی متضاد ہے۔ معمولی انسان آزادی کا یہ منشا سمجھتا ہوگا کہ ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کا اختیار حاصل ہو مگر نہیں۔ یہ غلط ہے اور ہم کو یہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ارسطو نے آزادی کے متعلق اس عام نقطہ نظر کے خلاف کوئی اور فلسفیانہ خیال نہیں پیش کیا ہے بلکہ وہ یہ دکھاتا ہے کہ درحقیقت عام نقطہ خیال سے اس آزادی کا اصل مطلب نہیں ظاہر ہوتا ہے جس کا اندازہ عام لوگوں کے افعال سے کیا جاتا ہے یعنی اس کا منشا یہ ہے کہ آزادی نام ہے کام کرنے کا نہ کہ اس کا ذکر کرنے کا۔ لیکن تم اپنی مرضی کے مطابق کام نہیں کرتے اور تم دستور کے پابند ہو جاتے ہو بہت سے ایسے کسم و رواج جو بظاہر جمہوری معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل جمہوری طریقہ کی حکومتوں کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہوتی ہے وہ آزادی جس سے ملک کی جاری اور قائم رہتی ہے اس کا منشا یہی ہے کہ قوانین کی پابندی کی بجائے لیکن بظاہر یہ اٹیخیز کی اس قسم کی آزادی ہے جس کی تعریف میں فضلاء نے اپنے قلم توڑ دیے ہیں۔ اس کے علاوہ اس قسم کی آزادی کی خاص صفت وہ نسبتی مساوات ہے جو دیگر اشخاص کے بمقابلہ ہر ایک شہری کو حاصل ہو۔ اور اس کو بھی اس ارسطو کے نظریہ ملکیت میں ایک خاص امتیاز جگہ حاصل ہے۔ جب انسانوں میں مساوات سے کام لیا جاتا ہے۔ اس وقت وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یعنی ایک شخص کو یا کسی

چھوٹی سی جماعت کی طاقت کا دوسروں پر غالب رہنا ایک سیاسی نقص ہے۔ جس
معیار سے عامۃ الناس کی ضرورت مہیا ہوتی ہے اس کا نام مساوات ہے لیکن یہ
کیفیت محض اس عہد کی ہے جس وقت ایجنڈہ کی اس آزادی کی تاریخ کا خاتمہ ہوا
تھا۔ جس کی تعریف کاراگ شروع شروع میں ہیرڈوڈس نے ادا پاسیہ

اہل ایجنڈہ کی آزادی کا تنقیدی موازنہ

لیکن دنیا میں کبھی بہترین زمانہ نہیں ہوا۔ تاریخ گذشتہ عہد زریں کی محض
ایک بے سرو پا داستان نہیں ہے اور کسی زمانے میں بھی بنی نوع انسان کو اُن کے
مطلوبہ معیار کے مطابق ہر ایک بات نہیں حاصل ہو گئی۔ اور نہ وہ مقصد پوری طور پر
پایہ تکمیل کو پہنچا جس کے لیے وہ جدوجہد کرتے تھے۔ ہمیشہ نیکی کے ساتھ ساتھ برائی
بھی بہت رہی ہے۔

ایجنڈہ کی آزادی جو سن عیسوی سے پانچ صدی پیشتر اپنے انتہائی عروج
کو پہنچ چکی تھی۔ اس کا بہترین دور صرف تقریباً ۵۰ سال رہا جس زمانے میں
ایجنڈہ کا ستارہ نصف النہار پر تھا اس وقت وہ غلاموں سے بھرا ہوا تھا عورتوں
کے لیے ذرا بھی سیاسی آزادی موجود نہ تھی۔ بیماری اور مفلسی کی تکلیف بھی اس
عہد میں ہمارے ایام کے مقابلے میں کچھ کم نہ تھی۔ جنگ کے اندیشے اور
درباروں میں دہن و دیانت کی کمی کی سبب سے ایجنڈہ کبھی عالیشان شہر نہ بن سکا
بلکہ وہ جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ اس کی حالت قریب قریب مجسمہ ویسی ہی تھی جیسی کہ

آجکل کے زمانے میں ہم لوگوں کو معلوم ہے جمہوری آزادی حاصل ہو جائے۔ اسے
 ایجنڈے میں ملکی سیاسیات کی خوبی کے لحاظ سے کچھ ترقی نہیں ہوئی نہ اس کے
 میاں ہی میں کچھ اضافہ ہوا۔ اور شہر کے اندر افراد کی آزادی کی اڑ میں حشبانہ
 رشک و حسد اور آزادی و خود مختاری کا اظہار کیا جانے لگا تھا جس زمانے میں ایجنڈے کی تہذیب کا
 آفتاب بدر کا لبلبہ ہوا تھا۔ اس دھرم و اس کی حالت نہ سید۔ سید پناہ نہ دیتے
 ملتی تھی۔ آزادی میں خود مختاری کا اس امر سے نہ تھی۔ اس امر سے نہ تھی۔

میں ہر شخص کو ذیل دینیے کا اختیار ہے۔ ہر اس ایجنڈے میں نہ معاملات میں
 خواہ خواہ دست اندازی کیا کرتا تھا۔ بلکہ شہر و شام میں، دن اور عالم مجروح کا حال
 ہمارے سننے میں آتا ہے اور خود۔ قرطی کی موت حکومت عدلیہ کی حکومت سے
 نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے الزام جمہوریت پر ہے جو ہر ایک غیر معمولی انسان کو
 مشہور نکالوں سے دیکھا کرتی تھی۔

جیسا کہ افلاطون نے مشاہدہ کیا تھا۔ شہروں کے دل اس قدر بڑی ہیں
 ہیں کہ وہ ذرا سی بھی غلامی کی علامت دیکھ کر جگر پر فریاد اٹھاتا ہے اور ہر جگہ سے
 ہیں کیونکہ یقینی طور پر تم کو اس بات کا علم ہے کہ وہ قوانین کو کم اہمیت دیکھ
 خواہ وہ کمزوری ہوں یا رسمی خانہ کھڑے ہیں جس سے اسے خیال کے مطابق
 ان پر لہی سر غنہ کا سایہ تک نہ پڑ جائے اس کے بعد انسان فائق کی آزادی
 کے متعلق نیش کا نقطہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ مافوق الانسان سے ہر ایک
 ایسا شخص مراد ہے جو اسی بات کو قانون بنا دیتا ہے جو اس کو پسند آتی رہا ہوا
 طرح طرح کی آزادی کا اپنی انتہا سے گذر کر عدالتوں کی غلامی میں تسمہ مل

جو جانے کا گمان باقی نہیں رہتا۔ اسی جمہوریت سے پھر مطلق العنانی کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے۔

ان سب باتوں میں افلاطون نے جو اخلاقی طریقہ حکومت کا حامی تھا۔ مبالغہ سے بھی کام لیا ہے اور یہ باتیں اس تاریخی واقعہ پر مبنی ہیں کہ ایتھنز میں حکمران فرقہ کے قائم کئے ہوئے نظام پر کبھی لبیک نہیں کہا جاسکتا تھا۔

ارسطو کا قول ہے کہ انسان کو آزادی اس میں نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ قوانین و ضوابط کی متابعت سے روگردانی کرے کیونکہ اس میں اسی کے لیے نجات ہے لیکن بظاہر ایتھنز والے اکثر حالتوں میں ایسا خیال کرتے تھے۔

اس کے علاوہ شخص کی آزادی کا براہ راست نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں ناقابلیت کی وبا پھیل گئی۔ افلاطونی نقطہ خیال کے مطابق جو شخص جمہوریت پسند ہے اس کا عقیدہ ہے کہ تمام خواہشات یکساں ہیں اور ان کا احترام مساوات کے ساتھ ہونا چاہیے کیونکہ جو لوگ انفرادی آزادی کے حامی ہیں وہ یا تو افراد کے اندر قابلیت باصفات کے امتیاز کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں یا اس سے بھی خراب صورت حالات یہ ہے کہ وہ شخص یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ صفات وہی قابل قدر ہیں جن کو انسان کی ایک کثیر التعداد قبول کرے جہاں لوگوں کو اپنی حکومت کے اصول قائم کرنے کے لیے اپنی آرا کی قوت صرف کرنے کی آزادی مساوی طور پر حاصل ہے وہاں کوئی بھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ایک شخص کی رائے دوسرے کے خیال سے زیادہ قابل قدر ہے اور چونکہ کثرت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جن میں عام طور پر سچیدہ مسائل پر غور و خوض کرنے کی استعداد

نہیں ہوتی۔ جن آراء کے مطابق عمل درآمد کیا جاتا ہے وہ بالعموم ادنیٰ درجہ کی ہوتی ہیں۔ یہ اُس حالت میں اور بھی خطرناک ہوتا ہے جب افراد کی آزادی ان کے اپنے آقا کے انتخاب پر مائل کرتی ہے۔

ناقابل اشخاص جس کو منتخب کرتے ہیں وہ ہمیشہ ایسا شخص ہوتا ہے جس کے افعال و خیالات بخوبی ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔ مگر صفات عالیہ کم سمجھ میں آتی ہیں

کلی ان ایسے سرغٹاؤں کے انتخاب پر نظر ڈالتے ہوئے ہوسٹی ڈاؤنس اور افلاطون دونوں اس قسم کی دلیل پیش کرتے تھے۔ ارسطو سیاسی مسائل پر نہایت باریک بین ہونیکے باوجود ناقابل رہنماؤں کا انتخاب پسند کرتا ہے اور یہ امتیاز کی آزادی کا خراب ترین پہلو تھا۔

آخر کار اس کا یہ نتیجہ نکلا جو نہایت مہلک ثابت ہوا کہ امتیاز میں اُن دیگر جمہوروں کو جو اس کے زیرِ اقتدار تھے وہ آزادی نہیں دی جاتی تھی جس کو خود اپنے لیے نہایت اعلیٰ سمجھ رکھا تھا۔ اسی لیے اُس کے اتحادیوں اور اس کے دشمنوں نے اس پر ایک خود سر شہر ہونے کا الزام عائد کیا جو کسی طرح بھی بجا نہ تھا اور تھوسسی ڈاؤنس کی پانچویں کتاب میں ایسے شہر یادگار کے متعلق بہت بُرا بھلا لکھا گیا ہے جو اپنے محکوموں کو خود اس قسم کی خود مختاری دینے سے انکار کرتا ہے جس کو حاصل کرنے پر اس کو فخر دنا تھا۔

سنسکرتی میں امتیاز کا زوال اُس آزادی کے باعث نہیں ہوا جو اس کو حاصل تھی بلکہ اس نے پیادہ خود اپنی ذات تک محدود کرنے کی پے در پے

کوششوں سے اس کو خاتمہ کا سنہ دیکھنا پڑا۔ ممکن ہے کہ تاریخ سے کوئی خاص اخلاقی سبق نہ حاصل ہو۔ لیکن لوگ تھوڑی ڈانڈ سے اس خیال کے نصف سے زائد موافق ضرور ہیں کہ جو لوگ دوسروں کو ان باتوں سے محروم رکھنا چاہتے ہیں جن کو وہ اپنے لیے نہایت ضروری تصور کرتے ہیں۔ ان پر انصاف کی دیوی کا عتاب ہوتا ہے۔ (ایتھر کو خود مختاری حاصل ہوئی اور اس نے اس سے کام بھی لیا اور اس کے بعد اسی آزادی کی بنیاد پر اس نے شہنشاہیت کی طرف لیکنا واجب قدم بڑھا دیا اور اجتماع دولت کی حرص بجا اس پر غالب آگئی۔

نتیجہ

لیکن جس حالت میں ایتھر کے خلاف نہایت خراب باتیں کہی جاتی ہیں اور جو کچھ کہا جاتا ہے وہ ایک حقیقت بھی ہے۔ اُس معیار کو ذہن نشین کرنے کے لیے پھر بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا ہے جس کی بدولت اس کو اس قدر ترقی حاصل ہوئی تھی وہ معیار تین ہم کو بھی ملتا ہے اور اُس کے چل کر دیکھا جائیگا کہ حال کے انفرادیت پسندوں یا اشتراکیوں کے ارادوں میں معیار کی کس طرح نشوونما ہوتی ہو گیونکہ ہمارا ابھی تک یہ خیال ہے کہ ہر شخص کو آزادی سے ترقی کرنے کا موقع ملنا چاہیے اور حکومت کے کاروبار میں تمام افراد کو یکساں طور پر حصہ لینے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ ایتھر کو زوال نصیب ہوا اور وہ پہلے خود سر اور آخر میں تابع بن گیا تاہم اپنے سیاسی معیار کے لحاظ سے بھی ہمارے لیے اتنا ہی سرمایہ معلومات و تجربہ چھوڑا ہے جس قدر صنعت و حرفت کے کاموں میں۔ یہ دیکھا جائیگا کہ جس وقت

ایتنھز والوں کو اہل روم نے فتح کیا اس زمانے میں اول الذکر کی حالت کسی طرح بہتر نہ تھی۔ اور ایتنھز کو فتح کرنے کے بعد دراصل اہل روم نے خود اس کو وہ آزادی دیدی جس سے انہوں نے اپنے مقبوضات کے دوسرے شہروں کو محروم رکھا تھا۔

ایتنھز اپنے فاتحوں پر اپنے معیار کے لحاظ سے غالب رہا لیکن اس وقت اس کو خود وہ آزادی حاصل نہ تھی جس کو اس کے منصب العین کے مطابق دراصل آزادی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی آزادی ایک غلام کی سی تھی جو اپنے کاروبار کے علاوہ اور تمام کاموں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا اس کو اسی قسم کی آزادی حاصل تھی جیسی ایک کاریگر کو حاصل ہوتی ہے جو اسی وقت تک اپنے علم و فن کا کام جاری رکھ سکتا ہے۔ جب تک وہ اجرت کے لیے کچھ چوں دچرا نہیں کرتا۔ ایتنھز اس طرح پھر ایک شہر نہیں رہا۔ بلکہ علم و فن کے قدر دانوں دفتینہ رسول اور زبان دانوں کا ایک دارالعلوم ہو گیا تھا کیونکہ ایتنھز کی آزادی کا جو معیار تھا اس کے بغیر کسی تہذیب کا وجود نہیں ہو سکتا۔

ہمارے دہس موجودہ مضمون تہذیب مغربی تک محدود ہے لیکن چونکہ اس مقصد کے لیے سیاسی ترقی کی تاریخ کا آغاز ایتنھز کے تذکرے سے ہوا ہے یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شاید یہ مضمون فی الواقع ایسا ہے جس کا تعلق محض یورپ کی تہذیب ہی سے نہیں بلکہ تمام آدم زاد کی تہذیب سے ہے۔ یہ اچھی طرح ظاہر ہے کہ ایتنھز اور روم کے قوانین اور حکومت میں جو اصول پہلے پہل سمجھ بوجھ کر رکھے گئے تھے وہ کسی خاص ملک کے اشخاص کے بنائے ہوئے نہ تھے بلکہ عام انسانی دماغ کی اختراع تھے۔ یہ آج کل مغرب و مشرق کے مقابلہ یا یورپی اور ایشیائی

تحریک کے باہمی موازنہ کے سوا اور کوئی بات لوگوں کی زبان پر بہت کم رہتی ہے ہم
یورپی تہذیب کو فائق اور مادی طور پر بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن جس وقت ہم یورپی اور
ایشیائی تہذیب کی باہمی تفریق کے اسباب کی تحقیقات کرنے لگتے ہیں اور جب
ہم ان خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں جن کے باعث مغرب اور مشرق میں اس قدر
اختلاف ہے تو ہم کو یہ چلتا ہے کہ وہ ہیں حقیقت پر یکجہ۔ وہی ہیں جن کی وجہ سے یونان
اور اس وقت کے مشرق کے درمیان اختلاف حال تھا اخلاقی پہلو کو دیکھتے ہوئے
موجودہ یورپی مملکت کے شہری کو یونانی شہر کے باشندے کی طرح اس امر کا علم ہوتا ہے
کہ اس کو اپنے ملک کی حکومت میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے اور اس کے اور ایک
اہل مشرق کے درمیان جو فرق ہے وہ ایک زیادہ بلند اخلاق سیاسی۔ زیادہ مردانہ
وار خود اعتمادی اور پیشروی کی زیادہ طاقت کا ہے ذہنی لحاظ سے جو فرق دونوں
میں ہے وہ مازک زندگی کا ہے جو یورپ کے ایک شہری کے احساس علم طبیعیات
اور متانت آمیز اور عظیم الشان ادبی فتوحات اس کے بخوبی آدائش شدہ خیالات
اور اس کی عاقبت اندیشی کی قوت کی بنیاد ہے۔ موجودہ یورپ کو یہ صفات حاصل
کہاں سے ہوئیں۔ ان اوصاف کا اخلاقی حصہ زیادہ تر اسی منبع سے حاصل
ہوا ہے جہاں سے یونان والوں کو حاصل ہوا تھا۔ یعنی سیاسی آزادی۔ اور ذہنی
حصہ براہ راست یونان والوں سے لیا گیا ہے جس خصوصیت کو ہم اپنے نیا معیار
میں یورپی اسپرٹ کہتے ہیں وہ درحقیقت یونانی حمیت ہے جس نے دوبارہ
جنم لیا ہے۔ یہ الفاظ ایک ایسے مورخ کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں جس نے
مشرق پر مغربی تہذیب کے ابتدائی اثرات کا ذکر کیا ہے۔ اور جس سیاسی

آزادی کا ذکر اس نے کیا ہے اس کا اظہار زیادہ شان و شوکت کے ساتھ اتھینز کے سوا اور کسی شہر میں نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ اس سیاسی آزادی کا نقش اس وقت بھی یونان کے اکثر شہروں میں موجود ہے۔



تیسرا باب

نظام روما

اگر قانون اور نظام ان دونوں چیزوں کا سلسلہ ہمارے دماغوں میں کسی سبب سے جاگزیں ہے۔ تو وہ وجہ یہ ہے کہ روما میں پہلے ہمارے اجداد تھے اسی روما کی بدولت انہوں نے موجودہ یورپ کی تہذیب قائم کی۔ روما پہلے پہل ایتھنز سے کسی نہ کسی طریقہ پر بھی بڑا شہر نہ تھا۔ مقامی نقص کے باعث اس کی تجارت بھی ترقی نہ کر سکتی تھی اور نہ اس میں کوئی بڑا اہل ہنر موجود تھا۔ اس نے وہ فوائد دریافت کیے جو اس کے مسلط قانون اور حکومت کی بدولت حاصل ہو سکتے تھے اس نے اتفاقاً رقابت کے دوران میں مغربی یورپ کو ان تمام باتوں کی خوبی کا ثبوت دیدیا جو اس نے حاصل کی تھیں۔

روما کے زمانہ عروج میں دیگر اقوام میں کیا واقعات پیش آ رہے تھے اس کے متعلق ہم ایک امر مسلمہ سمجھتے ہیں کہ تہذیب کے لیے نظام بھی اسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ آزادی تباہی کی درق گوانی کیے بغیر ایک سیاسی فلسفہ کو یہ

تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آزادی نظام کے بغیر ایک امر بے معنی ہے جس کا منشاء بالفاظِ دیگر یہ ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے راستے سے اس طرح غلطیہ رہ سکتے ہیں کہ ہر شخص کہ دونوں میں کسی نہ کسی ایک راستے پر چلنے کے لیے راضی کریں۔ قیام نظام آزادی کی حد یا آزادی کو معرضِ عمل میں لانے کے لیے ہمیں ہی نظام اسی وقت نظر آتا ہے۔ جب ہم ان باتوں کو ایک مسئلہ سمجھ کر ان پر غور کرتے ہیں۔ ایک واسطہ درجے کا انسان تو دونوں کے متعلق صرف نہ بانی بات چیت کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔

نظام کا موجودہ معیار

بہر حال کم از کم اس نظام کی عام نوعیت کا تذکرہ ضروری ہے جس کی تعریف کرنے میں ہم لوگ متفق الرائے ہیں۔ نظام سے پہلے مراد یہ ہے کہ انسانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان جنہیں ہم حکومت کے نام سے موسوم کرنے میں۔ باہد بیک کوئی مسلحہ علاقہ ہو۔ مثلاً کینٹ کے ضلع کو یہ اختیار نہیں ہے کہ انگلستان کے دوسرے اضلاع کو نظر انداز کر کے فرانسی کے ساتھ علیحدہ معاہدہ کرے وہ طبقہ کم از کم نسبتاً پائدار اور منظم ہونا چاہیے اور ہر ایک بڑے گروہ میں تخت یا جزوی جماعتوں کے مابین ایک دوسرے کے ساتھ کچھ مستقل علاقہ ضرور ہوگا۔ گویا جس طرح آزادی اصول تبدیلی کا نام ہے۔ اسی طرح نظام اصول پائیداری ہے اور ایک مہذب زندگی میں دونوں چیزوں کی ضرورت ہے،

جہاں ترقی اصلی منوں میں ہوتی ہے معمولی پر نظام حالات وقت (مراد آزادی) کے مطابق برابر دنا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح جو کچھ صورت حالات میں جاتی ہے اس میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی سبب سے ایک کسی سیاسی طبقہ کو اپنی نوعیت کی ترقی کے لیے اس وقت تک کوئی موقع نہیں مل سکتا جب تک اس کے اور دوسرے گروہوں کے باہمی تعلقات مستحکم نہ ہو جائیں۔ ایک فرد کے دوسرے فرد کے ساتھ باہمی تعلقات میں اسی قسم کے استحکام کی ضرورت ہے خواہ چارے اغراض مہذب ہی کیوں نہ ہوں مگر ہم اس وقت تک آرام سے نہیں رہ سکتے جب تک ہم کو یہ نہ معلوم ہو کہ ہم ہیں کہاں جس سے ہم قریب یہ کہہ سکیں کہ قانون کو انصاف پرورد ہونے کے بتقابل قطعی ہونے کی زیادہ ضرورت ہے۔ ایک نیک مگر انتخابی حکمران کا نرم دل ہونا تہذیب کے لیے اس قدر زیادہ قابل قدر نہیں ہے جس قدر قانون کا غیر متزلزل ہونا۔ اس کا احساس تو نہیں ہوتا مگر ہر ایک شخص کے لیے وہ عام ہے جس کا اس کے ساتھ تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ اب ذاتوں کا دستور قریب قریب مندر کے لیکن ایک معنی میں تمدنی قوانین سے مہذب حکومت کو فائدہ پہنچتا ہے۔

اگر ایک شخص کوئی ایک خاص فرض ادا کرتا ہے اور دوسرے اشخاص کے ہاتھوں سے دیگر فرائض انجام پاتے ہیں تو ان دونوں کے مابین کچھ مستقل تعلقات قائم کرنے سے بڑا فائدہ ہے۔ کیونکہ محض ایک حکومتی جماعت میں بھی اغراض عامہ یا خاص معاشی آزادی کے لحاظ سے دیگر جماعتیں موجود ہوتی ہیں۔ اس لیے ہم یہ ایک امر مسلمہ قرار دیتے ہیں کہ ایک حکمران گروہ کی

اس طریقہ سے تنظیم ہونا بہت اچھا ہے کہ جن اجزاء سے مل کر یہ جماعت بنی ہے وہ محض جداگانہ انفرادی رستیاں نہ رہیں بلکہ ایسے انفرادی طبقے بن جائیں جن کے مقاصد عام ہوں۔ یہ ہے معیار قانون اور نظام کا جو ہم کو اپنے زمانے میں نظر آتا ہے یہ زیادہ تر ہم نے روماری سے لیا ہے۔

روما کی پہلی جماعت بنی

رومانے جس طور سے پہلی مرتبہ ہمیشہ کے لیے نظام کا سیاہی معیار قائم کیا اس کی تشریح کرنے کے لیے اولاً یہ ضروری ہے کہ روما کی تاریخ کا مختصر تذکرہ کیا جائے اور اس کے بعد یہ دکھایا جائے کہ جن لوگوں نے روما کے ارتقا کا مشاہدہ کیا ہے انہوں نے اس کی تحریک کا کیا مشاہدہ کیا۔ یہ دکھانے کے لیے سلطنت روما کا صعود کس طرح ہوا۔ اس بات کی حاجت نہیں ہے کہ تاریخ و واقعات قلبند کیے جائیں کیونکہ ہم جس بات کا درس حوالہ قلم کر رہے ہیں وہ ہے معیار کی ساخت۔ اسی لیے ہم کئی کئی صدیوں کو اسی ایک تحریک کے متعدد جزو قرار دیں گے۔

جو تکالیف پیدا ہوئیں انہیں کی وجہ سے معیار قائم تھا۔ قبائل کی باہمی معاونت اور مختلف رواجوں کی پیچیدگی کا اثر لوگوں پر خراب پڑا۔ اس کے خلاف ان کو ایک ایسی زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے جو روما کے قائم کئے ہوئے طریقہ اتحاد اور قانونی یکسانیت کی وجہ سے زیادہ بہتر کرنے کے قابل تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی تاریخ میں ایک خاص مقصد پیدا ہو گیا اور یہ ایک ایسا کام تھا جسے کامیاب لڑائیاں یا شہر کے بڑے بڑے آدمی بھی نہ پورا کر سکتے تھے۔

لیکن یہ لازمی ہے کہ یہ معیار اس حد تک نمایاں نہ تھا جس قدر آجکل ہمیں معلوم ہوتا ہے اور نہ اس کی ایسی عزت کی جاتی تھی جیسی ایتھنز میں آزادی کی قدر کرتے تھے۔

فلسفہ تاریخ کی بہت زیادہ مبہم اور عام باتوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے کہ حالانکہ تہذیب کی بنیادی تعمیر میں نظام آزادی کے لیے ایک جزو لا ینفک ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس بات کا کوئی نمایاں سبب ہے کہ ایتھنز کا معیار ایک بہت چھوٹے ضلع کے اندر اصول آزادی کے وسیلے سے کیوں صعود پذیر ہوا تھا جبکہ روما کی زندگی کو اصول تسلط کے ذریعے سے توسیع حاصل ہوئی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اہل روما کو ایتھنز کی آزادی کے زوال کا حال معلوم تھا یا وہ اپنے نظام کے قائم کرنے میں گذشتہ تہذیب کے تجربے سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

محض کسی امر اتفاقیہ کے سبب سے اہل روما کے دل میں یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ بد نظمی اور عدم حکومت یہ دونوں چیزیں زندگی میں خاص خرابیاں ہوتی ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں مان سکتے کہ اس سے کوئی تاریخی بحث پیدا ہو جاتی ہے یا یہ کہ تاریخی منطق کی رو سے یہ کسی معنی میں ضروری ہے اس قسم کے فکروں سے مغالطہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کسی قوم کی ترقی کا راہنہ گز

برعکس اصول سے سمجھ نہیں آ سکتا ہے۔ خیال یہ ہے کہ ترقی کے لیے ہمیشہ راستہ کھلا ہوا ہے اور نہ ہیگیل کے اس خیال سے اس کی عقدہ کنائی ہوتی ہے کہ ہر ایک قوم نہ در بالضرور اسی قسم کے جاہد تربیت میں گامزن ہوتی ہے جو ایک فرد انسان کی زندگی میں نظر آتا ہے۔

یہ ضرور ہی رات نہیں ہے کہ نیا قانون ہی جاری کیا جائے اور پھر سمجھا بھی سکیں۔ یہ ہے کہ ایسے قانون کا کیا فائدہ۔ بے یکیں جیسی کہ شہادت میں جو ہے وہ ارتقاء تہذیب کے لیے کوئی عام قانون بنادینے کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ یہ خیال کہ محض ایک امر اتفاقی کے سبب سے یہ ترقی ظہور پذیر ہوتی ہے فلسفہ کی رو سے بیکار ہے۔ یہ کوئی نہ سمجھ لینا کہ چونکہ کہ ہم اس قاعدے سے فی احوال تادافع ہیں جس کے اثر سے قومی ترقی ہوتی ہے اس لیے ہم کو اس کا علم کبھی نہیں ہو سکتا بالکل بے بسی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بر قدرت یا انسان کے قواعد آشکار ہیں۔ اس سلسلہ کو دیکھ کر ہم تاریخِ روم کی زندگی کے دوسرے عظیم الشان مبادی کی سادہ بر ترقیدی نظر ڈالیں گے۔

اطالیہ کا اتحاد

پہلے پہل لاطینی اتحاد۔ ایک قبیلہ کی سرگزگی میں قائم ہوا تھا۔ اس زمانے میں جداگانہ قبائل حالت انتشار میں تھے مگر روم نے اپنے متعلقین کے درمیان ایک سلسلہ رشتہ اتحاد منضبط کیا اور غیر ملکی دلوں سے فحاشیت

رکھی۔ ان غیر ملکیوں کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا کہ اگر وہ عقل سے محروم نہیں تو کم از کم کم فہم ضرور ہیں۔ جیسا کہ یونان میں ہوتا تھا بلکہ ان کو سیاہی فقط خیال سے مخالف سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ سیاسی مخالفت شروع شروع میں جنگی خصومت پر مبنی تھی۔ یونان کے "وحشیوں" اور روما کے "دشمنوں" میں یہی فرق تھا۔

اہل روما جس طریقے سے تمام اطالیہ پر رفتہ رفتہ حکمرانی کرنے لگے اس میں بھی ہم کو اسی تحریک کا جزو نظر آتا ہے۔ جہاں جہاں رومادوں کے قدم پہنچے وہاں آسے دن کی تباہ کن رنجش و عناد کے عوض استمراری تنظیم قائم ہو گئی۔ روما کے اس نظام کا پتہ خارجی طور پر دہاں کی سڑکوں اور نوآبادیوں سے ملتا تھا۔ روما سے تمام محکوم اضلاع کو سڑکیں جاتی تھیں۔ ان کی بدولت نئی تجارت مستقل طور پر جاری ہو گئی۔ اور مملکت کو ان قدر ترقی مقامات تک پہنچنے کا ایک ذریعہ حاصل ہو گیا۔ جو روما کی ترقی میں سدراہ تھے کیونکہ ان جنگلی مقامات کے جو مختلف قبائل کے ہندو بست کو منقسم رکھتے تھے۔ سڑکوں کے کنارے کنارے سلسلہ آمد و رفت جاری ہو گیا۔ جس سے لوگ ایک ہی زنجیر میں متحد ہو گئے۔ اور روما کی افواج ان سڑکوں پر ان غنیمتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تیزی کے ساتھ جاسکتی تھیں جس کو ان معلوم مقامات کا پتہ لگانا ہوتا تھا۔ جہاں اہل روما کی اس وقت تک رسائی نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح ملک میں تسلط رکھنے کی غرض سے ۳۱۲ء میں روما اور کیپوآ کے درمیان عظیم راستہ موسوم بہ اپیا بنایا گیا۔ اور راستہ

سلیمنہ ۱۲۰ سال ق م میں اس مقصد سے جاری کیا گیا۔ کوشل کی طرف
جاسکیں۔ شمالی اطالیہ کے اُس پار تقریباً سلسلہ ق م میں ٹرک اپیلیا بنائی
گئی اور اس کے بعد سلسلہ ق م میں اپیلیا سیکاری کی بنا ڈالی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ اطالیہ کے قدیم نقشے میں رپ سے زیادہ عجیب خیز
یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس میں جتنی سڑکیں ہیں وہ روم ہی سے نکلی ہیں اور
جتنی جتنی سلطنت رومادست پذیر ہوتی گئی اس کی سڑکوں میں اضافہ ہوتا گیا
اور انہیں سے اس کی رفتار ترقی کا پتہ چلتا تھا۔ دور دراز شمالی برطانیہ میں بھی
ان سڑکوں کے ذریعے سے وہاں کے لوگوں کا تعلق تہذیب کے مرکز سے
رہتا اور تسلط قائم تھا۔ جب پانچویں صدی میں روم کی سلطنت اٹھٹھاٹھا
توسڑکیں بھی شکستہ ہونے لگیں حتیٰ کہ آخر کار شمال کے درمیانی دور کی نئی تہذیب
میں اُن کا شمار اُن چند نماواں آثار قدیمہ میں ہونے لگا جو اس زمانہ کے باقی
رہ گئے تھے جب روم میں آج کل سے زیادہ تسلط قائم تھا اس میں شبہ
نہیں کہ سترہویں صدی تک قریب قریب تمام یورپ آمد و رفت کے لئے
فراموش شدہ روم کی سڑکوں کا ہی محتاج رہا۔ سڑکوں کے ساتھ ہی ساتھ ہیں
نواآبادیوں کو بھی اہمیت دینا پڑیگی جو سرو کی نگاہ میں اصول شہنشاہیت
سلطنت کی اشاعت کا باعث تھیں۔ یہ نواآبادیاں اُن بے ترتیب آبادیوں
سے لازماً مختلف تھیں۔ جن میں لوگ اپنی خوشی سے آکر لازماً رہنے لگے تھے
یہ نواآبادیاں قیام نظام یا بیرونی حملوں سے حفاظت کے لیے حکومت کی طرف
سے قائم کی گئی تھیں۔ جن روم کے باشندوں نے اُن آبادیوں میں جا کر

بود و پاس اختیار کی تھی وہ سپاہی سمجھے جاتے تھے ان کو اراضیاں اور جاگیر میں دی جاتی تھیں۔ اور اس خط کے قدیم باشندوں کو جہاں نوآبادی قائم کی جاتی تھی تھوڑی سی زمین عطا کر دی جاتی تھی۔ روما کے ان نوآباد کاروں کو وہ حقوق حاصل تھے جن سے روما کا ایک شہری مامور ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ بعض اور بھی نوآبادی تھیں جنہیں لاطینی سمجھتے تھے اور ان کے باشندوں کو روما کے بہت کم سیاسی حقوق حاصل تھے۔

ہمارے موجودہ مقصد کے لیے اس کے تفصیلات غیر ضروری ہیں۔ نوآبادیوں کے آزادانہ قیام کی بدولت تمام مغربی یورپ میں اتحاد ہو گیا تھا۔ سرکاری زبان ایک تھی۔ اکثر در دراز اختلاف کے لیے قانون بھی یکساں تھا اور خود روما میں ہر ایک نوآبادی کی سیاسی زندگی اس کا کم و بیش ایک مکمل خاکہ تھی لیکن اگر قانون رومانہ ہوتا تو مشرکوں اور نوآبادیوں سے روما کی تنظیم ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔

روما ایسے عظیم الشان مقام کا اپنی تاریخ کے ابتدائی زمانے میں دائرہ قوانین کے متعلق بحث میں مشغول رہنا اس کے عیار کو واضح کرنا ہے تمام اقوام میں ایک روما ہی ایسا شہر تھا جس نے سب سے پہلے قطعاً رسوم قبائل کے پُرانتشار طریقے کا انشاء کیا۔ اور ان لوگوں کے لیے خاص قواعد و قانون تیار کیے۔

خود اہل روما کی نگاہوں میں قانون مہذبانہ زندگی کا پشت پناہ ہی تھا اور اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس حالت انتشار میں اہل روما

دوسروں کے لیے ایک قانون سوچ کر نکالا۔ قوم۔ زبان اور ملک کے لحاظ کے بغیر عام اصول استحقاق کے بنانے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک عالم کی بنگالہ میں نظام روما کیا معنی رکھتا تھا۔ پچاسویں فیصلوں کے بجائے روم والوں نے اصولوں کی تصدیق اور مختلف مقامی دستوروں کی جگہ اصولوں کی عالمگیر ہی کا طریقہ رائج کر دیا۔

لیکن رومانے یہ جو کچھ بھی کیا اس میں اس کا یہ نہ اشارہ تھا کہ اس کے اتحادیوں اور محکموں کو خود اس کی برابری کا باہر یہ جمل ہو جائے۔ روم والے ہر ایک مقام کے رائج الوقت خیالات کا احترام کرتے تھے مگر تمام مقامی اغراض کا مرکز خود روم ہی تھا۔

رومانے ہر ایک مقام کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے اور ہر ایک کو براہ راست اپنا ماتحت بنا کر نظام قائم کیا۔ اس طرح اطالیہ کے قدرتی حدود کے جلیب روم کی جو نقل و حرکت ہوئی اس میں حقیقت بد نظمی یا باہمی اختلاف اور انتشار پسندی کی دبا کو دور کر کے اس کی جگہ قانون اور حکومت کا ایک طریقہ رائج کیا گیا تھا۔

نظام سلطنت

روم کی تاریخ کے دوسرے دور کا آغاز روم کی ابتدائی مہمات سے ہوا جو بیرون حدود اطالیہ کی گئیں اور جو نظام اطالوی قبائل کے لیے سودمند ثابت

ہو چکا تھا اس کو تمام مغربی یورپ بعض حصص اشیاء اور ازلیہ میں جلد ہی قبولیت حاصل ہو گئی۔ جو کچھ دولت نے حاصل کیا تھا شہنشاہیت نے اُس کو مستحکم بنا دیا۔ لیکن ہمیں اس بات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ روم کی سلطنت محض شمشیر کے زور سے حاصل کی گئی اور تلواریں کے اعانت سے محفوظ بھی کیا گیا۔ کیونکہ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جن معنوں میں ہم آج فن سپہگری کا اندازہ کرتے ہیں۔ ان معنوں میں اہل روم سپاہیوں کی قوم نہ تھے۔ جنگی خدمت ان کو ہمیشہ باخاطر معلوم ہوتی تھی اور روم کا فوجی سپاہی خود ایک ایسا زباد شخص تھا جو اپنے ساتھ محض روم کا اقتدار و وقار ہی نہیں لے جاتا تھا بلکہ وہاں کا نظام بھی اسی کے ہاتھوں سے قائم ہوتا تھا۔

رومانے خود اپنی حدود کے باہر جو قدم رکھا تھا محض اسی میں یہ نظام نظر نہیں آتا۔ بلکہ غیر ملک والوں کے اس شہر میں آنے سے بھی اس کے کار آمد ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس شہر کی تاریخ کے شروع سے آخر تک اس کی تقدیر پر غیر ملک والوں کی موجودگی سے بھی بہت اثر پڑا۔ ہم صاف طور پر یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو اگر کسی چیز نے اپنی طرف کھینچا تھا تو وہ خود روم کا نظام تھا روم کے باشندوں میں جس قدر شور و غل برپا ہوئی وہ درحقیقت کسی ضدی قوم اور غیر ملکوں کے درمیان واقع ہوئی تھیں۔

قدیم اطالیہ میں تمدن کے عدم استحکام کی وجہ سے لوگوں نے ایسی جماعتوں کے مقبوضات میں بود و باش اختیار کرتا پسند کیا جن میں خود کو اور ان لوگوں کو بر دنی عملوں سے محفوظ رکھنے کی طاقت تھی۔ اس کے ساتھ ہم اُس

تجارتی فائدے کو بھی مد نظر رکھیں گے جو روم کو ضرور نصیب ہوا ہوگا لیکن سب سے بڑی بات جس کو دیکھ کر غیہ ملک والے یہاں آ کر آباد ہوتے تھے یہ بات تھی کہ یہاں کا قانون نہایت موزوں اور فائدہ مند تھا۔ اس طرح باہر جا کر وہاں کے باشندوں میں تسلط قائم کرنے اور ان لوگوں کو نظام میں لانے سے جو باہر سے آکر اس میں آباد ہوتے تھے ردایں ایک نیا سیاسی معیار قائم ہو گیا۔

روما میں حکومت شہنشاہی کے اثرات

اس بات کے ثبوت کے لیے کافی شہادت موجود ہے کہ رومی امن حاصل ہونے سے صوبہ جات کو بہت فائدے حاصل ہوئے۔ انتظام حکومت کے لیے ملک کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پہلے دشمنانہ مہمات کی جاتی تھیں۔ ان کے بجائے یہاں محصول لگانے کا طریقہ جاری ہوا۔

ہر ایک صوبہ میں وہاں عدل و انصاف کے لیے ملازم مقرر کیے گئے۔ جہاں مقامی دساتیر کا احترام ہوتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ قانونی اصولاں جن معنوں میں روم والے ان کو سمجھتے تھے ہر شخص کے لیے یکساں ہوتے تھے یہ حالت تمام صوبہ جات میں ایک ہی تھی حالانکہ آگسٹس کے بعد ان صوبوں کا انتظام براہ راست شہنشاہ کے ہاتھ میں آ گیا تھا جبکہ دوسرے صوبوں کا انتظام اس وقت تک سناٹ ہی کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ سیش کی تصنیف ایگر کیولائیں اس تبدیلی کا ذکر آیا ہے جو تنظیم روم کے ماتحت واقع ہوئی مگر وہ اس قدر صاف

نہیں ہے جس قدر مذکورہ بالا سطور میں واضح ہے اس میں بیان کیا گیا ہے۔
 چونکہ منتشر غیر ہندب اور جنگجو آدمی عیش و عشرت کے ذریعہ سے
 امن پسندی اور ندامت کی عادی بنائے جاتے ہیں۔ اگر کیولانے اس راہ کو
 عبادت نگاہیں۔ چوک اور مکانات بنانے پر مائل کیا اور جماعتوں کو اس کام میں
 مدد دی۔ ہستند آدمیوں کی تو تعریف کرتا اور کاہلوں کو سزا دیتا تھا۔
 جب وہ تھوڑے کے بجائے لوگوں میں حصول امتیاز، فوقیت کے لیے مقابلہ
 ہونے لگا۔ اعلیٰ جماعتوں کے بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی اور وہ کمال والوں کی جنگجو
 کے مقابلہ پر ماضی عقل کی زیادہ قدر کرتا تھا۔ پہلے پہل انہوں نے رومن زبان میں
 قبول نہیں کیا لیکن اب وہ فی الواقع اس میں کمال حاصل کرنے کے لیے کوشش
 کرنے لگے تھے۔

امن پرست ٹیسی ٹس اس عیش پسندی کو ناپسند کرتا ہے جو تہذیب کے
 ساتھ ہمیشہ چلتی رہتی ہے لیکن اس کے ہرشت الفاظ سے بھی ہم کو ان فوائد
 کا پتہ چلتا ہے جو تنظیم روم سے پہنچے تھے۔ وہ رقمطراز ہے کہ لوگ آہستہ آہستہ
 بدی کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔ دارمیاں، حمام اور پُر لطف دعوتیں یہ چیز
 مرغوب طبع ہو گئی تھیں۔ ان باتوں کو لاعلمی کے باعث وہ تہذیب میں شمار
 کرتے تھے لیکن یہ ال کی غلامی کا صرف ایک پہلو تھا۔

اسی طرح تاریخوں میں بھی یہ ذکر درج ہے کہ روم والوں محکموں کو
 عشرت پسند بنا کر ان کی گردن میں طوقِ غلامی ڈال دیا۔ لیکن ہمیں صاف طور پر
 وہ واقعات نظر آ سکتے ہیں جن پر ٹیسی ٹس کا یہ اخلاقی فیصلہ مبنی ہے۔ اس کے

زمانہ میں۔ روم کے اندر ذلیل حدیث پسندی موجود تھی۔ حالانکہ جہو اور مخالفت کرنے والوں نے اس کے متعلق بہت کچھ مبالغہ آمیزی کی۔ مگر اس واقعہ کو تسلیم کرنے پر بھی وہ عظیم فوائد ہمارے ذہن نشین ہو سکتے ہیں جو برطانیہ کے وحشی باشندوں کو اہل روم کے سب سے پہونچے تھے۔ مثال کے طور پر مستقل بوداؤں اور تہذیب کے اُن ذرائع ہی کوٹے لیجے جو حال میں دریافت ہوئے ہیں۔ اہل روم ان چیزوں کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ تنظیم روم سے جو نتائج برآمد ہوئے تھے ان میں سے تمام اقوام میں باہمی قوت کے حقیقی احساس کو کسی طرح اہمیت نہیں حاصل رہے جو روم زمانہ حکومت میں قوموں میں پیدا ہو گیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ، واقعتاً وہ فرقہ جو تمام دنیاوی اثرات سے بے نیاز تھا، کے وسیع الجہالی کا اصول روم سے نہیں بلکہ یونان کے فلسفے سے لیا گیا ہے لیکن اگر روم دابول نے مختلف اقوام کے درمیان اپنے باہمی اغراض و مقاصد کا احساس پیدا کر دیا ہوتا تو رواقیتوں کے طرز عمل کی وقعت شاید حصول فلسفے کے ایک ہنگامی اور بے سود ارمان سے کسی طرح زیادہ نہ ہوتی۔

سینیکا کا قول ہے کہ وطن ایک نہایت مقدس مقام ہے۔ اور یہ قول روماء ہی کے لیے تھا۔ مارکس آرلیس ایٹوینیس کا قول بھی اس پر عائد ہوتا ہے کہ شاعر اس کو گیکر اس کا پیارا شہر لکھنا ہے اور آپ کیا اس کو زیوس کا پیارا شہر کہے گا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ روم ایک طرف وحشی گال قوم اور دوسری طرف مہذب ملک یونان پر حکومت کرتا تھا۔ مگر اس نے یونانی فلسفہ کے قواعد کی

اشاعت کی اور جدید مسائل میں استعمال کر کے خود اس فلسفہ کو ترقی دی۔ یونان کا ہر ایک شہر اپنے مہسایوں کے خلاف جنگ کرنے کی گھات میں لگا رہتا تھا۔ مگر روم نے اس عادت کے خلاف مقابلہ کر کے یونان کو تباہی سے بچا لیا۔

حکومت کی معاشی جامعوں کے درمیان جو تعلقات قائم تھے۔ ان کے لحاظ سے روم کا معیار نظام بتلانے کے لیے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ روم نے مختلف قومی گروہوں میں اپنے قانون کی توسیع ہی نہیں کی۔ بلکہ اس میں جداگانہ تمدنی جامعوں کے سیاسی حقوق بھی مقرر کیے جاتے تھے۔ روم کی تمام ابتدائی تاریخ میں اعلیٰ جامعوں اور عام لوگوں کی باہمی دشمنی اور اس کے آخر میں ان کے بعد حقوق کے مقرر ہونے کا ذکر درج ہے اور لفظ نظام خود ہی اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ اچھی رومن زبان میں اعلیٰ جامعوں کو ”آرڈائن“ کہتے تھے لفظ آرڈر ہر ایک معاشی جماعت کے لیے جس کے اغراض یکساں تھے استعمال کیا گیا ہے اور لفظ آرڈر (تنظیم) تو اسی رومن زبان کا ہے اور اہل روم کی ترقی اور عروج کی ایک یادگار کے طور پر بحجۂ قائم ہے۔

رومان صبیح کی علم و ادب میں جھلک

رومن معیار کے متعلق اہل روم کے خیالات کے لیے اسناد کا حوالہ دینا بڑا مشکل کام ہے کیونکہ روم کی شاعری اور سیاسی فلسفے دونوں چیزوں پر بہت گہرا یونانی رنگ چڑھا ہوا ہے اور اس کے علاوہ جس تحریک سے

سلطنت روم قائم ہوئی۔ اس کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ ہے کہ وہ دانتوں
طور پر رومنا نہیں ہوئی۔

اتھنز نے حصول آزادی کے لیے جدوجہد کی اور وہ سردوں کو آزادی سے
محرور رکھا۔ ان دونوں باتوں میں یونان والوں کی تکمیل کھلی ہوئی تھیں انہوں
نے نیکی اور بڑی یکساں پیش بینی کے ساتھ کی۔ حالانکہ کسی قوم کی نسبت یہ نہیں
کہا جاسکتا کہ اُس کو اُن باتوں کا پہلے سے علم ہوتا ہے جو اُس کی اول اول
کارروائی اختیار کرنے سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے
کہ روم نے اپنی کارروائیوں کا کوئی خاکہ نہیں تیار کیا تھا۔ اس نے کبھی ایک
طرف پیش قدمی کی تو کبھی دوسری طرف۔ اور سپر صدیوں میں تمام دنیا پر
جن کا اس کو اس وقت تک علم تھا اس کا علم اقتدار نہراٹے لگا۔

اُس زمانے میں روم دنیا کے اندر جو کچھ کارنایاں کرنا چاہتا تھا اس کی
شہادت درج کے الفاظ سے ملتی ہے۔

ہورس نے اپنی شاندار کتاب میں یہ درج کر کے کہ آفتاب کو اس کے
تمام دور میں روم سے زیادہ کوئی عظیم الشان سلطنت نظر نہیں آتی۔ کیونکہ مہذب
دنیا کا روم ہی پر خاتمہ ہے محض اس وقت کے ایک سیاسی واقعے کا اظہار
کیا ہے۔

سروئے نہایت فصیح و بلیغ مگر دراصل سچے نعروں میں اقتدار روم
کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام شہروں سے روم کو اور روم سے
تمام بیرونی دنیا میں لوگ آزادی سے آجاسکتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

کہ کسی اجنبی کا ہم سے جتنا قریبی تعلق ہوتا تھا اسی قدر زیادہ اس کو سیاسی دینیز
 دیکھ سہولتیں دستیاب ہوتی تھیں۔ اُس نے غیر ملک والوں کے ساتھ اہل روم اور
 اہل یونان دونوں کے برتاؤ کا موازنہ کیا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ روم نے تہذیب
 محض اپنی ہی ذات کے لیے نہیں حاصل کی۔ بلکہ ہر جگہ قانون اور نظام قائم کیے
 دوسروں کو بھی اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا لیکن سیاسی وابہ اندازوں
 کے بیانات کے بمقابلہ ہم روم کے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی پر یہ نظر
 ڈالنے سے رومن اسپرٹ کا پتہ لگا سکتے ہیں۔

کسی انسان کے خصائل و عادات کا پتہ یہ دریافت کرنے سے چل سکتا
 ہے کہ اس کو کون کون چیز اچھی معلوم ہوتی ہے اور کسی قوم کا معیار عام طور پر
 اُس کے بڑے بڑے آدمیوں میں مضمر ہوتا ہے۔ لیکن روم کے اکابر میں نہ تو
 فلسفی پائے جاسکیں گے اور نہ صنایع یا شاخ۔ روم کی بزرگ ہستیوں میں وہاں
 کے سپہ سالار اور ناظم ہیں۔ جن میں پلیس ڈلیس مس۔ ریگولس اور خاندان ٹارکون
 اور قیصر کا دوست بروٹس بہت مشہور ہو گئے ہیں۔ ان کے متعلق ہمارا یہ خیال ہے
 کہ ان کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اُن باتوں میں جو حکومت کے حق
 میں مفید سمجھی جاتی ہیں نہایت سچائی کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ بلکہ اُن کے
 حصول میں اپنی جان و مال تک کو بھی تصدق کر دیتے تھے ان کی نسبت یہ
 کہا جاتا ہے کہ روماء جو عروج اور کمال حاصل کرنا چاہتا تھا اس کو برقرار رکھنے
 کے لیے انہوں نے جدوجہد کی حتیٰ کہ اس فرض کی ادائیگی میں اپنی جان تک بھی
 نذر کر دی۔ اور واقعی یہ خیال درست بھی ہے۔ ان لوگوں کے متعلق جو روایات

زبان زد عام ہیں وہ تاریخی لحاظ سے سچ ہوں یا نہ ہوں لیکن ان سے صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ باشندگان روم کے دل میں اپنے شہر کی کسی قدر محبت تھی اور وہ کس طرح ہر وقت اُس پر جان تک دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔

ہوریس میں روم کے بڑے اشخاص کی جو فہرست درج ہے اُس سے بخوبی واضح ہے کہ روم وائے کن باتوں کو قابلِ تقلید سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں اکثر دوسری قوموں کو روئے زوال دیکھنا پڑا اور اس زوال کے متعلق جو شکایت کجالاتی ہے اُس سے بھی روم کے معیار کا سراغ ملتا ہے۔

ہیں ایک مادی صورت میں نظام کا معیار قائم کرتا ہے اس لیے ان اقدار اور خیالات کے اعادہ کی ضرورت ہے۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں۔ ایتھنز کی آزادی میں عجیب و غریب دسفیہ تھا کہ وہاں ایک نتیجہ خیز استعمالِ عمل میں آتا تھا اسی طرح ہم کو نظامِ روم میں بھی ایک صفت نظر آتی ہے جس نے اس کو اس نظام سے جداگانہ بنا دیا تھا جو شام ایسی سلطنتوں نے قائم کیا تھا اور یہ خصوصیت اس بات سے ظاہر ہوئی ہے کہ روم میں جو نظام رائج تھا وہ ایک ایسے اصول پر مبنی تھا جس کا فائدہ محسوس کرنے کے لیے محکوم اقوام کو بھی موقع دیا جاتا تھا حالانکہ روم والوں نے خود کو ایک نظام کے اندر رکھنے کا طریقہ سیکھا۔ اس کے قبل تمام سلطنتوں میں نظام اُن لوگوں پر بالائی طور پر عائد کیا گیا تھا جن کو یہ سمجھنے کا کبھی موقع نہ حاصل تھا کہ اُس قائم شدہ نظام سے ان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے یہ فرق ایسے دو کاموں کے درمیان جن میں سے ایک تو اُس سے ذاتی فائدہ سمجھ کر کیا جاتا ہے اور دوسرا ایسی جماعت سے دباؤ ڈال کر کرایا جاتا ہے جو

اس کے لیے رضامند نہیں ہوتی۔ یا یہ فرق ویسا ہے جیسا ان دو باتوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جن میں ایک تو باقاعدہ اصول پر مبنی ہوتی ہے اور دوسری محض اتفاقیہ رائج ہو جاتی ہے مگر روم کی اس صفت کی جہاں تک تعریف کی جائے کم ہے کیونکہ اس کے سبب سے اس کا سیاسی نصب العین اس کے زوال کے بعد بھی قائم رہ سکا تھا۔ یہ کہا جا چکا ہے کہ جن جن اقوام پر روم کی حکومت تھی ان میں سے کسی میں بھی مہذب زندگی کا معیار کامل طور پر فضا نہیں ہوا۔ دور دراز برطانیہ میں بھی روم کے اصول نظام کے ماتحت مقامی حکومت کا وجود ہوا اس سے صاف ظاہر ہے کہ روم کی ایسی عایا کو اس بات کا احساس تھا کہ رومن طریقہ حکومت کے نیست و نابود ہو جاتے سے ان کا کچھ نہ کچھ نقص ضرور ہوا۔

صوبہ جاتی اور شہری انتظام حکومت نے رومن امن و امان کو بذریعہ شمشیر ممتاز بنادیا تھا اور اس واقعہ سے بھی کہ روم کی تمام فوج کا قیام سرحد پر تھا اور خود سلطنت میں بھی فوج نہ رہتی تھی۔ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ حکومت خود اختیار کا خیال نظام روم میں مضمر تھا۔

نظام روم پر نکتہ چینی

لیکن نظام اگر آزادی کا خون کر کے قائم کیا گیا ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ اس کی قیمت نہایت گراں تھی۔ یہ ممکن ہے کہ حقیقی آزادی اور حقیقی نظام

یہ دونوں ایک ہی چیز ہوں لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایک امر باطل سے حقیقت کا انہار کیسے کیا جاسکتا ہے؟ بظاہر روم نے یورپ کو نعمت نظام سے مالا مال کر کے اس کی تمام زندگی کی اصلی طاقت چھین لی تھی۔ جب اُن اعضا میں سے خون نکال لیا گیا جن میں ذاتی نمود کی طاقت نہیں تھی۔ جسم خود فنا ہو گیا یا یوں کہا جائے کہ کل جسم کی روح ہی نکل گئی۔

روم کی تباہی اسی وجہ سے ہوئی کہ اس کو خود اپنا معیار کبھی نہ حاصل ہو سکا کیونکہ جو چیز ترتیب سے رکھی ہوتی ہے اس کی قدرتی ترقی کو محدود کر دینے کا نام نظام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو زندگی نہیں بلکہ صرف موت ہی ایک باقاعدہ تنظیم شدہ شے ہوتی جو کوئی نظام سختی پر مبنی ہو گا وہ درحقیقت خود سرانہ حکومت ہے، جیسا کہ ایک زیادہ باریک بین رومن نکتہ چیں نے لکھا ہے ”وہ بربادی کا نظارہ پیش کر دیتے ہیں اور اس حالت کو امن سے موسوم کرتے ہیں“۔ سکتے جتنے صوبے تھے وہاں سے ایسے شہر کو ہر ایک پتیز بہم پہنچائی جا

تھی جس سے اس کے معاوضہ میں ان کو کچھ ملتا تھا کیونکہ محصلوں سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ رومن حکام کو حکومت کے معیار کے تحت صرف اپنی جیب بھرنے کی فکر رہتی تھی۔ اس طرح سے نظام نے استبدادیت کی صورت اختیار کر لی۔ پائدار تہذیب کی آڑ میں ہر قسم کا قدرتی غور و صعود روک دیا گیا۔ کیونکہ جس طرح نقص پیدا ہو جانے سے آزادی آخر میں بے فضاہی میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح نظام میں بھی جب خرابی واقع ہو جاتی ہے تو مطلوبہ حالت کا قیام قدرت کے منشاء کے خلاف ہو جاتا ہے حکومت کا

قدرتی احکام یا استمرارِ روم والوں کو ایک قسم کی پابندی معلوم ہونے لگا۔ جس کا ثبوت ہم کو اہل ایتھنز کی آئینی باتوں کے ہمیشہ سرمدیگی اور روم کے اخلاق پسندوں کی زبانی وہاں کے زمانہ قدیم کی مدح سرائی کا مقابلہ کرنے سے مل سکتا ہے۔ روم میں لفظ انقلاب کا استعمال ہمیشہ اسی وقت ہوا کرتا تھا جب لوگ نئی نئی باتوں کے خواہشمند ہوتے تھے۔ ٹیسی طس نے کہا ہے "غیر مضبوط شدہ محاسن نئے نئے مناسب شمار کیے جاتے تھے" اس کے اس فقرے سے پتہ چلتا ہے کہ روم اور دیگر شہروں میں بھی ترش خیالات کی وجہ سے کس طرح اخلاق و تمدن کا خون ہوا ہے۔

لیکن جس نظام سے جہالت اور اسی کے سلسلے میں نمود کی قربانی ہو جاتی ہے وہ خود بخود تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ روم خود اپنے قائم کیے ہوئے نظام حکومت کو برقرار نہ رکھ سکا جو لوگ اس کی خاک سے پیدا ہوئے تھے وہی اس کے خلاف ہو گئے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ روم کے باہر شہنشاہیت قائم ہو سکتی تھی تو سلطنت کا سارا راز فاش ہو گیا۔ مانی بیرس کے انتقال کے بعد شاید ہی چند سال ایسے گزرے ہونگے جب ان لوگوں کے درمیان ذاتی منفعت کے لیے آئے دن خانہ جنگی نہ ہوئی ہو جو اس وقت برسرِ اقتدار تھے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ صوبہ جات کی ترقی ایک عرصہ دراز تک جاری رہی حالانکہ دوسری طرف خود روم میں بد نظمی کا دور دورہ تھا۔ لوگوں کی خود غرضی اس کا دامن ہستی چاک چاک کر رہی تھی اس میں شک نہیں کہ رومی نظام کی بنیاد خوب سمجھ بوجھ کر رکھی گئی ہوگی جس میں یہ ان نتائج کے

خلاف اپنی ہستی قائم رکھ سکے جو اپنی تباہی کے پیشتر کئی سال تک اس کے سامنے پیش آتے رہے۔

لیکن رفتہ رفتہ صوبہ جات میں بھی مفاد عامہ کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ جن وحشیوں کو خود روم نے تربیت دیکر مہذب اور طاقتور بنایا تھا۔ خود وہی اس پہلے مالک کی طاقت اور اقتدار سے نفرت کرنے اور اس کی دولت کی ناک میں لگے رہنے لگے اور رومن سلطنت چہرا نہیں اجزا میں منتشر ہو گئی جن سے مل کر وہ بنی تھی۔ یہ ہیں وہ داغرات جن سے معلوم ہوا کہ جس میار کے مطابق روم میں نیم باختری کے ساتھ عمل درآمد کیا گیا اس کی تباہی کس طرح واقع ہوئی۔ اور اپنے میار کے حصول میں ناکام رہنے سے اس کی ہستی بحیثیت ایک سیاسی طاقت کے کس طرح کا عدم ہو گئی۔ جس طرح آزادی کے ناجائز استعمال سے ایجنٹز میں لوگ بالکل بے ضابطہ ہو گئے تھے جو کچھ دل میں آتا تھا کرتے تھے۔ کسی کو کسی کا خوف نہ کسی پر کسی کا دباؤ تھا۔ اسی طرح نظام نے سلطنت روم میں خود سرانہ حکومت کی صورت اختیار کر لی اور بادو جو دیکر رومن اس سے مستند فوائد حاصل ہوتے تھے۔ ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑ گیا کہ اس میں اس قدر زیادہ تباہیاں پیدا ہو گئی تھیں کہ لوگ زیادہ عرصے تک انہیں برداشت نہ کر سکتے تھے۔ روم میں اندرونی بد امنی تھی اور ذاتی بغض و عناد زور پکڑ گیا تھا۔ انہیں باتوں سے وحشیوں کے حملوں کے بغیر سلطنت روم تباہ و برباد ہو گئی ہوگی فی الواقع ہم یہ لکھ سکتے ہیں کہ وحشی قوموں نے محض اس بات کو ظاہر کر دیا جو پانچمیل کو پہنچ چکی تھی یعنی یہ کہ روم کا نظام نیست و نابود ہو گیا تھا۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سلطنت روم کی اخلاقی تباہی کے منطوق جو باتیں پرانے زمانے میں لکھی جاتی رہی ہیں ہم نے ان کو تسلیم نہیں کیا ہے ہم یہ نہیں مان سکتے کہ جن وحشیوں نے ہمارے دور کی پانچویں صدی میں مقدونہ باربوش کی مٹی۔ وہ روم کے مہذب باشندوں کے بمقابلہ زیادہ بااخلاق یا صحیح النسب تھے۔ جس زمانے میں وحشیوں کے اخلاق خالص کی فتح ہوئی اس وقت جو کچھ تھوڑی سی اشاعت اخلاق ہوئی ہے وہ ابتدائی زمانہ کے عیسائی بزرگوں کے سبب سے ہوئی ہے جن کا ذہن اس قدر رسا نہ تھا کہ وہ اس وقت کی حالت بخوبی ذہن نشین کر سکتے۔ بد قسمتی سے اخلاقی حالت کا ازادہ کرنے والوں کا خیال یہ ہے کہ وحشیوں کے ہاتھوں سلطنت روم کی تباہی اس وجہ سے ہوئی کہ اس وقت یورپ میں حیوانی طاقت کی ضرورت تھی جس سے چھٹکا راپانے میں ہیں ہزار سال لگ گئے۔

یہ صحیح ہے کہ نظام روم سے مقامی ترقی کی طاقت ضائع ہو گئی تھی اور صوبوں کو اس طریقہ حکومت کے قیام و قرار میں بظاہر ذرا بھی دلچسپی نہ تھی لیکن جو کچھ واقعات آخر میں ظہور پذیر ہوئے ہیں ان کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حکمران فرقہ کی مطلق العنانی بھی پسندیدگی کے قابل نہ تھی، جب روم کی سلطنت کا وجود خواب و خیال ہو گیا یورپ میں چار طرف طوائف کا زور بڑھا۔ عہد ماضیہ کے تمام سیاسی معیارات فراموش ہو گئے جن کا احیا رفتہ رفتہ صرف اس وقت ہوا جب روم کی اسپرٹ پھر غالب آ گئی اور اپنے تباہ کرنے والوں کو تعلیم دینے لگی کیونکہ جس زمانے میں شہر روم برباد ہو چکا تھا اور

باشندوں میں تہذیب کا نام و نشان نہ رہا تھا۔ اس زمانے میں بھی لفظ روم میں ایک طاقت موجود تھی جس عہد میں قسطنطینیہ ہی تک حدود رہ گئے تھے اس دور میں بھی روم کا نام سُن کر وحشیوں کے دل دہل جاتے تھے۔ کیونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اتھانزک کہا کرتا تھا کہ شہنشاہ اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خدا دنیا میں ظہور پذیر ہوا ہے۔

فرمان کا بیان ہے کہ روم کے زمانہ زوال میں (یعنی جس زمانہ میں حقیقت اس کو عظیم الشان فتوحات نصیب ہوئیں) ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ روم کی طاقت اہلی مغربوں میں کس قدر زبردست اور مستقل و دیرپا تھی۔ یہ قوت اس قدر زبردست تھی کہ جن وحشیوں نے اس کو فتح کیا تھا وہی اس کی شاہی پوشاک کے ٹکڑیوں سے اپنی زیبائش کرنے میں بڑی عزت اور شان و شوکت سمجھتے تھے اس کے علاوہ روم کی تاریخ تمام یورپی دنیا کی تاریخ ہے۔ قدیم یورپ کی تمام حکومتیں روم ہی میں آکر شامل ہو گئی تھیں اور یورپ مابعد کی تمام حکومتوں کا وجود بھی روم ہی سے ہوا۔

قیصر اور سلطنت ان رومانی الفاظ سے ابھی تک سیاسی خیالات کی رہنمائی ہوتی ہے حالانکہ روم اس وقت محض سلطنت اطالیہ کا دار الحکومت ہے لیکن مغربی دنیا کی نگاہ میں اس کی رفعت اس سے کہیں زیادہ ہے۔

چوتھا باب

مساوات عالمگیر

(*)

عالمگیر معیار

آج کل بالعموم یہ خیال ہو گیا ہے کہ نسل یا تمدن فی حیثیت کے جملہ امتیازات اس وقت قائم نہیں رہتے جب تمام دنیا کی انسانی آبادی کو ایک ہی نظر سے دیکھا جاتا ہے ایک انسان اور اس کے دیگر بھینسوں کے درمیان کچھ فرق ضرور واقع ہے مگر انسان اور چوپایہ میں اس سے بھی زیادہ فرق ہے اور کم از کم ہر ایک قوم کی مہذب جماعت اس خیال سے سیاسی طور پر ضرور مساوی تصور کی جاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک قوم میں یکساں جذبات اور احساسات پائے جاتے ہیں۔ لیکن ایسی حالت ہمیشہ نہ تھی اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ فلسفیوں کا بھی وہی خیال تھا جو عوام کی تنگدلی کے

سب سے اندوں رائج تھا کہ ایک غلام جاؤ رہی نہیں بلکہ ایک اور ہے اسکے درمیان جو باہمی تفریق واقع ہے اس سے بھی زیادہ فرق آقا اور غلام کے درمیان ہوتا ہے وہ زمانہ بھی زمانہ قدیم نہیں ہے جب مقول پسند تھاں کا یہ خیال تھا کہ جس قوم میں ان کی پیدائش ہوتی ہے وہی صرف انسان کہلانے کی حقدار ہے اور باقی تمام انواع و اقسام انسانیت سے خارج ہیں اور اس خیال کو آج کل کے نامسمجھ اشخاص بھی اکثر مسلمہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ دنیا کی تمام انسانی آبادی کو علی طور پر یکساں تصور کرنا بھی ایک میاں رہی ہے لیکن اس زمانے میں بھی اس پر عملدرآمد مشکل ہو سکتا ہے بیشک ریاست ہائے متحدہ کے حبشیوں کا ہی سوال لے لیجئے جہاں نسلی امتیاز اور معاشرتی حیثیت دونوں مثال ہیں یا چین کے متعلق یورپی حکمت عملی کے انتظام کا مسئلہ لے لیجئے۔ باوجود کچھ آجکل کا اعلیٰ ترین معیار یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھا اور ان کے درمیان سلوک روا رکھا جائے مگر حبشیوں اور چین کے متعلق یورپی حکمت عملی کے انتظام کے مسئلے کا حل ابھی تک نہیں ہوا۔ اکثر اشخاص اور ان میں بھی کثرت مدبروں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ تمام دنیا کے انسانوں کو علی طور پر ایک سمجھ لینے سے نسل اور تمدنی حیثیت کے حقیقی امتیازات کو ضرب پہنچ جائیگی ابھی تک ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ سکتا ہے کہ ایک جزو میں یکسانیت کا اعتراف کرنے سے بجائے اس کے کہ دوسرے میں امتیازات کا عدم ہو جائے امتیازات کی حمایت ہوتی ہے ایک چینی اور ایک انگریز یا ایک آقا

اور ایک کاریگر کا درمیانی امتیاز اسی وقت اور بھی زیادہ دیکھا جاتا ہے جب ان کی باہمی مماثلت بخوبی ذہن نشین ہو جاتی ہے نہ کہ جب اس کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اگر کچھ نیکی فراموش کر دی جائیگی تو باہمی تفریق مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کی جائے گی اور اس طرح باطل ثابت ہو جائے گی۔ لیکن علی طور پر ہمارے تمام مدبران مختلف نسلوں اور حیثیتوں کے اختلاف کی بجائے حساب قند کرتے ہیں اور ان دونوں چیزوں میں سے کسی چیز کو بھی مساوات عالمی سے کمتر قرار نہیں دینا چاہتے۔ اصولاً اور احساساً یہ مانا جاتا ہے کہ تمام انسانی دنیا ایک ہے اور اس کے تمام افراد میں ایک چیز عام طور پر پائی جاتی ہے اگر اس بات پر سب متفق الرائے ہوں کہ یہ عام چیز یہ قرار رکھی جائے اور اس کو ترقی دی جائے تو زمانہ حال کا یہ معیار قائم ہو جاتا ہے کہ دنیا کے تمام انسان ایک ہیں۔ یہ معیار سیاسیات میں ایک قوت محرکہ کی شکل میں نہایت دھندلا نظر آتا ہے لیکن ایسی حالت میں بھی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیشتر زمانے کے مقابلے میں آج کل کچھ نہ کچھ ترقی ضرور ہوئی ہے۔ یہ بھی بہت ہے کیونکہ پہلے تو رواج ہی جداگانہ تھا اور فلسفہ بھی اس رواج کی تائید کرتا تھا اور اس رواج کے بالمقابل عالمی مساوات کا اصول یا جذبہ رائج ہو گیا ہے حالانکہ اس معیار پر عملد آید نہیں ہو رہا ہے پھر بھی اصولی حیثیت سے اس کا وجود تو ہے۔ اس لیے ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ حال میں اس خیال کے کیا معنی سمجھے جاتے ہیں کہ تمام نسلوں اور تمام حیثیتوں کے انسان کسی نہ کسی طور سے ہمپا یہ اور مساوی ضرور ہیں۔ سیاسیات حالیہ میں یہ معیار نہایت بجا و مدہ

اور غیر منظم طور پر کام کرتا ہے۔

نصب العین کی موجودہ صورت

موجودہ زمانے میں اس معیار سے اولاً یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ کوئی قوم بلحاظ فطرت و جبلت خود کو کسی دوسری قوم سے کسی طرح بھی فائق و افضل نہ قرار دے۔ دوش اس اصول کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی فراموش نہیں کر دی گئی ہے کہ دراصل بعض قومیں ایسی ہیں جنہوں نے مادہ صعود میں اب تک قدم نہیں رکھا ہے۔ مساوات عالمی کے مخالف اور متضاد دوسرا خیال یہ ہے کہ بعض قومیں ایسی ہوتی ہیں جن میں قدرتاً ترقی کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی اور اس نقص کا کوئی علاج بھی نہیں ہے اس لیے یہ کہنے سے اس معیار کی مخالفت نہیں ہوتی کہ فلاں قوم تہذیب یافتہ نہیں ہے بلکہ یہ کہنا یا اسی خیال کے مطابق عمل کرنا کہ فلاں قوم میں ترقی کرنے کی صلاحیت ہی نہیں معیار کے مخالف ہے۔ اگر ہمارے افعال اسے ثابت ہوتا ہو کہ ہر ایک قوم کا داخلہ مہذب زندگی کی روایات میں ہو سکتا ہے تو سمجھا چاہیے کہ ہم کو ایسا کرانے کی تحریک اسی معیار کی بدولت حاصل ہوئی ہے کیونکہ اس کا یہ منشا ہے کہ کوئی گروہ خواہ کیسا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو مگر اس میں اس قسم کا کوئی قدرتی یا لا علاج جزو نہیں ہوتا ہے جو اس کی آئندہ نسلوں کو کسی زمانے میں بھی تہذیب یافتہ بننے سے باز رکھ سکے

ثانیاً اس معیار سے آجکل کم از کم اصول غلامی کی تردید ہوتی ہے۔ اس وقت ہمیں غلامی کی رسم سے مطلب نہیں کیونکہ ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ اگر دنیا میں واقعی غلام کے نام سے کوئی شے ہوتی ہے تو اس چیز کا وجود ہونا ہی نہ چاہیے۔ کوئی شخص بھی غلام نہ ہو۔ اس معیار سے گویہ بات قائم ہوتی ہے کہ دنیا میں ہر ایک انسان واقعی انسان ہے چوپایا اور دار نہیں ہے اس طرح ہم سب کا یہی خیال ہے کہ معاشرتی امتیازات کے باوجود بھی دنیا میں تمام انسان ایک ہیں۔ گویا نسل اور رقبہ دونوں چیزیں ایک قسم کی رکاوٹ ہیں اور یہ معیار ان کے خلاف ہے مگر ایسا مخالف نہیں ہے کہ اس سے وہ دونوں چیزیں تباہ و برباد ہو جائیں۔ وہ معیار ان کا مخالف اس وجہ سے ہے کہ ان چیزوں کو جو مبالغہ آینہ اہمیت سیاسی زندگی میں دی جاتی ہے اس کی تصحیح ہو جائے۔ قدرتی طور پر یہ نصب العین انقلاب کی وجہ سے قائم ہوا ہے لیکن اس میں بعض ایسے اجزاء بھی شامل ہیں جو اسی قدیم زمانے کے ہیں نسل اور مرتبہ دونوں چیزوں میں اٹھارہویں صدی کے مغرب میں زیادہ طاقت موجود تھی۔ موجودہ معیار کے ان اجزاء کی تشریح کے لیے ہمیں اسی زمانہ پر نظر ڈالنا پڑیگی۔ جب یونان اور روم کی تہذیب کا زوال ہوا تھا۔

یہ معیار اس وقت قائم ہوا تھا جب حسب ذیل خسرا بیاں موجود تھیں۔

(۱) یونان اور روم کی فوقیت پسندی۔

(۲) غلامی کا عادیہ۔

جب لوگوں کو ان خرابیوں کا احساس ہوا۔ اور وہ ہم کی غمی طاقت اور عیسائی رد قبول کے اصول اخوت، انسانی میں کچھ خوبی پائی گئی اس وقت یہ معیار وجود میں کہا۔ لیکن وہ معیار بذات خود ایک ہی تھے اور ایک ہی معیار کے دو پہلو تھے۔ اسی زمانے میں اور انہیں وجوہات سے لوگوں نے قدیم قوموں کی علیحدگی کو پامال کیا اور غلامی سے جس قدر کثیر التعداد معائب نازل ہوئے ان کا علاج بھیجا۔ ساتھ ہی ساتھ ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ نسلی امتیاز ایک غلامی کی نصیبت تھی کیونکہ یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ یہ غلامی تمدن کی علیحدہ بود و باش کے سبب سے پیدا ہوئی تھی ہر حال بحث کرنے کے لیے بہتر ہوگا کہ ان دونوں اجزاء پر علیحدہ رد و نشی ڈالی جائے اس لیے پہلے نسلی تفوق کے مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔

میں قوم علیحدگی کا متضاد

دنیا میں لوگ زیادہ تر خود کو سب سے علیحدہ اور مختار بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور یہ عادت ہر ملک میں پائی جاتی ہے۔ یہودی قوم خود کو ایک برگزیدہ قوم قرار دیتی ہے اور اس کا دعوئے ہے کہ وہ مذہب اور دنیاویات کے معاملے میں تمام دیگر اقوام عالم سے ممتاز ہے۔

اہل یونان کو اپنی تہذیب پر نماز اور روم کو نیک صلت کی قدر دانی پر فخر تھا مگر یونان اور روم کے محرم نماز کے بھائی یہودیوں کے دعوئے میں

اس علحدگی کی خوشیادہ نمایاں ہے۔ یونان سے پیشتر جتنی سلطنتیں قائم تھیں ان میں سے قریب قریب سب کی بنیاد اس طر لقت پر مبنی تھی کہ وہ فاتح قوم ہونے کی وجہ سے محکوموں سے علحدہ رہنا پسند کرتی تھیں اور ان کا اس طرح الگ رہنا جس کو ان کے مذہبی جوش نے اور بھی ترقی دیدی تھی۔ ایک خاص رکاوٹ تھی جس کے خلاف تمام بڑے بڑے عالمگیر مذاہب کو جدوجہد کرنا پڑی۔ قریب قریب ہر ایک نسل نے اپنی ارتقا کے مدارج میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ اس میں منتخب قوم ہونے کے خاص علامات موجود تھے لیکن مسئلہ کے اس پہلو سے ابھی ہمیں تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ اولاً جب لوگ ترقی کے سیاسی منزل میں پہنچ جاتے ہیں تو مذہبی علحدگی کا اثر کم پڑتا ہے اور دوم قومی تفوق کے لحاظ سے جتنی تبدیلیاں یورپ کے سیاسی معیارات میں ہوئی ہیں وہ اس مخالفت کے سبب سے ہوئی ہیں جو یونان اور روم کے خیال فوقیت کے خلاف کی گئی تھی یہودی لوگ خود کو سب سے افضل سمجھ کر علحدہ رہتے تھے۔ اور کسی سے خلط ملط نہ ہوتے تھے اس کے خلاف عیسائی مذہب نمودار ہوا اور اس کی بدولت ہمارے دور کی اول صدیوں میں سیاسی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ یہ ایک واقعہ ہے جو آگے چلکر ملے گا۔ پہلے اس خرابی پر غور کرنا ضروری ہے جس کی وجہ سے روایت اور بعد کی سلطنت روم کی قانونی مسادات کا لہور ہوا۔

ایتھنز کی آزادی کے زمانہ میں بھی اس کے باشندے ہمیشہ سب سے الگ تھلک رہے۔ یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ عللاً یہ علحدگی برتی جاتی تھی مگر

مگر اصولاً بھی ایتھنز میں یونانیوں اور غیر یونانیوں میں ایک نہایت صاف
تفریق پیدا کر دی گئی تھی۔ وحشی لوگ فطرتاً ہی اس تہذیب کے ناقابل تھے
جو یونانیوں نے حاصل کی تھی۔ اس طرح نسلی امتیاز نے انسان کی فطرت کو بھی
مساویا۔

رومانی عالم پسندی

مہبرانِ وقت اسی زمانے میں اس اصول کو معرضِ عمل میں لائے جس
وقت سکندر کی فوجیں غیرِ دانستہ طور پر یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اس قسم کا اہم
امتیاز ہو نہیں سکتا۔ اس کے بعد ہی یہ کافی طور پر عیاں ہو گیا کہ جو اقوام منتشر
حالت میں تھیں ان میں سے اکثر اقوام ہیں ایتھنز کی تہذیب کو خود انہیں
جذب کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اسی بلے لفظ وحشی کا استعمال نسلی امتیاز
دکھانے کے لیے نہیں ہو سکتا۔

اسرارِ ایلو سیسینا میں روم والوں اور دوسری قوموں کو بھی شامل کیا گیا
اور ایتھنز کے خاص باشندے ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئے جہاں اسکندریہ
نے تمام اقوام کو فلسفہ اور شاعری کی قابلیت کے لحاظ سے مساوی اور ہم پایہ
ثابت کر دکھایا تھا۔ تہذیب کو جتنی جتنی توسیع نصیب ہوئی اس کی گہرائی کم
ہو گئی مگر اس حقیقت میں کچھ فرق واقع نہیں ہوا کہ جس بات نے پہلے صرف
یونانیوں کو ممتاز بنا دیا تھا۔ وہ ہر ایک قوم کے انسانوں کے لیے عام ہو گئی۔

روم نے اس عالم پسندی کی انتہا کر دی۔

روم میں بھی نسلی امتیاز کی قدیم رسم اور اصول دونوں چیزیں اس وقت پائی جاتی ہیں جب نظام روما کے اثر سے صوبوں اور روم کے درمیانی نسلی امتیازات کا عدم ہو رہے تھے۔ اس طرح روما کے باشندے خود کو غیر ملکوں کے بمقابلہ نسل اور خطنامہ زیادہ ممتاز سمجھتے تھے۔ لیکن جس زمانے میں عالم پسند سلطنت کا دور دورہ ہوا اور شہریت کا دعویٰ نہایت زور و طاقت کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھا وہ نسلی فرق جس کا باشندگان روم ادعویٰ کرتے تھے پہلے ہی مٹ چکا تھا۔

اُس زمانہ کے واقعات سے ہم کو معلوم ہوگا کہ روم میں قدیم نسلی امتیاز و تفریق کے بجائے مساوات کا جدید مسلک قائم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہاں غیر ملکی اہل دماغ کا داخلہ ہوا۔ جنہوں نے رومی علم و ادب کو ایک سیاسی جامہ پہنا دیا۔ اور اس خیال کو ترقی حاصل ہوئی کہ ہر شخص کو شہریت اور دور دراز صوبوں میں ہر شہر کو یکساں طور پر قوت و اقتدار کا حق حاصل ہے اور بالآخر ۱۲۳ء میں انیٹونی نس کے آئین سے حکومت خود اختیار کا نفاذ ہوا۔ اس کے بعد ہی نہایت اعلیٰ اور مفید عام قوانین وضع کئے گئے جنہوں نے بعد ازاں ترقی کر کے رومن علم اصول قوانین کی صورت اختیار لی ان تمام باتوں میں یہ احساس برابر نمایاں ہے کہ سب انسان ایک ہیں اور ان کے جذبات و حقوق کا یکساں احترام ہونا چاہیے۔

روانی اور عیسائی مذاہب کی مماثلت

اس معیار کی جھلک روائی فرقہ کے علم و ادب میں پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں پہلے لفظ (شہری) بہت رائج تھا مگر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ بعد ازاں اس کے بجائے لفظ ہم جنس کو بہت رواج دیا گیا ہے معاشرہ میں ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ باہمی تعلق رکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کے لیے یکساں تہنوں ہونا چاہیے۔ ہم سب لوگ ایک جماعت کے رکن ہیں۔ لیکن انسانوں کو اس بات پر شرم نہیں آتی کہ وہ ایک دوسرے کا خون بہا کر خوش ہوتے ہیں۔ آپس میں سنگھڑائی کا رزار برپا کرتے اور اپنے بعد ان لڑائیوں کو جاری رکھنے کا کام ہماری اولاد کے ہاتھ میں بھی چھوڑ جاتے ہیں جبکہ بے زبان چوپایے بھی اپنے ہمجنسوں کے ساتھ ان وادشتی سے رہتے ہیں انسان جو ایک انسان کے لیے نہایت تبرک شے ہے۔ نخل بیکاری میں تیرا جل کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کے کام آئے۔ ان کے علمیات میں اس قسم کے فقرات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالانکہ یہ اُس زمانے کے انسانوں کے لیے بہت کم موزوں تھے مگر کچھ نہ کچھ امید مسلک مماثلت کی اشاعت کے لیے ضرور تھی۔ جو باد جو دیکھ صدیوں سے

ہاکام ہوتی چلی آتی ہے ممکن ہے کہ ابھی عرصہ دراز تک رہے۔ بہر حال
یکسانیت کے باعث اس وقت بھی یہ خیال موجود تھا کہ ہر قوم کے انسانوں
کے درمیان عام افراط موجود ہیں۔

مذہب عیسائی کی ابتدائی کتابوں میں عالمگیر معیار کا ذکر متعدد بار
اس قدر درج کیا گیا ہے کہ یہاں اس کے متعلق غور کرنے کی ضرورت
ہی نہیں۔

یقیناً کہ تمام انسانوں میں رشتہ اخوت قائم ہے اور سنیٹ پال
کا یہ فقرہ کہ نہ کوئی یہودی ہے نہ یونانی "دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ
اس زمانہ میں محض یہودیوں کے علاوہ رہنے اور خود کو سب سے افضل
و فائق سمجھنے کے خلاف یہ آواز نہیں بلند کی گئی تھی بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ
ایسے نسلی امتیازات کا نازک ہو جائے جن سے اس امر کے تسلیم
کیے جانے میں رکاوٹ نہ واقع ہو سکے کہ تمام انسان ایک ہی ہیں۔
یہ ایک اخلاقی اور مذہبی تصور تھا مگر بظاہر اسی کے بدولت تمام اقوام
کے انسانوں کے مابین سیاسی تعلقات قائم ہوئے ہیں سنت اکثین
کے مواظبت میں ایک نہایت شاندار اصول یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے
اور اس پر حکومت خدا کرتا ہے اس نظریہ سے بھی مترشح ہوتا ہے
کہ مذہبی پیرایہ میں اسی عالیت کے میلان کی تلقین کی گئی ہے مجتہد
موصوف کا ارشاد ہے۔

وہ فردوسی مملکت جب صفحہ زمین پر سائل زیارت ہوتی ہے

تو تمام اقوام سے اپنے شہریوں کو بلا لیتی ہے اور اس کی زیادتی جماعت ہر ایک زبان کے بولنے والے انسانوں پر مسل ہوتی ہے کیونکہ اس کو آداب عامہ کی کثرت اور قانون یا حکومت کی پروا نہیں ہوتی جس سے دنیا میں امن قائم رکھا جاتا یا برقرار رکھا جاتا ہے ان میں سے کسی جیہ کا سد باب نہیں کیا جاتا نہ کوئی شے مٹائی جاتی ہے بلکہ ان کو قائم رکھ کر ان کی متابعت کرائی جاتی ہے کیونکہ مختلف اقوام کی کثرت ہے آخر کار صرف ایک نعمت دنیوی امن کی حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ یہ اس مذہب میں خلل انداز نہ ہو جس سے صرف خدمت و عبادت باری تعالیٰ کی تعلیم ملتی ہے۔

سنت اگسٹین کے تفسیلات میں بار بار یہ ذکر کیا گیا ہے کہ انسان خدا کا عکس ہے اس لیے تمام انسانوں میں ایک ذات کام کر رہی ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ اُس زمانہ میں نسلی امتیاز کم از کم مذہبی نقطہ خیال سے کس قدر پاش پاش ہو گیا تھا۔ غیر ملک کے باشندوں کے ساتھ سیاسی تعلقات پر جو اثر پڑا وہ قدرتی اور ناگزیر تھا۔ کوئی شخص بھی اس حالت میں غیر ملک والوں سے کسی طرح بھی فضل نہیں ہو سکتا تھا جب اس قسم کے امتیازات ہی دنیا سے نابود ہو گئے تھے کہ خدا سے برتر اور کسی قوم کے خاص انحصار کے مابین تو ایک رشتہ امتیازی ہے اور باقی اقوام اُس رشتہ سے محروم ہیں۔

ص
معیار کی حیثیت سے یہ تصور ہمیشہ محدود رہا کیونکہ اس کا اطلاق خاص خاص اقوام کے گردہ پر ہوا عام انسانی خلقت کے لیے اس پر عملد رآمد نہیں کیا گیا

جس زمانہ میں وحشیوں کے حملے ختم ہو چکے تھے اس وقت یورپ میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جو یونانیوں اور روم والوں کے مانند خود کو دوسری قوم سے کسی طرح بھی اصولاً یا عملاً فائق و برتر سمجھتی۔ لیکن ہے کہ مختلف اقوام کے افراد میں غیر ملک والوں سے ابتدا کی طرح اس وقت بھی نفرت رہی ہو۔ لیکن جن قوموں کا بھی یورپی جماعت سے تعلق تھا ان کے ساتھ یکساں طور پر برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اس طرح مبارزوں اور کمینچلاک یا دیوبوں کے ارشادات و نیز علما کی وسیع انجالی سے قرون وسطیٰ میں مشرب عالمیت کا دور دورہ رہا۔ لیکن یہ مسلک مساوات ہمپاگی کا اصول یورپ کی حدود سے باہر نہ گیا حتیٰ کہ یہودی بھی غیر ملک والے سمجھے جاتے تھے باوجودیکہ ان کا تعلق یورپی جماعت سے زیادہ قریبی تھا اور معیار کی یہ حد ہندی مشرق و مغرب کے باہمی سیاسی تقابل میں ابھی تک کام کر رہی ہے۔ گو کہ مذہب کے معاملے میں یہ قیید اب کم نظر آتی ہے۔

غلامی کا انسداد

اس کے بعد سیاسی زندگی کے دوسری منزل میں پہنچنے کے قبل غلامی کے نظریہ اور رسم پر نکتہ چینی کی ضرورت تھی۔ اتیختن کی آزادی اور روما کا نظام دونوں چیزوں کا دار و مدار غلامی پر تھا اور بعض معیار پسندوں نے غلامی کو مد نظر رکھے بغیر حکومت کا مدعا سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر کثیر المتعداد

اشخاص نے اس کو ناگزیر تسلیم کر لیا تھا۔ اور اہل خیال با فراغت زندگی حاصل کرنے کا اسی کو ایک واحد وسیع سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ارسطو نے غلامی کی نسبت کہا تھا کہ اس کا وجود دنیا میں انسانوں کے مابین دنیاوی فرق کے سبب سے ہے۔ کیونکہ بعض انسان سرشت سے ہی افضل ہیں قبل اس کے کہ یونانیوں اور روم والوں کی تنگ فرقہ بندی محسوس ہو جائے اور ہر ایک ذی ہوش اور بالغ انسان کو سیاسی زندگی کا حق حاصل ہو سکے اس نقطہ خیال کی پامالی ضرور تھی۔

ارسطو اور سینٹ آگسٹین کے عہدوں کے درمیان جس قدر عرصہ گزرا ہے اول الذکر کا نظریہ اسی زمانے میں صفحہ ہستی سے مٹ گیا اور حالانکہ قطعی سیاسی ترقی کے لیے عملاً بہت کم کام کیا گیا اخلاقی اور مذہبی انقلاب سے یہ احساس غلامی ایک ادارہ کی حیثیت سے ایک ناگوار شے تھی اور بھی زبردست ہو گیا۔

معیار فطرت انسانی کسی نظریہ کے سبب رد نہ ہوتا ہے بلکہ خاص خاص خرابیوں کے احساس سے پیدا ہوا ہے۔ اس ننانے میں غلامی کے نقائص آجکل کی طرح تسلیم نہیں کیے جاتے تھے غلامی کے اندلو سے جو فائدہ حاصل ہوتا نہ وہی کسی طرح اس قدر صاف تھا جیسا کہ اسے ہم آجکل تصور کرتے ہیں۔ ابتدا میں معیار مبہم اور فشر ہوتا ہے کیونکہ جس ضرورت کے باعث اس کا وجود ہوا ہے خود وہی غیر یقینی ہوتی ہے۔ غلام اور آزاد دونوں ہی کو اس صورت حالت سے تکلیف

محسوس ہوتی تھی لیکن ان میں سے کسی کو بھی غلامی کا کوئی قطعی نعم البدل نہ معلوم تھا اور آخر میں اس قدیم رواج کو بھی محض حلوں جدیدہ معاشرہ اور نئے عقائد کی وجہ سے زوال نصیب ہوا اس کا انداد یک نعت نہیں کر دیا گیا۔ بہر حال پہلے ہم ایک غلام اور اس کے بعد آقاؤں کے نقطہ خیال کے لحاظ سے اجمال کے ساتھ اصلی دقت ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے۔

ایک غلام کے نقطہ نظر سے قطعی طور پر یہ دیکھنا بہت مشکل ہے کہ اس کو کن کن باتوں کی سکنایت تھی کیونکہ درحقیقت غلاموں نے اپنے خیالات کا اظہار کتابوں کے ذریعہ سے نہیں کیا ہے اور بہت سی باتوں کو جن کا نام سنکر ہم پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ محکوم اپنی زندگی کا ایک جزو لا ینفک تسلیم کرتے تھے۔ انسان کے لیے کسی کی اطاعت قبول کر لینا بہت آسان کام ہے حالانکہ جتنی تاریخ دستیاب ہوتی ہے وہ محض بے اطمینانی کے سبب سے تیار ہوتی ہے انسانوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ کہنے میں آکر جلد معاملات کو اپنی اصلی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں اگر کھیت ہو گوار ہو تو گائے اس کے خلاف سر نہیں اٹھاتی۔ آدم زاد کے ساتھ چوپاؤں کا ایسا سلوک کرنے سے اس کو ایسی قناعت حاصل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جس سے ایک چوپایہ اور ایک انسان کے مابین امتیاز کیا جاتا ہے۔

بیرحمی سے شدت کے ساتھ عام طور پر کام نہیں لیا جاتا تھا۔ لیکن اس قسم کے جبر سے جو اندیشہ برآمد ہوا تھا اس سے بدامنی کو ترقی ہوتی تھی۔ جو لوگ نیک طینت آقاؤں کے حلقہ بگوش ہوتے تھے ان کو بھی ہمیشہ قید خانوں۔ کانوں اور متھکڑی بیڑی کا کھٹکا لگا رہتا تھا چونکہ غلاموں کو افزائش نسل کے لیے کام میں لایا جاتا تھا۔ اس وجہ سے قدرتی محبت کو خواہ مخواہ نقصان پہنچنا لازمی تھا۔ خون کے رشتے کا ذرا بھی خیال نہ کیا جاتا تھا۔

کام سے کام کرنے والے کو کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ان غلاموں کی بڑی بڑی جماعتوں میں صرف دو چار ایسے نکلے تھے۔ جو ہمیشہ اس طاقت سے بچنے کے لیے جس کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے موقع تلاش کیا کرتے۔ ان خاص شکایات کے علاوہ یہ شکایت اور بھی تھی کہ ان کی قابلیت کا اعتراف نہیں کیا جاتا یا یہ کہ ان کی تعداد کی قوت فائق کام میں نہیں لگائی جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر غلام فی الواقع چوپایہ اوزاری بن گئے تھے۔ پہلے بھی بعض لوگ اس حد درجہ کی ابتری سے بچ گئے۔ ان محدود دے چند بچے کچھ لوگوں نے دوسروں کو کلیئہ کند ہو جانے سے بچالیا۔ انہوں نے ان کو تسلیم شدہ رواج کے ہاتھوں مطیع جانور نہ بننے دیا۔ جیسا کہ ان اشارات سے مترشح ہوتا ہے جو قانون ال اور سینیکا کی تصنیف میں درج ہے۔ اس زمانہ میں اے دن بدامنی رہتی تھی جو اکثر کھلی مخالفت میں تبدیل ہو جاتی تھی اور حالات کے

مابوس خیز ہونے سے ہر شخص جان پر کھیلنے کے لیے تیار ہو گیا موت اُس کی نگاہ میں ایک حقیر شے ہو گئی تھی اور اس ہوا کے خلاف آقا بھی دم نہ مار سکتا تھا۔

روایتی عقیدہ کے پیروں نے خود کشی کی جو توصیف کی ہے وہ کسی غلامی اصول پر مبنی نہ تھی بلکہ اس کا وجود اس درجہ سے ہوا کہ غلاموں میں اس رواج آئے دن عمل کیا جاتا تھا جو جان دے کر ایسی آزادی کی دنیا میں پہنچ جاتا تھا۔ تھے جس میں داخل ہونے کے لیے جسم کو ہر ایک رگ میں دوا زہ موجود تھا۔

سنسکار قلمطراز ہے۔ نہ معلوم کتنے غلاموں کو انے آقاؤں کے قہر و غضب سے جان بچانے کے لیے موت کی پناہ لینا پڑی۔ اس طرح ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اس رسم غلامی میں ناقابل برداشت خرابیاں موجود ہیں۔ جو تعداد غلاموں کی افزونی کے ساتھ ساتھ سلطنت روم کے خاتمہ پر تجاؤں کو کر گئی تھیں۔

آقاؤں کے نقطہ خیال سے غلامی کا رواج اچھا نہ تھا۔ اس کی وجہ سے فراغت سر تا پا اور بے شمار دولت حاصل ہو سکتی تھی لیکن غلاموں کی قیمت نہایت گراں تھی جو جماعتیں غلاموں کی مالک ہوتی تھیں وہ ہمیشہ ہوشیار رہتی تھیں۔ پلوٹارک نے کیٹو کی زبان سے یہ کہلایا ہے کہ وہ اس غلام کو زیادہ پسند کرتا تھا جو خالی وقت میں بھی جب اس کے پاس کچھ کام نہ ہوتا تھا۔ سوتا تھا اور حالانکہ اُن حالات میں جہاں معاشی ترقی پوری طور سے ہوتی تھی۔ غلام ایک گھرنے کا رکن ہوتا تھا جیسا کہ چھوٹے خاندان میں ہوا

کرتا تھا۔ غلامی کے دستور کے سبب سے وہاں مابعد کو خطرناک مزدور جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ سنیکانے کہا ہے کہ ایسے لوگوں پر ہمارا دار و مدار رہنا جو ہم سے بیزار ہیں اور نفرت کیتے ہیں بڑی خراب بات ہے۔ لیکن ہم اس طریقہ کو قطعی طور پر ناممکن بنا سکتے ہیں۔ وہ شخص ایک خراب ملازم ہے جو موت سے بھی نہیں ڈرتا اس کو نہایت ذلیل سمجھنا چاہئے۔ محض اسی وجہ سے نہیں کہ ایسے جو قوت ملازموں کو قفسے میں رکھنا ناممکن تھا بلکہ اس غلاموں کے متواتر خوف سے جن کا ذکر متعدد بار سنیکا کی تصنیف میں آیا ہے۔ اسلو کے اکثر ہم جہاں لو غلاموں کے ساتھ جواب سلوک کرنے والے آقاؤں سے ضرور بالضرور تکلیف پہنچی ہوگی۔ سیاسی نقطہ خیال سے اس خرابی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگوں کو ہمیشہ انقلاب کا اندیشہ رہنے لگا۔ جس سے قدرتا آقاؤں نے ان وفراغت کو جو خیال کیا جاتا ہے کہ انھیں رسم غلامی کے باعث حاصل تھا نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ ہر ایک ایسی نفسی تعلو جماعت ہمیشہ نہایت محنت طلب اور ہوشیار رہتی ہے جس کا دار و مدار دیگر انسانوں کی کثیر السعد جماعت کی محنت و مشقت پر ہوتا ہے۔

اگر غلاموں کے ساتھ جانوروں یا اوزاروں کے مانند جیسا کہ اصولاً وہ سمجھے جاتے ہیں واقعی عملاً سلوک ہوتا تو سارا معاملہ ٹھیک رہتا۔ اگر جانور کو اس کی خوراک مل جائے تو پھر وہ سرکشی نہیں کرتا اور جب کسی اوزار سے کام نہیں لیا جاتا تو وہ اسی حالت میں پڑا رہتا ہے جس حالت میں کام لینے والا اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ مگر انسان میں غیر مادی

ترقی کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ مخصوص طبقے میں ذرا
مشکل رہ سکتا ہے۔

مگر تمام انسانوں کی یکسانیت کا ان لوگوں کو بھی اترار کرنا
ہی پڑا۔ جن کا یہ خیال تھا کہ بعض انسان چوپایہ یا زور ہوتے ہیں
اس کے علاوہ جہانتک کہ کسی حکمران کو آزادوں یا ایسے غلاموں
پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا جنہیں اس کی طرف سے کام کرنے کے لئے
آزادی مل جانے کی امید تھی اسی قدر سیاسی زندگی ناممکن سی
معلوم ہونے لگی تھی۔ سینات کی طاقت کو پامال کرنے میں کچھ حصہ غلامی
بھی لیا تھا۔ بعد ازاں اراضی یا مکانات کے چھوٹی چھوٹی صنعتوں
کے مالکوں کے تعداد میں جو شریف واقع ہو گئی تھی۔ اس کو لوگ
سیاسی مشکل قرار دیتے تھے۔ کیونکہ جتنے ہی کم لوگ کسی تمدنی نظام
کے قیام میں حصہ لیتے ہیں اسی قدر کم عرصہ تک وہ نظام قائم رہتا ہے
لیکن یہ غلامی ہی تھی جس کی بدولت شہنشاہی روم کی نہایت فراخ رو
کمانود ہوا اور بڑے بڑے بردہ داروں کا صنعت و زراعت پر قبضہ
ہو گیا اور جو بڑے بڑے ذاتی کارخانوں سے مالک بھی بن گئے۔

غلامی کے متعلق عیسائیوں اور اونیوں کے خیالات

مندرجہ بالا خرابیوں کی وجہ سے لوگوں کے دماغوں میں اس خیال نے

جگہ کر لی کہ غلامی کا دستور نہایت نامناسب ہے۔ بخلاف اس کے
 اس میں ایک خوبی بتائی جاتی تھی جس کی بدولت ایک پر اثر سیاسی
 سفیر کی بنیاد قائم ہو سکتی تھی اور وہ خوبی یہ تھی کہ اس سے خود مختار
 انفرادی مشقت کا موقع حاصل ہوتا تھا اور جیسا کہ اب ہم کو معلوم
 ہے یہ بھی کسی طرح کوئی برکت نامتناہی نہ تھی۔ لیکن ہمیں کسی
 ایسی خالص سیاسی تحریک کا پتہ نہیں چلتا۔ جس کا ان لوگوں کی
 طرف سے آغاز ہوا ہو جنہیں دستور غلامی میں خرابیاں نظر
 آتی تھیں

لوگوں کے ذہن میں جو تجاویز آتی تھیں ان کی نوعیت سیاسی
 کم اور مذہبی زیادہ ہوتی تھی۔ ان تجاویز سے تمام نفع انسان
 کے ساتھ یکساں مساوات و محبت کے جذبات کا اظہار ہوتا تھا
 اور ان انسانوں میں غلام بھی شامل تھے۔

روایوں کا مسلک مساوات کم از کم ان قلیل المقادار تنہا
 کی علی روش تبدیل کرنے میں بہت کارگر ہوا جو اہل دماغ تھے
 اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم سے کم خانگی غلاموں کے حالات میں
 حقیقی اصلاح ہو گئی۔

اس کے بعد عیسائی مذہب کا ظہور ہوا جس کا اصول اخوت
 عالمگیر تھا اور جس میں اس اصول نئی پابندی بھی کی جاتی تھی۔ اس کا
 اثر یہ ہوا کہ غلامی غلام اور آزادوں کے حق میں کم تکلیف دہ ثابت

ہونے لگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آقا ہویا غلام دونوں میں سے کوئی بھی روایات گزشتہ پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دستور سے جو مجھ بھی کام دراصل ہو رہا تھا اس میں تغیر واقع ہو گیا۔ حالانکہ صرف یہی نہیں بلکہ اور دوسری قوتیں بھی اس رسم کے انسداد کے لئے برابر کام کر رہی تھیں۔

اسی طرح اور بھی متعدد سیاسی انقلابات پیش آئے حالانکہ دستوروں کے بجائے قائم رہنے کی وجہ سے ان انقلابوں کا پتہ اس زمانہ کے واقعات سے صاف طور پر مترشح نہیں ہو سکتا تھا۔

ملت مسیحی کی طرف سے انسداد غلامی کے لئے کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ سینٹ پال کی ہدایت کے مطابق رائے عامہ ان دستوروں کو برابر جاری رکھنے کے حق میں ہو گئی جو پہلے سے قائم تھے۔ اور جہاں تک معاملے کے عملی پہلو کا تعلق تھا جو مذہب و مابا میں اس وقت رائج تھیں عیسائیوں نے ان سے بہترین فائدہ اٹھانے کی کوشش کی مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ایک دوسری دنیا کے لئے چشمہ براہ ہوتے تھے۔

اس معیار کی جھلک واقعات کے بہ مقابلے کتابوں میں زیادہ

زور کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ طرز عمل میں جو کچھ بھی تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ اس سے تمدنی نظام میں کوئی اہم تغیر نہیں واقع ہوا۔ علم و ادب کی رو سے اس سلسلہ میں معیار کی بجا آئی تھی اور اسی کے لحاظ سے اس کا جو کچھ اثر ہوا اس کی مثال کے لئے ہم سنیکا اور سینٹ اگسٹین کی تصنیفات پیش کر سکتے ہیں جو یکے بعد دیگرے اس معرکہ آرا اندہی انقلاب کے بعد تحریر ہوئے لیکن جن سے سیاسی زندگی پر اثر پڑا تھا۔

سنیکا کی تصنیف میں ہر جگہ یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ دستور غلامی سے تمام نوع انسان کی قدرتی یکسانیت کو ضرر نہیں پہنچتا ہے اس کا قائل ہے کہ:-

”اس شخص کا خیال غلط ہے جو سمجھتا ہے کہ غلامی کا اثر انسان کے دل تک پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کا جو بہترین جزو ہے وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ اجسام آقا کے ماتحت ضرور ہوتے ہیں اور وہ اسی کی ملکیت شمار کئے جاتے ہیں لیکن دل آزاد رہتا ہے۔ انسان کا دل واقعی اس قدر محدود ہے کہ جن قید خانوں کی دیواروں میں یہ قید کر کے رکھا جاتا ہے اُن میں بھی اس پر قابو نہیں حاصل ہو سکتا۔ لیکن یہ ان دیواروں کو توڑ پھوڑ کر بڑے بڑے کار نمایاں کر سکتا۔ اور صاحبانِ خدا کے مانند بھاگ کر ذات نامتناہی کے پاس پہنچ سکتا ہے۔“

اس لئے وہ چیز جسم ہی ہے جو بڑی قدر سے آقا کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ جسم کی خرید و فروخت کرتا ہے لیکن اس جسم کے اندر جو چیز موجود ہے اس کی حلقہ بگوشی نہیں کیا جاسکتی۔ جو کچھ بھی اس اندرونی جزو سے ظاہر ہوتا ہے وہ آزاد ہوتا ہے کیونکہ ہم ہر چیز کو قابو میں نہیں رکھ سکتے اور نہ غلامیوں کو ہر ایک امر کی متابعت کے لئے مجبور کیا جاسکتا ہے۔

جو احکام حکومت کے خلاف ہوں گے وہ ان کی تعمیل نہیں کریں گے اور نہ کسی جرم کے ارتکاب میں حصہ لیں گے۔
ارسطو نے باؤ از بلند کہا ہے کہ :-

”ایک غلام انصاف پسند۔ مضبوط اور شریف النفس ہو سکتا ہے۔“

سوال پیدا ہوتا ہے کہ :-

”کیا کسی غلام کی ذات سے اس کے مالک کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟“

اس کا جواب یہ ہے ”ہاں ایک انسان اپنے دوسرے بھائی کے کام آ سکتا ہے۔“

اور ایسے ایسے بیشمار نیک کاموں کی نظیریں ملیں گی جو غلاموں کے ہاتھوں سے انجام پذیر ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ موسیٰ لیس کے نام ایک کتب میں ایک فقرہ درج ہے کہ :-

ہوتا لیکن ایک چوبایہ مقرر ہو چاہیے۔ غلامی کی ابتدا گناہ سے ہوئی ہے اور یہ ایک سہرا ہے جو باری تعالیٰ کی طرف سے دی جانی ہے۔ اسی لئے ایک خاندان میں خدا کی عبادت کے لحاظ سے جس سے دائمی فائدہ حاصل ہوتا ہے اس کے تمام ارادین کے ساتھ نکلیں برتاؤ ہونا چاہئے حالانکہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ جو سوک ایک غلام کے ساتھ کیا جاتا ہے اور جو برتاؤ ایک بچے کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے دونوں کے مابین کچھ نہ کچھ فرق ضرور رہے۔

گویا اس زمانہ میں جو کیفیت تھی اس کے تذکروں اور معیار پسندوں کے جذبات میں ایسی علامتیں ہم کو ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگ غلامی کو ایک ناگوار شے تصور کر لے گئے تھے اور ان کے دل سے یہ خیال جاتا رہا تھا کہ اس قسم کے امتیاز مراتب سے تمام بنی نوع انسان کی بنیاد ہی مماثلت قطعاً معدوم ہو جانی ہے۔ اور حالانکہ کسی سیاسی اہل خیال نے معیار کو کسی اصلاحی تدبیر یا پیش نامہ کی شکل میں قائم کرنے کے لئے پیش قدمی نہیں کی مگر اس جذبہ میں اتنی ملاقت موجود تھی کہ اس کی وجہ سے ایک ایسے دستور کی خرابیوں کا کسی حد تک تدارک ہو گیا۔ جس کے اسناد کی تدابیر اس وقت تک ناکام ثابت ہو چکی تھیں۔

مساوا کے معیار پر کتنی چینی

اس قسم کے معیار پر کتنی چینی کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ اس کا دار و مدار ایک سیاسی ضرورت پر تھا لیکن اس کے ذریعے سے سیاسی یا معاشی نقد نفس کا علاج نہ ہو سکتا۔

غلامی کے لحاظ سے لوگوں کے طرز عمل میں جو کچھ تغیر واقع ہوا اس میں شک نہیں کہ اس سے ایک جذبہ طبقے کے انسانوں کے درمیان سیاسی تعلقات ہی قائم کرنے میں فائدہ ہوا لیکن جذبہ جب تک دستور کی شکل اختیار نہیں کر لیتا ہے اس وقت تک کثیر التعداد آدمیوں پر اس کا اثر نہیں ہو سکتا۔

مکن ہے کہ معدودے چند اشخاص اپنے غلاموں کو اپنی ہی طرح انسان سمجھیں اور ان کے ساتھ وہ سلوک نہ کریں جو چوپایوں یا اوزاروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان کے ایسا کرنے سے غلامی کی خرابیاں بھی دور ہو جائیں لیکن کثیر التعداد جماعت پر ہر قسم کے عمل یا جذبہ کا اثر عارضی ہوتا ہے جس سے لوگوں کے دل میں نہنگامی جو شش پیدا ہو جاتا ہے۔

مگر ان کے افعال پر ان باتوں کا ذرا بھی اثر نہیں پڑتا۔
 باوجودیکہ غلامی کی حسرتا بیاں بہت کچھ دور ہو گئی تھیں
 مگر عیسائی مذہب کے زور پکڑ جانے کے بعد بھی اس کا دستور
 تمام خطرات کے ساتھ جاری رہا جو اس کے وجہ سے ظہور
 پذیر ہوتے تھے۔

اس دستور کے اسناد کی وجہ یہ نہیں تھی کہ عیسائیوں
 یا دیگر اہل خیال نے اس کا کوئی دوسرا سیاسی نغمہ البدل مہیا
 کر دیا تھا بلکہ جو تمدنی نظام تاریک زمانہ میں قائم تھا۔ اس کی عام
 پامانی کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اسی سبب سے ہم ادلاً یہ کہتے ہیں کہ یہ معیار صرف
 جذبہ ہی کے شکل میں رہا اور اس نے علی صورت نہیں اختیار
 کی اس وجہ سے اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔
 سینٹ اگسٹین نے فرمایا ہے :-

”عیسائیوں کو چاہئے کہ خواہ ایک گھوڑا قیمت میں
 ایک غلام کے بمقابلہ زیادہ گراں ہو۔ مگر کسی طرح بھی انہیں
 گھوڑے یا زر نقد کے مانند غلام پر اپنا تصرف نہیں کرنا چاہئے
 غلاموں کے لئے لازم ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے خراب
 آقاؤں کی تعمیل احکام کئے جائیں۔ جب تک کہ وہ آقا
 حد سے زیادہ سزا دینا نہ کریں۔“

اسی وجہ سے دستور میں کوئی حقیقی تبدیلی ظہور پذیر ہو سکی
اور انجام کار جو تغیر جذبہ میں واقع ہوا تھا وہ زیادہ کارگر
نہ ثابت ہوا۔

اس کے علاوہ معیار کی وجہ سے لوگ اصلی تمدنی حالت کو
پس پشت ڈالنے لگے۔ اس معیار سے اس وقت کے رواج کی
محض مخالفت ہوئی۔ اصلاح ذرا بھی نہ ہو سکی۔ غلامی کے خلاف
جو لوگ اعتراض کرنے تھے انہوں نے کبھی یہ ثابت کرنے کی
کوشش نہیں کی کہ روزمرہ کی عملی زندگی میں اس دستور کے بغیر
کس طرح کام چل سکتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جو لوگ رواجی عقیدے
یا مذہب عیسائی کی پیروی کا دم بھرتے ہیں انہیں روزمرہ کی
زندگی کے حالات کی پرواہ نہ کرنا چاہئے۔

رواجی فرقہ کے پیرو کہتے تھے کہ قانون قدرت کے
مطابق غلامی ایک ایسی شے ہے جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ قانون قدرت کی جگہ ایک ایسے دستور نے
لے لی تھی جس کے سامنے ہم سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا تھا۔
عیسائیوں کا قول تھا کہ نزول انسانی کے قبل غلامی کا حصہ
ہستی پر نقش بھی نہ موجود تھا۔ لیکن انسان کا نزول ہو چکا تھا اور اسی
ہم قایم شدہ حالات کے مطابق کام کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔
انقلاب کا خوف معیار پسندوں کے راستہ میں رخنہ انداز ہوا تھا

رواۃ عقیدہ کے پیروئے بھی وہ سرعت غیر تغیرات دیکھ لئے تھے جو انسانیت حیوانی یا جنگلی طاقت کے زیر اثر حکومت میں ظہور میں آ رہے تھے اور جس میں ذرا بھی نیک اصول شامل نہ تھا۔ اس لئے اس قسم کے مزید عدم تسلط کے بمقابلہ ہر ایک دوسری شے خواہ وہ اچھی ہو خواہ بری بہتر معلوم ہوتی تھی۔

عیسائی مذہب کے متعلق جو اپنی ابتدائی تمقبات کے باعث نہایت دشوار گزار ثابت ہو چکا تھا لوگوں کا خیال تھا کہ اس سے طوائف اہلو کی پھیلتی ہے۔

اس لئے جماعت کی شورش پسندی اور سرکشی کی روک تھام بہت ضروری تھی۔ جو ممکن تھا کہ مذہب کو ازسرنو زندہ کرنے کے جوش میں ظہور پذیر ہو گئی ہوتی۔ اس طسوج سیاسی معیار پسندی کے دونوں طریقوں میں حد سے زیادہ احتیاط کے ساتھ کام لیا جانے لگا۔

لیکن رواۃ عقیدہ اور مذہب عیسائی دونوں میں سے کوئی بھی غلامی کے حق میں نہ تھا۔ مگر یہ دونوں اس نظام کو برقرار رکھنے کے لئے بہت محتاط رہتے تھے۔ جو پہلے سے قائم ہو چکا تھا اور ان کے نظر عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دستور ویسا ہی قائم رہا۔

روایات کے پیروں کی نظر میں قانون قدرت ایک جداگانہ چیز تھی اور جماعت کی تنظیم ایک دوسری شے۔
 ممکن ہے کہ ان لوگوں کا یہ خیال رہا ہو کہ غلام بھی ایک انسان ہے اور وہ اسی خیال کے مطابق اس کے ساتھ سلوک بھی کرتے رہے ہوں لیکن جو دستور قدیم زمانے سے چلا آتا تھا وہ اس کو بھی قائم رکھنا چاہتے تھے۔

ہر ایک عیسائی معیار پسند کا بھی یہ خیال تھا کہ تمام انسان خدا کی نظر میں یکساں ہیں اور وہ غلاموں کے ساتھ برا اور اناہ سلوک کرتا تھا۔ لیکن جو دستور پہلے سے قائم تھا اس کے برقرار رکھنے میں عیسائی معیار پسند بھی اپنا اثر ڈالتا تھا۔ کیونکہ ملک خدا کے قوانین کو انجام حکومت سے اس قدر دور رکھا جاتا تھا کہ دونوں آپس میں کبھی مل ہی نہ سکتے تھے اس طرح سیاسی ارتقار میں ایک نہایت معرکہ آرا نہزیمیت یعنی وفاداری نمودار ہوئی جس کے مطابق لوگ بحیثیت شہری انہیں باتوں کو قائم رہنے دیتے ہیں جس کی وہ بحیثیت انسان مذمت کیا کرتے ہیں۔
 قیصر کی متابعت اور خدا کی عبادت دونوں میں

فرق تھا۔ سیاسی جوش جس قدر زیادہ ہوتا تھا اسی قدر انسانی تعلق کے حقیقی از سر نو تنظیم کی طرف سے پہلو تہی کی جاتی تھی۔ یعنی مذہب سے اس کی روح نکال کر اس کو خاک میں ملا دیا اور دنیا سے روحانیت کا تعلق قطع کر کے ثنائی الذکر کو اس کے تمام سرمایے محروم کر دیا گیا تھا۔

مذہب اور روحانیت میں ذرا بھی طاقت نہیں باقی رہی تھی۔ سیاسی زندگی پر مذہبی جوش کا جو اثر پڑتا ہے وہ اکثر نہایت بیش قیمت ہوتا ہے لیکن سیاسیات اور مذہب کے درمیان ایک حد اتیاری موجود ہے۔ اس وجہ سے مذہب کی جانب تمام جوش و قوت صرف کر دینے سے بعض اوقات سیاسی ترقی میں تاخیر واقع ہونے لگتی ہے۔ سیاسیات پر اس قسم کے مذہبی جوش کا حقیقی اثر اس اثر سے بہت کم ہوتا ہے جو خالی سیاسی جوش سے پیدا ہوتا ہے۔

جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت سیاسی ترقی سے گریز کرنے میں کسی روائی یا مسیحی اصول کی پابندی نہ کی گئی تھی لیکن یہ دونوں مذاہب ایک ایسی دنیا میں رونما ہوئے تھے جو اپنی سیاسی جدت اور مدیرانہ معاملہ فہمی کی صلاحیت کو بھی خیر باد کہہ چکی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو کچھ سیاسی انقلابات واقع

ہوے ان کی تعداد جہاں تک مہذب اقوام کی ترقی کا تعلق ہے بہت تھوڑی تھی۔ سیاسی طاقت کا زیادہ مصرف اس زمانے کے شمالی دستوروں کو جذب کرنے یا قدیم معیارات کو نیا جام پہنانے میں ہوا۔

بہر کیف اپنی تمام خامیوں کے باوجود زمانہ وسطی کے سیاسی فرقوں کے درمیان انسانوں کے باہمی تعلقات کی شکل بدلتا اور عملی کو بھی جدید صورت اختیار کرنے سے روکتا ہوا یہ معیار قائم رہا۔

زمانہ اخیر یورپ میں اس کی وجہ سے سیاسیات نئے سرے سے دریافت ہوئی اور اسی وقت اس معیار نے نیا رنگ اختیار کیا۔ اس زمانہ میں جب انقلاب عظیم واقع ہو رہا تھا اس نے انسانوں کے مابین عدم مساوات کا دستور خاک میں ملا دیا۔

اب رہا معیار کا دوسرا پہلو یعنی یہ کہ تمام اقوام عام طور پر ہر ایک بات میں یکساں ہیں اور ان کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہ ہونا چاہئے جو اس معیار کے خلاف ہے۔ کہ محض سیاسی رتبہ کے لحاظ سے تمام اقوام کے حقوق مساوی ہیں اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرون وسطی میں جو اقوام جمہور یورپ کے اندر موجود تھے ان کے بعد کی جتنی تاریخ ہے وہ فخر

اسی اصول پر مبنی ہے کہ تمام مہذب اقوام مساوی ہیں۔ نسلی فوقیت کا خیال اس زمانہ سے مغلوب ہوتا رہا اور اس کے بعد سے اس اتحاد کی تحریک شروع ہو گئی جو ازمنہ وسطی میں واقع ہوا تھا۔



پانچواں باب

ارمنہ وسطی کا اتحاد قرون وسطی کے نصب العین کی اصالت

وسطی طور پر اب دور وسطی کے معیارِ راست کا عشر
عشیر بھی باقی نہیں رہا۔ اگرچہ ہویں صدی کی تاریخ میں یہ دیکھا جائے
کہ اس زمانہ میں کونسا نصب العین قابل حصول تھا تو ایسی بہت کم باتیں نظر
آئیں گی جن سے ہمارا خیال متفق ہوگا۔ اس زمانہ کے معیار پسندوں نے انسانوں
کے درمیان سیاسی تعلقات کے قیام و قرار کے لئے نہایت عالیشان پیش نامے
تیار کئے۔ ان ضوابطِ عمل میں سے اکثر کے وجود کے تو ہم قائل ہی نہیں ہیں کیونکہ
آج کل کوئی شخص بھی یہ طریقہ مناسب نہیں تصور کر سکتا ہے کہ تمام فرمانروایاں
یورپ شاہنشاہِ جرمنی کے مطیع بنادے جائیں خواہ وہ اپنی سلطنت کو متحد
اور رومن عقیدہ کا پیرو بھی کیوں نہ بنائے اور نہ کوئی شخص اندرونِ مملکت
کے فرقوں یا جماعتوں کے باہمی نظم و نسق کے لئے میدانِ عمل میں قدمزن ہوگا
جیسا کہ نظامِ جاگیر کی کامنشاہ ہے لیکن جو معیار ان پیش ناموں کی تہ میں چھپا

ہوا تھا۔ جہاں تک ہم اقوام یورپ کے اتحاد کا قیام و قرار چاہتے ہیں ابھی تک اپنا کام کر رہا ہے۔

اس طرح ان متروک تراکیب عمل کو ہم ایک معیار کی جزدی یا عارضی شکل سمجھ کر کام میں لاسکتے ہیں۔

ہم زمانہ وسطی کے اہل الرائے کی تعریف صرف ان کے ارادوں یا منصوبوں کی وجہ سے کر سکتے ہیں کیونکہ جو کچھ ان کو ترکے میں ملا تھا وہی ان کے ارادوں کے اظہار میں رخنہ انداز ہو رہا تھا۔

رومانے قدیم کا خیال ان کے دماغوں میں اس وقت تک موجود تھا اور جو مرقع انھوں نے اس کا کھینچا تھا اس کو وہ بخیاں اتحاد کلیہ رومانے متبرک ہونے کی وجہ سے سلطنت روم ہی کے گرد بہتے تھے لیکن جو تصویر تیار ہوئی تھی وہ درحقیقت ایک نئی شکل تھی جس پر قدیم زمانے کے خیالات کا قالب چڑھا تھا۔ جس چیز کا وہ تصور کرتے تھے وہ ایک ایسا سیاسی اتحاد تھا جو اپنی زباں کے سوا اور تمام پہلوؤں میں روم کے نظام سے مشابہ نہ تھا۔ زبان زوال پذیر ہو کر ایک عام بولی ہو گئی تھی اور جو کچھ انھوں نے تصور کیا تھا وہ اس کو ایک واقعہ یا مال شدہ ہی کا عکس سمجھے تھے اس زمانہ میں جب تخیل کا زور کم تھا فہرست واقعات کو لوگ ایک استادانہ نتیجہ فکر کے گراں بہا نام سے موسوم کرتے تھے لیکن قرون وسطی کے لوگوں نے پاک سلطنت روما کے قیام کرنے کا سہرا کبھی اپنے سر نہیں رکھا۔ وہ اپنے خیال کا ستر یا چادرت آمیز ہونے کا دعویٰ کر سکتے تھے لیکن اس کے بجائے انھوں نے یہ اعلان کیا کہ یہ خیال وہی تھا جو پہلے سے چلا آتا ہے اس واسطے ایک ایسے سیاسی نصب العین کے لئے

ہیں ان کو ضرور مرجھا د آفرین کہنا چاہئے جو خود ان کے دماغ کا اختراع تھا حالانکہ انھوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی وجہ سے سیاسیات میں کوئی جدید قوت پیدا ہو گئی تھی۔

مقدس سلطنت روم

جس قسم کی سلطنت کا انھوں نے تصور باندھا تھا وہ یورپی اتحاد کا ایک بدنام مجسمہ تھا لیکن سرسری نگاہ سے دیکھنے والے کے لئے اس سلطنت کا نقش اب ایک نام کے عکس سے بھی بدرجہا کمتر ہے حالانکہ اس سلطنت کو خود کبھی زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی تھی۔

ممکن ہے کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہو کہ قرونہائے وسطیٰ کا سیاسی نصب العین مذہبی معیار کی طرح اس زمانے کے آئینہ شکستہ سے نمایاں ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ گرجا گروں کی خوبصورتی اور شان و شوکت کے تسلیم کرنے میں کسی کو انکار نہ ہو لیکن اس زمانے کے لوگوں کی سیاسی زندگی کا بہت ہی کم حصہ موجودہ دور میں باقی رہ گیا ہے جنھوں نے ان خیالات کی عمارت تیار کی تھی۔ یہاں اس بات کے بتانے کی ضرورت نہیں کہ آجکل مذہبی معیارات کا کس قدر حصہ باقی ہے لیکن ہمیں اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہئے کہ جس طرح مختلف قالب اختیار کرنے پر بھی روح کا وجود بدستور باقی رہتا ہے اسی طرح معیار بھی اپنی مادی صورت میں ستر یا ایک مکمل تبدیلی ہو جانے کے بعد قائم رہ سکتا ہے۔

ہیں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ خصوصیت زمانہ وسطی اہل خیال کے سیاسی معیارات میں پائی جاتی ہے اور اب ہم یہ دکھائیں گے کہ اس زمانہ کے سیاسی فضا میں جو قوت محرکہ کام کر رہی ہے وہ انہیں لوگوں سے ترکہ میں ملی ہے۔ ہم لقب مقدس سلطنت روما کو اپنی بحث کا نقطہ ابتدائی بنا کر یہ دکھائیں گے کہ اس خیال کا کس قدر جزو آجکل باقی ہے جس کے مطابق عہد وسطی کے متعینوں نے سلطنت مذکورہ تیار کی تھی۔ ایسا کرنے کے لئے سب سے پہلے اس فرق و امتیاز کا اظہار کرنا ضروری ہے جو اس معیار اور اس کی اتفاقیہ شکل کے درمیان واقع ہے اس زمانہ کے اہل الرائے اپنے معیار کے ان معنوں سے متفق نہ ہوں گے جو آجکل اخذ کئے جاتے ہیں کیونکہ امتداد زمانہ سے اس کے نیم تیار شدہ خیال کے بہت کچھ معنی پیدا ہو گئے ہیں اور وہ خود اپنے دل و دماغ سے نکلے ہوئے خیال کو جدید شکل و صورت میں بہ مشکل تسلیم کر سینگے اس کے علاوہ یہ بھی بدقت تصور کیا جاسکتا ہے کہ سلطنت روما کا وجود اتفاقیہ اس خیال پر ان معنوں میں منحصر تھا کہ قرون وسطی کے اہل خیال مختلف اقوام کے مابین ایک ایسے اتحاد کا تصور کر سکتے تھے جس کا کوئی سر تاج نہ ہو۔ اس خیال کا کہ تمام مختلف اقوام کے اغراض و مقاصد عام ہیں اور تمام عالم میں ایک سیاسی اتحاد قائم ہونا چاہئے یہ نتیجہ نکلا کہ ان واقعات کی وجہ سے جو پیشتر ظہور پذیر ہو چکے تھے مقدس سلطنت روما قائم ہو گئی لیکن اس خیال کے ذیل میں اور معنیاتی باتیں مثلاً اہل روما کے بادشاہ اور یورپ کے شہزادوں کے باہمی تعلقات نیز اسی قسم کے مسائل کا ظہور اس شاندار معیار کے سبب سے ہوا کہ تمام مہذب اقوام کو ایک عام اتحاد کے رشتے سے منسلک ہونا چاہئے۔ یہی وہ اصول اتحاد ہے جو اس سیاسی خیال

میں جس سے ہم یورپین قوموں اور دیگر اقوام کے مابین امتیاز کرتے ہیں اور اسی احساس میں مضمر ہے جس کی وجہ سے یورپی جنگ دوسری لڑائیوں کے مقابلہ میں زیادہ ہیبت ناک معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ہم یہ مسلمہ سمجھتے ہیں گو قطعی طور پر نہیں سمجھنے کہ یورپ کے تمام اقوام میں ایک برادرانہ رشتہ اور یکجہلی موجود ہے مگر یہ خیال نہ تو نا لگیکر ہے نہ قومیت کے خلاف ہے۔ خیال ایک نہایت بے نظیر رشتے کا ہے جو فی الواقعہ زمانہ وسطی کی تاریخ کی وجہ سے ظہور میں آیا۔

کتب ”شاہنشاہی“ اور ”اصول حکومت“ کے ان تمام متروک سیاسی خیالات کی تہ میں یہ معیار چھپا ہوا ہے جس کا نصب العین ابھی تک صفحہ ہستی پر موجود ہے۔ قرون وسطیٰ میں معیار ایک قوت محرکہ کا کام کرتا تھا حالانکہ دانستہ طور پر اس کے مطابق کوئی سیاسی کارروائی نہیں ہوتی۔ انیسویں صدی کے صنعتی دور کے بعد بھی یہ معیار قائم رہا۔ اور جس قسم کا مستقبل ہم تیار کرنا چاہتے ہیں اس کے بنانے میں یہ ابھی تک اپنا کام زور و قوت کے ساتھ کر رہا ہے۔

زمانہ حال کا یورپین اتحاد

سیاسیات مالیہ میں جس صورت سے یہ معیار کام کر رہا ہے پہلے ہمیں اس بات پر بحث کرنا چاہیے کہ مغربی یورپ کے اقوام میں یہ احساس عام طور پر موجود ہے کہ تمام اختلاف کو باوجود وہ مشرقی اقوام کے مقابلے ایک ہی نظام کے جو وہ ہیں۔ مسٹر کیپلنگ فرماتے ہیں ”مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور جس وقت تک خدا کے برتر کی عظمت کا کرسی عدالت کے سامنے زمین و آسمان کا وجود ہے۔ دونوں کا باہم اتصال

نہیں ہو سکتا۔“

مگر شاید مشر کیلنگ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ اس قسم کے جذبات عہدِ وسطیٰ سے چلے آتے ہیں جب مغربی یورپ خود کو تو ایک تہذیب یافتہ جماعت قرار دیتا اور بیرونی دنیا کو تہذیب کے نام و نشان سے نا آشنا تصور کیا کرتا تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ خواہ یہ خیال زمانہ وسطیٰ ہی کا کیوں نہ ہو مگر ایسے واقعات کے مشاہدے پر مبنی ہے جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مغربی یورپ کے تمام مختلف اقوام کی تہذیب واقعی یکساں ہے اور انکا دوسری قوموں سے مقابلہ کرنا بھی سبباً نہیں ہے خواہ یہ طریقہ دور وسطیٰ کا بھی کیوں نہ ہو کیونکہ قرون وسطیٰ میں لوگ واقعات کا مشاہدہ کرتے اور ان کی بناء پر اپنے سیاسی خیالات قائم کرتے تھے اس طرح ان مشاہدات کی ایک یادداشت قائم ہو جاتی تھی۔ وہ تاریخ بالکل نامکمل ہو گئی جس میں قرون وسطیٰ کے احسانات تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے گا اور یہ کہا جائیگا کہ ہم کو سیاسیات میں جو پچھلے دور روم اور یونان سے ملتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک مبہم خیال یہ بھی لوگوں کے دلوں میں موجود ہے کہ جو لڑائیاں خود یورپین اقوام کے مابین ہوا کرتی ہیں وہ ان لڑائیوں سے زیادہ خوفناک ہوتی ہیں جو ان اقوام میں سے کسی ایک قوم اور وحشیوں یا زرد فام قوموں کے درمیان واقع ہوتی ہیں اور اب ایک عادت سی ہو گئی ہے کہ لوگ یورپ کی جنگ کو تو ستراپا خانہ جنگی سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ تمام قسم کی لڑائیوں کو مہذب نہادینہ والی قرار دیتے ہیں جن معیار پسندوں کا یہ خیال ہے کہ تمام

خلقت انسانی کیساں ہے اور تمام اقوام کے حقوق مساوی ہیں۔ وہ اسی قسم کے امتیازات زیادہ کرتے ہیں اور ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ کہہ دینے سے دراصل کوئی خرابی نہیں قرار دی جا سکتی کہ کم از کم یہ دوسرے عیوب کے بمقابلہ زیادہ خراب نہیں ہے۔ جو جنگ وحشیوں کے خلاف کی جاتی ہے وہ اس وجہ سے معقول نہیں لکھی جا سکتی کہ وہ اس جنگ سے نسبتاً کم غیر معقول ہوتی ہے جو ہمارے اور ہماری ہمسایہ قوم کے درمیان واقع ہوتی ہے مگر کوئی بھی جنگ تہذیب کی اشاعت کرنے والی نہیں ہوتی خواہ ایسی لڑائیاں بعض ہوں بھی جن سے دوسری لڑائیوں کے بمقابلہ تہذیب میں کم رخنہ اندازی ہوتی ہے۔

لیکن بایں سبب یہ ایک واقعہ ہے کہ عوام الناس کا خیال درست ہے یورپین جنگ اس وجہ سے زیادہ ہولناک ہوتی ہے کہ جذبات اور روایات کے لحاظ سے یہاں کی قومیں زیادہ متحد ہیں اور ان میں سے کوئی ایک قوم بھی دیگر غیر یورپی اقوام کے ساتھ زیادہ رشتہ اتحاد نہیں رکھتی۔ ماضیات کا نقشہ ہمارے ناموں سے بھی پامال نہیں ہو سکتا۔ جن معنوں میں جرمنی ہمارے لئے غیر نہیں ہے ان معنوں میں جاپان غیر ہے۔ اور ذہنی سیاسیات میں ایک قوم کو دوسری قوموں کے بمقابلہ کامل طور پر مساوی سمجھنا یا دونوں کے باہمی تعلقات کی معاشیات کے ذریعہ سے آزمائش کرنا ایک ناممکن بات ہے۔

فرض کیجئے کہ دو بھائی ہیں اور دونوں کی ساتھ ہی ساتھ پرورش و پرورش ہوئی ہے ساتھ ہی کھیلے اور پروان چڑھے ہیں۔ آگے چل کر ان ہی دونوں بھائیوں کے درمیان کسی کاروبار ہی معاملہ میں ناچاقی اور رنجش ہو جائے اسی طرح

روایات کے لحاظ سے ان دونوں کے مابین جو رشتہ ہے وہ اس رشتہ سے زیادہ گہرا ہے جو ایک بھائی اور اس کے کاروبار کے کسی شرکت دار کے مابین قائم ہے۔ اس کے علاوہ مان لیجئے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ایک ہی مدرسے میں ساتھ ساتھ تعلیم پائی ہے اس میں بھی سیاسی نقطہ خیال سے یا کاروباری معاملہ کے لحاظ سے باہم دشمنی ہو سکتی ہے مگر اس کے باوجود وہ ایک روایت سے باہم دیگر منسلک اور اپنے بھلیسوں یا اپنی جماعت کے ان لوگوں تک سے ممتاز رہ سکتے ہیں جنہوں نے اس مدرسے میں کبھی تعلیم نہیں پائی لیکن مغربی یورپ کے بعض اقوام ایسے ہیں جو خونی رشتے سے بھائی ہیں اور جنہوں نے ایک ہی کتب میں تعلیم پائی ہے۔

لہذا معاملہ کے اس پہلو میں دو باتیں دلچسپ نظر آتی ہیں پہلی بات یہ ہے کہ مغربی یورپ کے جذبات اقوام میں یہ احساس موجود ہے کہ وہ سب ایک ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں کے دل میں یہ خواہش بھی بہت زبردست ہے کہ جو اتحاد ان کے مابین چلا آ رہا ہے وہ محفوظ اور روز بروز ترقی پذیر ہے۔ یہ ہے وہ معیار جو قرون وسطیٰ سے ہمارے ہاتھ آیا ہے اور ابھی تک سیاسیات میں کام کر رہا ہے۔

ازمنہ وسطیٰ میں معیار کی ابتدا

اب ہم کو اس نصاب العین کے معنی اور اس کی قدر و قیمت کے متعلق بحث

کرنا چاہئے لیکن یہ اسی وقت ہی ہو سکتا ہے جب کہ پہلے اس کی ابتدا اور اول
اول ترقی پر روشنی ڈالی جائے۔ اور اس کے بعد ان لوگوں کی زبان کے مطالب
ظاہر کئے جائیں جنہوں نے پہلے اس کے اظہار کی کوشش کی تھی حالانکہ وہ سنی نیم دستی
کی حالت میں کی گئی تھی۔ جن باتوں کا ذکر ہم کریں گے ان کا تعلق بیرونی واقعات
سے نہیں بلکہ روم کی دماغی کیفیت سے ہے جو ان سے ہم کو ترکہ میں ملی ہے
ہم کو یہ دریافت کرنا پڑے گا کہ تمام یورپ میں اتحاد قائم کرنے کی خواہش نے
زور کس طرح پکڑا اور اس کا کیا اثر ہوا اس نے ایک سیاسی پیش نامہ کی صورت
میںے اختیار کی اور اس کے اظہار میں جو ناگزیر قیود عائد کئے گئے تھے ان کے سبب
سے کس طرح لوگ، معیار کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے تھے۔

روم کے زوال کا ذکر اس میں ایک عام بات ہو گیا ہے جب روم کی
طاقت نے خیر باد کہا تو اس کے ساتھ ہی یورپ کا نظام بھی صفحہ ہستی سے منقود
ہو گیا جو تنظیم روم میں قائم ہوئی تھی وہ حالانکہ وہاں کے مجوزہ معیار کے اعتبار
سے سراسر ناموزون تھی مگر وہ نظام اس طوائف الملوکی سے زیادہ قابل تعریف
تھا جو اس کے بعد روم میں ہر طرف پھیل گئی تھی۔

ہر ایک شہر دوسرے شہر کو اپنا سکاربنانے کی حتی الامکان کوشش کرتا
تھا اور مختلف قبائل یورپ کے آباد خطوں کی طرف جانے لگے جس سے
اس نہایت قدیم دور زراعت کی تہذیب کا قیام ناممکن ہو گیا۔ دشمنی سرکشوں
کے جاہلانہ جبر و استبداد کی وجہ سے جو کچھ بربادی محنت و مشقت کے نتائج
کی ہوئی تھی اس کا نظارہ دیکھ کر ادگوں کے دل ہاتھ سے چھوٹ جاتے تھے۔

اور کامیاب وحشیوں کی تقلید کرنا بودوباش کا بہترین ذریعہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ زمانہ تاریک و درستھا کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ روم اور یونان نے جو کچھ بھی حاصل کیا تھا وہ ضائع ہو چکا تھا اس زمانے کے تاریخ وار واقعات میں حملہ کا ذکر درج ہے اور فصل کی بربادی کے بعد جو قحط اور اس سے بھی بدتر طاعون پھیلا اس کا بھی ذکر قلمبند ہے۔ اس کے بعد چھ سال بہ سال حملہ ہوتا رہا حتیٰ کہ ایسا زمانہ آگیا کہ لوگوں کو آئے دن موت کا خطرہ رہا کرتا تھا اور بڑے سے بڑے آدمیوں کو یہ اندیشہ تھا کہ دنیا کا اب بہت جلد خاتمہ ہونے والا ہے۔

پاپے و ماگرگیری اول کا بیان ہے کہ :-

”ہر طرف رنج و الم کا عالم طاری ہے جدھر نظر اٹھا کر دیکھو ادھر سے صدائے ماتم آرہی ہے تمام شہر برباد۔ فوجی قلعہ سمار۔ ملک میں آبادی کا نام و نشان نہیں سرزمین ایک ریگستان معلوم ہوتی ہے۔ کھیتوں میں کسان نہیں نظر آتے۔ شہر میں ایک کافی چڑیا کا بھی وجود نہیں جو کچھ انسان آباد بھی ہیں انہیں آئے دن سراسیمگی سے سامنا رہتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ محبوس زندان میں۔ بعضوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے ہیں اور بعض نادک اجل کا نشانہ ہو گئے ہیں۔“

اگر ہم کو اس کیفیت کا نظارہ کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے تو یہ سمجھنا مناسب ہے کہ ہم کو اذیتوں سے محبت ہے راحتوں سے نہیں۔ روم کی آج جو حالت ہے ہم دیکھ رہے ہیں اور کون روم جو کسی زمانہ

میں عروس البلاد کہا جاتا تھا۔ اس کے شہریوں کی تعداد بہت کم ہے
 دشمن ہمیشہ پنجر بکف دشمن کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ہر جگہ آثار شکستہ کا نظارہ
 پیش نظر ہے۔“

اس کے بعد پاپائے روم اسی سلسلے میں فرماتے ہیں کہ ”دنیا کے آثار
 شکستہ با واز بلند صد اوسے رہتے ہیں کہ دنیا اپنی شان و شوکت سے ہاتھ
 دھو کر اور سیکڑوں جوئیں سہ سہ کر تم کو دکھا رہی ہے کہ اس سلطنت کا زمانہ
 اب کس قدر قریب آ رہا ہے جو اس کے بعد قائم ہوگی۔“
 معلوم ہوتا ہے کہ پاپائے گرگری نے تسلط یافتہ حکومت کی تعریف میں
 مبالغہ سے کام لیا ہے اور خرابی کا جو مشاہدہ کیا گیا ہے اس کا نتیجہ صاب
 موسون کی تصنیف سے ظاہر ہے۔

یہ فرض کر لینا عین اقتضائے قدرت ہے کہ اس عام لطائف اللوکی
 کے زمانے میں اس ضرورت کا احساس کرتے تھے کہ کسی نہ کسی قسم کی ایسی
 سلطنت حکومت ضرور قائم ہونا چاہئے جس کا قدیم زمانے سے جو نسبتاً بہتر تھا
 ذرا بھی جزو باقی رہ گیا ہو۔ پاپائے تقدس آب کا مشرقی سلطان کو پسند کرنا
 اقتدار ذہنی کی تقدیس کے متعلق ان کے خیالات عامہ کا ایک منطقی
 نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

نظام اور امن کی جگہ ہر طرف بد نظمی اور نفاق کا دور دورہ تھا
 لیکن زمانہ وسطی کی دنیا کا ظہور خانہ بدوشی۔ متعدد محاربات اور عالمگیر
 بد امنی کے سبب سے ہوا۔

یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس زمانے میں بیداری کا جوش تھا متعدد اغراض میں کشمکش جاری تھی اور نظام روما کا خواب لوگوں کو تھوڑا بہت یاد تھا اس عہد میں نبرد آزما قبائل یا ان لوگوں کے درمیان جن پر آٹھ دن جیلے ہوا کرتے تھے۔ عام اغراض کا احساس نہایت مناسب معلوم ہوتا تھا۔ یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ ایسی ہی عام دلچسپیوں پر امن و حفاظت کا قیام ہو سکتا ہے اور نظام روم کی یاد کے ساتھ اخوت انسانی کے متعلق جدید مسیحی تلقین بھی جاری رہی۔ حتیٰ کہ جو بات پہلے ایک مبہم خواہش تھی وہ ایک قطعی شکل اختیار کر کے معیار بن گئی۔

عملیات میں معیار کی جھلک

ازمنہ وسطیٰ کے لوگ جس صورت میں اتحاد کا تصور کرتے تھے اس میں شک نہیں کہ وہ ناکافی تھی لیکن ایسے عہد میں جو لوگ رہتے تھے ان کے لئے یہی ایک ممکن صورت تھی۔ اس عالم نفاق میں، صرف ایک سیاسی جماعت تھی جو بظاہر مقام قومیت اور زبان کی تقسیم کے اعتبار سے بالاتر ہو رہی تھی۔ جس وقت نظام روم پوری طور پر مٹ گیا کلیسائے روم کے واعظین اس خطہ زمین کے بعید ترین حدود تک پہلے ہی پہنچ چکے تھے جس کا نام بعد ازاں ”یورپ بزرگہ و سلطانیہ“ رکھا گیا اس طرح کلیہ اتحاد کی خواہش کا مخرج بن گیا جس نے پاک سلطنت روم کی شکل اختیار کی تھی

حکام کلیسا کا قطعی طور پر ایک ہی زبان سے تعلق تھا اور دنیا کی نوعیت اور انسانی فرائض کے متعلق جو عام خیالات تھے ان سے بھی وہ متفق تھے۔ مذہبی رسوم کے علاوہ ان کے دستور اور روایات بھی یکساں ہی تھے جس زمانے میں مختلف خانہ بدوش اور بداجدا اقوام میں اپنے درمیان باطنی تعلقات قائم کرنے کے خیال کی صلاحیت ہوتی ہے اس سے عرصہ دراز پیشتر ہی ان لوگوں میں باہم میل جول تھا۔ مقدس عقیدہ اور دستور کے مد مقابل آٹھویں اور نویں صدی میں مسیحی جماعت یہ وعظ و تی پھرتی تھی ”خدا ایک ملت ایک پیتہ ایک گونا گونا اتحاد ایک جادو تھا جس سے مذہب پیشین کی منقسمہ جماعتیں بالآخر تسخیر ہو گئیں۔“

اس طرح عہد تازیکی نقل و حرکت کے بعد آخر میں جب تسلط قائم ہوا اس وقت تمام مغربی یورپ میں ایک ہمہ گیر تعلق نظر آتا تھا اور وہ سلسلہ اسی کلیسائے روم کا تھا۔

اس کے بعد چارلس اعظم کی فتح کا زمانہ آتا روم کا نشان مٹنے کے بعد سے وسیع و فراخ ممالک میں ایسی دور رس قوت سمجھی دیکھنے میں نہیں آئی قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلا جس کے علاوہ اور کوئی بات نہ ہو سکتی تھی کہ جدید طاقت کو قدیم نام سے موسوم کیا گیا۔ نویں صدی کی سلطنت کو سلطنت روم کی فضا شدہ ہستی کا ایک نیا قالب سمجھ کر دونوں کا ایک وجود ثابت کیا گیا۔

شہ عیسائے عین اسی روز جب حضرت مسیح علیہ السلام کا ظہور مسعود ہوا تھا۔ پاپائے لیونے چارلس کے سر پر تاج شاہی رکھ کر اس کو اہل روم

کا جزو اعظم قرار دیا۔ اس طرح مقدس سلطنت روم کی بنیاد پڑی لیکن قرون وسطی کے لوگوں کی نگاہ میں یہ جتنی باتیں ہوئیں وہ سب نئی تھیں جو آگسٹس قیصر کی حکومت کے کئی سئوں صدیوں کے بعد ظہور پذیر ہوئی تھیں۔

خود چارلس کا جس کے ہاتھوں تہذیب جدید کے لئے انقلابی کارروائی کا آغاز ہوا تھا یہ خیال تھا کہ میں ایک قدیم نظام کا محافظ ہوں۔

کلیسا روم سے اس کا یہ پاک اور جادو خیز لفظ یعنی اتحاد پھر سلطنت جدید کے پاس چلا گیا اور اس طرح بادشاہ کی ذات پانچ سو سال تک تمام طبقہ انسانیت کے سیاسی اتحاد کا مجسمہ بن گئی۔

الگوئیں نے چارلس سے کہا تھا۔

”تمام وفاداروں کی یہ دعائیں حضور پر نور کے ساتھ رہیں گی کہ حضور کا شہنشاہی اقتدار نہایت شان و شوکت کے ساتھ روز افزوں ہو اور جہاں تک ایزد تعالیٰ کے لطف و کرم سے تمام انسان ہر جگہ زیر حکومت اور امن پاک اور کامل مجتہد اتحاد سے محفوظ ہوں کیتھولک عقیدہ تمام قلوب میں یکساں طور پر جاگزیں ہو“

اسی طرح ایڈمنٹ کے راہب اینجلیٹ نے رقم فرمایا ہے کہ :-

”تمام عیسائی قوم کی صرف ایک مملکت ہے اسی وجہ سے لازماً اس حکومت کا صرف ایک بادشاہ ہے۔ چونکہ تمام مہذب طبقہ انسان باہم متحد ہے اسی لئے اس اتفاق کا واحد حامی اور مرقع شہنشاہ کی ذات ہے“

سیاسی اتحاد کا آغاز پہلے ہی سے ہو چکا تھا جس کو معیار پسند اشخاص

ایک قابل حصولے قرار دیتے تھے۔ قبل اس کے کہ کوئی عظیم انسان سیاسی اتحاد قائم ہوتا۔ اس سیاسی اتحاد کے اثرات اکثر اشخاص کو عمدہ معلوم ہونے لگے تھے کیونکہ کلیسائے روم کی کامیابی سے حقیقی اتحاد کی ابتدا ہو چکی تھی اور اس کے بعد اس کو صرف اتنی ہی ترقی ہوئی کہ سلطنت کو شروع شروع میں کافی طور پر مل کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

لیکن نویں صدی میں اتحاد کا پورا نظریہ نہیں قائم ہوا تھا کیونکہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ لوگ پاپائے اعظم اور بادشاہ دو شخصیتوں کا اقتدار تسلیم کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک شخص اپنے اپنے مقام پر صاحب اختیار تھا۔ ملت مسیحی میں کچھ دنوں کے بعد صرف ایک سرغنہ مقرر کرنے کا خیال ہو گیا تھا۔ اور شاید یہ دو عملی حکومت ہی معیار مابعد قائم کرنے کے لئے اختیار کی گئی تھی۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ دو عملی طرز کے اصول میں کسی وسیع سیاسی تدبیر سے نہیں بلکہ اصلی مبحث سے احتراز کیا جاتا ہے۔

جنگ آزما قبائل کے درمیان تعلقات جزوی طرز پر اس طرح قائم ہو گئے تھے کہ دنیاوی معاملات میں نظری طور پر وہ بادشاہ کے مطیع تھے اور روحانی معاملات میں پاپائی کی حکومت کا دم بھرتے تھے۔ یہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے اتحاد سے کس قدر فوائد حاصل ہو سکتے تھے گیارہویں اور بارہویں صدی میں اس اصلی اتحاد میں تبدیلی کرنے کے لئے جس کا لوگ خواب دیکھا کرتے تھے آخر مرتبہ کارروائی کی گئی۔ لیکن معلوم ہوا کہ ایسا ممکن نہیں تھا۔ زمانہ ہمارا ایک سے سیاسی دستور اور خیالات میں بہت ترقی ہو چکی تھی مگر

جب سب منزلیں طے ہو چکیں اس وقت یہ دیوار منہدم ہو گئی۔ کلیسہ اور مملکت کے مخالف اور متضاد مطالبات بہمی مصالحت سے نہ طے ہو سکے۔

یہاں اس طول طویل تکرار و بحث کی تاریخ درج کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مدعا براری کے لئے جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اقتدار و اختیار کے معنی ساری بحث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں ہر شخص کا خیال تھا کہ کسی نہ کسی کو اعلیٰ اختیارات ضرور حاصل ہونا چاہئے۔ کلیسیائیوں اور شہنشاہت پسندوں دونوں کی شہادتیں اس بارے میں موجود ہیں کہ اولاً جس قدر اتحاد حاصل ہو چکا تھا اس کی خاص طور پر قدر کی جاتی تھی اور دویم اس وقت کا ہر معیار تھا کہ اس قسم کے اتحاد کو مزید ترقی دی جائے۔

ہر ایک جماعت اصولاً اور عملاً دونوں طریقوں سے اس اقتدار کے ضروری خصوصیات کو محفوظ رکھنا چاہتی تھی جس کو اپنے قبضے میں رکھنے کی وہ خواہشمند تھی۔ شہنشاہت پسندوں نے کلیسہ کو محکوم بنا کر اس کا وقار حکومت کو دیدیا تھا اور کلیسیائی اپنی جگہ مملکت پر غالب آکر اس کی منزلت کلیسہ کو دیدیتے تھے ان دونوں میں سے ہر ایک جماعت اپنی اپنی کارروائی ایک عام مقصد کے لئے کرتی تھی۔ یعنی دنیا بھر میں تمام انسان متحد ہو جائیں۔ یہ وہ کارروائی ہے جو گیارہویں اور بارہویں صدی میں ہوئی اس کو تیرہویں صدی میں باقاعدہ بنایا گیا تھا

قرون وسطانیہ کے لوگوں کو اس طوائف الملوک کی کا مشاہدہ نہیں ہوا اور نہ وہ کسی دوسرے تصور یا اتحاد کا خیال باندھ سکے۔ مگر یہ ایک با اثر معیار کی

میانجی ہرگز نہیں ہے۔ دودھ حقیقت یہ بے بنیاد ہے اور نہ محض خواہش کا اثر ہے کیونکہ اس کا آغاز ہمیشہ ایسے ناگوار واقعہ کے ساتھ ہوا ہے جس کا یہ مخالف رہا ہے۔ جزوی طور پر یہ اثر تصوریت کا ہے لیکن تصور اسی بات کو سامنے لا کر پیش کر دیتا ہے جو تجربہ کے ذریعہ پہلے ہی معلوم ہو جاتی ہے۔

اس مزاج کے دور میں ایک قسم کا اتحاد موجود تھا جس کو مصلحان وقت ترقی دینا چاہتے تھے اور اخلاص و کلبہ کا رواج تھا۔ اس میں نسل یا رتبہ جاگیرداری کے لحاظ کے بغیر ہر شخص صاحب اقتدار ہو سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے جرمنی اور انگلستان کے اکثر افراد کو بھی یہ منہ زات نصیب ہوئی حالانکہ زیادہ تر بابا یا اطالوی قوموں کے ہوتے تھے۔

مختلف ممالک میں بڑے بڑے مسیحی اساتذہ کو بین الاقوامی اختیارات حاصل تھے۔ اور اگر کوئی چھوٹا سا پادری بھی کہیں اپنے ضلع کے بائرنکل جانا تھا تو تمام یورپ میں لوگ سمجھتے تھے کہ اس کو بھی کچھ اختیار ہے۔

لیکن باوجودیکہ کلیسا کی تنظیم میں اصلی اتحاد کا آغاز ہو چکا تھا۔ اتحاد کو واقعی اتنی اہمیت نصیب نہ تھی جتنی ایک ارمان کی حیثیت سے حاصل تھی۔ دراصل اتحاد کا نقش لوح دل پر موجود نہ تھا۔ جب زمانہ وسطی اچھی طرح شروع ہو چکا تھا اس وقت بھی نفاق کے متعلق صرف اسے زنی کی جاتی تھی۔ اور گیارہویں صدی کے آخر میں ایک انشا پر داز نے اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس وقت جو کچھ بد نظمی تھی خود پاپائے روم اس کے ذمہ دار تھے۔

شاید یہ متعصبانہ خیال ہو لیکن بایں ہمہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ

اس زمانے کے لوگ اتحاد کو گراں بہا سمجھتے تھے وہ رقمطراز ہے۔

”جنگِ جدل اور بغاوتوں کے سبب سے سلطنتِ روم کے طول و عرض میں
دلوں انتشار و سرسبکی رہی ہے بعضوں کا بیان ہے کہ اس نفاق کی پشت و پناہ گر گئی
جو پاپا، ہلڈمی برانڈ کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ بھی واقعی درست ہو کہ
ہلڈمی برانڈ نے اتحادِ کلیسائی کے متعلق خداوند تعالیٰ کے احکام اور کتبِ مقدسہ کو پامال
کرنے کی کوشش کی ہے۔“

یہ الفاظ جس کتاب سے اخذ کئے گئے ہیں اس کے شروع میں یہ لکھا گیا ہے کہ
”اختلافِ رائے کے باعث کلیہ سے ترکِ تعلق کرنا سب سے بڑا جرم ہے کیونکہ اس سے
اتحاد کو صدمہ پہنچتا ہے۔“

سنتِ آگسٹن کے بیان کا حوالہ دیکر مصنف نے آگے چل کر لکھا ہے کہ:-
”لعنت ہے ان لوگوں پر جنہیں اتحادِ کلیہ سے نفرت ہے اور جو لوگوں کے
درمیان فرقہ بندی کرنے پر آمادہ ہیں۔ کاش وہ گوشِ شنوا سے ان الفاظ کی سماعت
کریں کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ کلیسائی پھندے سے منحرف ہو کر علیحدگی اختیار کرنا
بت پرستی سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے۔ عہدِ نامہ قدیم میں درج ہے کہ بت پرستی
کے گناہ کی سزا تلوار سے ویجاتی تھی اور عقیدہ کلیسائی سے انحراف اور ترکِ تعلق کرنے
کی سزا یہ ہے کہ زمین بھٹ جائے گی اور گنہگار اس میں سما جائے گا۔“

پس اگر اس اتحاد کا مقابلہ جو کلیہ کے بدولت قائم ہوا تھا اس معیار سے کیا جائے
جس کی تجویز خود پہلے پہل کلیہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ جس کی حمایت نظامِ روم کی
بادشاہ سے ہوتی تھی اور جو درمیانی قروں کی سلطنت سے ترکہ میں حاصل ہوئی تھی

تو اس اتحاد کی ذرا بھی وقعت نہیں رہ جاتی ہے۔

جس طرح کلیسائی دور عہد وسطی کا پہلا دور ہے اسی طرح زمانہ مابعد میں درس تدریس بھی درحقیقت بین الاقوامی تھی جس سے تمام یورپ میں اتحاد قائم تھا اگر کوئی طالب علم قانون پڑھنا چاہتا تو وہ بوتوں یا پڑوا جاسکتا تھا۔ اگر کوئی علم الادویات میں تعلیم حاصل کرنے کا خواہشمند ہوتا تو وہ سیکرنو یا انٹ پلیر جاسکتا تھا۔ اسی طرح علم الہیات کے شالیقین ہکسنفورڈ یا پیرس میں جا کر تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ یورپ بھر میں ایک ہی زبان ایک ہی قسم کے درسی کتب اور ایک طریقہ رائج تھے۔ ہر ملک میں طلباء کو یکساں حیثیت حاصل تھی اور وہ مساوی حقوق و مراعات کا مطالبہ کرنے کے حقدار تھے۔ اس خاص درس کے شروع کرنے کے پہلے جو اس کے متغیر کیلئے موزوں ہوتا۔ اس کو بھی دیگر طالب علموں کی طرح شعبہ فنون کے لصاب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اصلی واقعات یہ ہیں ان کے آگے تخیل جہاں تک کام کرنا تھا، لوگوں کے سامنے ایک قابل تقلید اتحاد شائستگی پیش رہتا تھا جس کا اظہار اس سند سے ہوتا تھا جو علماء کو عطا کی جاتی تھی اور لفظ فائز تحصیل سے ہوتا ہے کیونکہ آؤ خوالد کر لفظ سے محض تعلیم اعلیٰ کا نظام ہی نہیں متصور تھا بلکہ اس سے ایک ایسی عالمگیر طاقت مراد تھی جس کا پایہ یورپ میں کلیسہ اور سلطنت کے برابر سمجھا جاتا تھا۔

حقیقی اتحاد کی ایک علامت ان باتوں میں بھی نظر آتی ہے جن سے معاشرتی مراتب کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ یہ باہم تمام ممالک میں یکساں محض جس کی وجہ سے مبادی زون اور ان حکومتوں کے تاجداروں میں اتحاد نظر آتا ہے جو ایک دوسرے سے دور واقع تھیں۔ اس حکمت عملی سے جو قسطنطنیہ وسطی اور زمانہ احیا

سے ہمیں ترکے میں ملی ہے۔ ابھی تک بعض قدیم کسوٹیاں محفوظ ہیں ایک ماہر سیاست
اس وقت ذات یا فرقے کے اس خیال کے مطابق جو زمانہ وسطی میں رائج تھا۔ بادشاہوں
کے درمیان ملاقاتوں کا بند و بست کر سکتا ہے جس حد تک ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ
کے سامنے سر جھکا سکتا ہے وہ آج کل بھی سب پر ظاہر ہے لیکن بالعموم اندنوں پر ٹھیک
طور سے نہیں معلوم ہے کہ اگر کسی موقع پر حکومت متحدہ کے کسی مبارز کو اطالیہ کے کسی
سروار سے ملنا نصیب ہو تو اول الذکر کی نشست کہاں ہوگی۔ قومیت کے ظہور سے عہد
وسطی کے مقبول عام فرمے اب کتم عدم میں نہاں ہو گئے ہیں۔ تقسیم کو ایک مناسب نئے
تسلیم کرتے ہیں لیکن اس زمانے میں معاشرتی مراتب کے حقیقی اتحاد کی وجہ سے لوگوں میں
ایک قابل تقلید یورپی اتحاد سیاسی قائم کرنے کا خیال پیدا ہو گیا جس کے مطابق ہر شخص
کی ذات و حیثیت کا اعتراف ہر ملک میں جہاں جہاں وہ سفر کرے ہونا چاہتے تھا۔

ادبیات میں معیار کا تذکرہ

ازمنہ وسطی کے لوگوں کے دل میں اتحاد کی جو اہمیت جاگزیں تھی اس کا پتہ
اس مرتبہ و وقار سے اور بھی زیادہ چل سکتا ہے جو اصول پسندوں نے شہنشاہ کو دیکر رکھا
تھا شہنشاہ کا تعلق بادشاہوں کے ساتھ ایسا نہیں تھا جیسا ان کے اور ان کی رعایا
کے درمیان تھا۔ ایسا رشتہ حد درجہ بیرونی مانا جاتا تھا اس سے دنیا میں شاہنشاہ
کے مرتبہ و اقدار کا عظیم المثال ہونا کافی طور پر ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ حقیقت شہنشاہ
وہ ان تمام اہل منصب سے زیادہ لائق اور برتر تھا جن کے درجہ بدرجہ مراتب کے بعد

اسی کا مرتبہ سب سے زیادہ افضل تھا۔ بادشاہوں کے مقابلہ میں شہنشاہ کا مرتبہ ایسا ہی تھا جب پاپا کا درجہ پادریوں کے مقابلہ ہوتا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ کلیسائی عمالوں میں افضل ترین مرتبہ پاپا کا تھا۔ یہ کہنے سے بھی کہ پاپا کا مرتبہ سب سے زیادہ افضل و برتر ہے زمانہ وسطی کے نقطہ خیال کی غلط ترجمانی ہوتی ہے۔ پاپا کا اہل مراتب میں شمار ہی نہیں ہے وہ ان سے بالاتر ہے اس طرح قادر مطلق خدائے پاک اور دینی بادشاہوں کے ساتھ شہنشاہ کا ایک بالکل بے نظیر تعلق تھا۔ شاہنشاہ ایک جاگیر دار بادشاہ بھی نہیں ہے کیونکہ اصولاً وہ ملک بھی اس کا نہیں ہوتا جس میں اس کی رعایا آباد ہے۔ بجائے اس کے جاگیرداری کے طریقہ میں ملکیت زمین کا اصول مضمحل ہے۔ حالانکہ جرمنی کے بعض حصوں میں شہنشاہ ایک صاحب جاگیر تاجدار ہوتا ہے مگر بحیثیت شاہنشاہ اس کا اقتدار جاگیری نہیں ہوتا اور بعض معنوں میں یہی طریقہ انگلستان تک پڑتا چلا آیا ہے۔ اس زمانہ میں یہ مقبول عام اور مروجہ خیال شہنشاہ کے متعلق تھا جس میں وہ تمام مہذبہ نوع انسان کی تصویریں استحداکا مجسمہ سمجھا جاتا تھا اور جس کا وجود ایک ایسی صورت میں تھا جس سے تمام قومی۔ نسلی یا مقامی امتیازات فرد اور بہ کمال اہمیت معدوم ہو جاتے ہیں۔

اس رفیع النیالی کی شہادت میں ہمارے پاس محض درجہ عام سیاسی تفسیر ہی نہیں بلکہ خاص خاص کتابیں موجود ہیں جن میں اس کا تذکرہ درج ہے اور سب سے زیادہ پر زور شہادت ڈینیٹی کی تصنیف (شاہنشاہ) میں ملتی ہے۔ حالانکہ اس میں ذاتی رائے کا اظہار کیا گیا ہے مگر حقیقت یہ ایک

اصول تسلیم شدہ کا تذکرہ کم از کم اس جگہ پر ضرور ہے جہاں اس کی مخالفت کی گئی ہو۔
 یہ کوئی خواب نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی پیش نامہ ہے۔ حالانکہ عہد وسطیٰ
 کے خیال کی خامی میں ارسطو کی ذہانت جھلکتی ہے۔ اس زمانے کے سیاسی خیالات
 یونانی تدبر سے بہت مختلف واقع تھے کتاب کے شروع میں بیان کیا گیا ہے کہ
 ”جہاں تک انسان کا تعلق ہے تمام طبقہ آفریش کا مدعا و مقصد ایک
 ہی ہے جب کہ اندنوں ہم تسلیم کرتے ہیں ایک عام مقصد سے مراد ہے ایک
 حکومت اور اس کے بعد بے گناہ ازمنہ وسطیٰ کا یہ اصول آتا ہے کہ۔“

”عام طور پر حکومت کا مطلب ہے کہ کوئی حکمران ہو اس کے بعد حکمران
 اور طبقہ انسان کے درمیان وہی تعلق ہے جو خدا کے برتر اور کل کائنات کے
 مابین ہوتا ہے۔“

اس کے علاوہ ممکن ہے کہ امراء اور بادشاہوں میں نزاع پیدا ہو جائے
 لہذا ایک ایسا منصف ہونا چاہیے جس کو قطعی اور آخری فیصلے کا اختیار ہو۔ اور
 پھر جو کام ایک شخص کر سکتا ہے وہ بہت سے اشخاص کو انجام نہیں دینا چاہئے۔
 جس دلیل کا نام ڈینیٹی نے استقرار پر رکھا ہے اس کے مطابق صرف اتحاد
 کا اصول ضروری ثابت ہوتا ہے کیونکہ شاہنشاہ آگسٹس قیصر کے دور حکومت کے سوا
 دنیا کبھی دولت امن سے مالا مال نہ تھی لیکن اب انسان کئی سروا لے چو پایہ بن گئے
 ہیں تیسری کتاب سے ظاہر ہے کہ شاہنشاہ کو اس ہستی کی حیثیت سے جس سے سیاسی
 اتحاد کا آغاز ہوتا ہے اختیارات پاپا سے نہیں حاصل ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ
 (دیکھو باب سولہواں) اس کو یہ اختیارات براہ راست خدا کے عروجل سے

عطا ہوتے ہیں۔

اس تمام کتاب میں شروع سے آخر تک یہی تصور سائر دوار ہے کہ ہر قسم کے انسانی عادات و خفایاں نیز اغراض کی تہ میں ایک نام کی مابینیت اور اتحاد موجود ہے انسان بحیثیت انسان سیاسیات کی بنیاد ہو۔ ڈیوینیٹی یا اس کے ہمعصروں کو اس میں زیادہ فرق نہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان سے ایک ایسا شخص مراد تھا جو چند سال تک یورپ کے کسی حصے کا باشندہ رہا ہو۔

سیاسیات کے متعلق دوسری کتاب جس سے اتحاد و یک رنگی کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے ٹامس اکوئیناس کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں درج ہے۔

”ایک واحد طاقت ایسی ہونا چاہئے جو سب کو اس منزل پر پہنچائے جو سب کے لئے یکساں ہو۔“

اور ڈیوینیٹی سے بھی بڑھکر ٹامس کا خیال یہ ہے۔

”بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ایسا ہی رشتہ ہے جیسا قالب کا تعلق جان کے ساتھ ہوتا ہے۔ دنیا میں اس کا وجود خدا کے مانند ہوتا ہے دنیا کو خدا نے بنایا اور وہ اس کا حاکم ہے اسی طرح بادشاہ حکومت بناتے ہیں اور ایک مقصد اور اس کے حاصل کرنے کے لئے وسائل مقرر کرتے ہیں اور وہ مقصد یہی ہے کہ سب انسان نیکی اور پاکیزگی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔“

ٹامس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک ایسے ذہین متعلم کے مانند لکھا ہے جس نے ارسطو کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا تھا کہ سیاسیات کہتے کسے ہیں ٹامس نے جو اعتراف و ستائش اتحاد کے متعلق کیا ہے یہیں صرف اس سے

یہاں غرض ہے۔ ان کے منصوبہ خیز خیالات کے بارے میں ہم یہاں نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتے۔ اس کی دونوں کتابوں کا معنی "ریٹیکس کے عہد میں اور شاہی مائٹرونگ کے اس حصے میں جس میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے مہذب جماعت کی ساخت کے متعلق جو اصول ذہنی دکھایا گیا ہے وہ اتحاد ہی ہے۔

صرف اسی کی بدولت اس خواہش میں کہ ایک حکمران ہونا چاہئے قوت پیدا ہو جائے گی۔ کیونکہ قرون وسطیٰ میں اہل انجیال ایک نقشہ اور تبدیل پذیر پیرایہ کے سوا اور کسی صورت میں اتحاد کا تعلق نہیں بنا سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ لوگ اتحاد یقین لانے کے لئے اس کے دیدار کے خواہان تھے لیکن انہوں نے اس پر کبھی اچھی طرح یقین نہیں کیا۔

نصب العین کی موجودہ صورت

اتحاد کا یہ معیار زمانہ وسطیٰ میں تھا۔ تاریخی واقعات کی دنیا میں اس کی نئی شکل دکھائی گئی ہے اور یہ کامل طور پر متروک نہیں ہو گیا ہے اس باب کے آغاز میں وہ دلیل درج کی جا چکی ہے جس کے مطابق یورپی اتحاد برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

اقوام کی باہمی خاصیت (انشاء جدیدہ کا ایک ترکہ ہے) اہم معاشرہ کا صلاح کیلئے شورش جو دور انقلاب کی میراث ہے! معاملہ میں سیاسیات حالیہ نے یورپی اتحاد کا بہت کم خیال کیا ہے۔ لیکن بعض اوقات قدیم معیار بدروں کے دماغ میں اپنی جھلک برقرار رکھا جاتا ہے گویا اس نصب العین کا بہت ہلکا سا عکس اتفاق یورپ میں پایا جاتا ہے۔

سیاسیات عملی کے لحاظ سے ان الفاظ میں زیادہ قوت نہیں رہی ہے لیکن ان سے
فراتص کے احساس عامہ اور اتحاد کی ایک مبہم خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ کسی دوسرے
موقع پر اس مفروضہ شادرت کے بے سود ہونے کے بابتہ کافی خیالات ظاہر کئے جا چکے ہیں۔
جس میں بظاہر ہر ایک رکن اپنے ذاتی مفاد کی تلاش میں رہا کرتا ہے۔ اور طرز عمل کے متعلق
محض عام اصولوں کے بے مطلب اظہار کے اور کوئی بیان اس کے جلسوں سے نہیں ملتا ہے
لیکن سیاسیات میں ابھی تک یہ ایک نامکمل واقعہ ہی ہے تاہم اس میں صعود کی گنجائش
ہے گویا قرون وسطی کا معیار یعنی عالمیست کے بے معنی مسلک کی صورت میں نہیں
جس میں تمام انسانوں کے اغراض کا پتہ لگانے کی خواہش رہتی ہے بلکہ حقیقی جذبہ ہمدردی
کی ترقی کی شکل میں قائم رہے گا جو اہل یورپ میں ایک دوسرے کے لئے موجود ہو۔ یہ
ہو سکتا ہے کہ ہم اس زمانے میں بھی یورپین اقوام کم از کم اس چیز کے قیام و قرار کے معاملہ
میں متفق ہوں جس کو ہم تہذیب سمجھتے ہیں کیونکہ یہ توقع کرنا کوئی بڑی بات نہیں کہ لوگ
ذاتی اغراض کو ایک ایسے عام جدوجہد کے تابع کر دیں جو نظام و تسلط کے قیام و قرار
کیلئے کی جائے۔ اور شہر شخص کا فتنہائے عام اس کے حق میں بہترین ثابت ہو۔
بہر حال اس وقت کا ایک بے مطلب احساس ابھی تک موجود ہے جو کسی قسم
کے حقیقی اتحاد یورپ میں سدراہ رہتا ہے اور اس کا باعث موجودہ حسد نہیں بلکہ اس کے
عدم امکان کے لئے وہ نقائص ذمہ دار ہیں جو اصلی معیار میں موجود ہیں۔

نکتہ چینی

تمام اقوام کی باہمی ناچاقی و مقابلت جو یورپ کے حالیہ سیاسیات کی ایک

انتیازی خصوصیت ہے اور جس کو اکثر سیاسی مصنف النسب تسلیم کرتے ہیں اس کا وجود محض حال ہی میں نہیں ہوا ہے۔

زمانہ وسطی کا معیار کبھی علمی جامعہ ہیں ہی نہ سکا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کسی قدر ناقص بھی تھا۔ اس زمانہ کو فوراً مطعون بنانے کے لئے ہمیں آمادہ ہونا مناسب نہیں جہیں اس کا معیار کامل طور پر جاہل ہوا تھا کیونکہ معیار میں خود ایسے قیود موجود ہوں گے جن کی وجہ سے اس کے حصول میں رخنہ اندازی ہوتی ہے۔

ہم اور زمانہ وسطی کے بزرگ دونوں کے مابین ان معنوں میں بڑا اختلاف ہے کہ ہم میں اظہار اختلاف نیز قابل حصول مدعا و مقصد کے متعلق تسلیم شدہ خیالات پر کلمۂ چینی کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

عہد وسطی کے معیار سازوں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے سمعہ و سہم کو مورد الزام و نشانہ بنایا کرتے تھے اور درحقیقت وہ خود معیاری مذمت نہیں کرتے تھے۔ اس طرح لیننگ لینڈ نے قدیم زمانے کی سادگی اور اسی کے ساتھ اس عیش پرستی پر اظہار۔ تاسف کیا ہے جس کا اس زمانہ میں ہر طرف بڑا زور تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر تمام انسان اپنے اپنے عقاید و خیالات کے مطابق زندگی بسر کرتے تو بہت اچھا ہوتا اور یہ ایک ایسی افسوسناک فروگزاشت ہے جو ابھی تک واعظوں کی فصاحت آمیز تقریروں میں واقع ہو جاتی ہے۔ اس کی عقل اس قدر محدود تھی کہ اس کو اس بات کا کبھی خیال بھی نہ آیا کہ یک ایسی زندگی کے لئے جو دنیا کے واسطے نمونہ ہو اس کے خیالات غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ڈینیٹی نے نہایت افسوس ورنج کے ساتھ اس زمانہ پر نظر ڈالی ہے جب تمام بنی نوع انسان اس معیار کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اصل بات یہ

ہے کہ اس کو اس زمانہ کا علم ہی نہ تھا۔ اس قسم کا زمانہ دنیا میں کبھی ہوا ہی نہیں۔ جو طرز عمل اس بیان میں مضمر ہے وہ صاف طور پر نمایاں ہے اگر لوگ کلیسہ اور سلطنت کے معیار کی تکمیل کر لیتے تو بہت اچھا تھا اور ڈیوٹی کو کبھی خواب میں بھی یہ بات معلوم تھی کہ اس قسم کے معیار میں نقائص ہو سکتے ہیں۔ پٹر آرک کے دل میں جس وقت یورپ کی اصلاح و درستی کے لئے خواہش پیدا ہوئی تھی اس نے کوئی نیا معیار نہیں تجویز کیا تھا اس نے وہی قدیم تدابیر اختیار کرنے کی رائے دی تھی جن پر بہترین پایاؤں اور شہنشاہوں کے نیک ارادوں کے باوجود کبھی عمل نہیں کیا جاسکا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یورپ میں سیاسی اتحاد کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی تھی اس کے ایک عرصے کے بعد قرون وسطی کے مدبروں نے لوگوں کو قدیم معیار کے سامنے سر جھکانے کے لئے فہمائش کی اگر کوئی بات ایسی ہے جس سے ہمارے جاوہر عمل اور زمانہ وسطی کے طرز عمل میں کمال اختلاف واقع ہوتا ہے تو وہ بات یہ ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ زمانہ ماضیہ پر رہا کرتی تھی اور ہماری نگاہ مستقبل کی جانب رہتی ہے۔

اس زمانے میں لوگ ایک خاص معیار مقرر کر کے اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی فہمائش کیا کرتے تھے مگر ہم اس پس و پیش میں رہتے ہیں کہ آخر کون سا معیار ایسا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہئے اور جن متعدد معیارات کی لوگ پیروی کرتے رہے ہیں۔ ان کا علم ہونے کی وجہ سے ہمیں ان میں بعض معیار اچھے بھی معلوم ہوتے ہیں اور بعض خراب بھی۔ اپنے تاریخی معلومات کے سبب سے ہمیں خود ان مفروضات کی صحت میں شک ہو جاتا ہے جو ہم نے معیار کے متعلق قائم کر رکھے ہیں اور قرون وسطی میں جب لوگ تاریخی معلومات سے مطلقاً بہرہ مند نہ تھے۔ لوگوں کے دل میں واقعی

اس معاملے کے لحاظ سے ذرا بھی شک نہیں گزرتا تھا کہ آخر کون سیاسی نظم حکومت سب سے زیادہ خاطر خواہ تھی۔ پدوا کے اوکھم ماریسی لیس ایسے مدبروں کو بھی شکے قطعی طور پر جمہوری خیالات تھے۔ شہنشاہی اتحاد کے غیر مستقل معیار نے چکر میں ڈال دیا تھا۔

اس سے صاف ہے کہ قرون وسطیٰ کا معیار بہت سخت اور اسی وجہ سے محدود یا ناقص تھا۔ تصویر ہی اور جزوی طور پر تکمیل شدہ اتحاد محدود اور بے جان تھا اس کا دار و مدار سلطنت روما کے پامال شدہ معیار کی بنیاد پر تھا اس میں نہ تو خود اس کے کسی جزو کی ترقی کی گنجائش تھی اور نہ عالمگیر سلطنت اور عالمگیر کلیہ کے کوئی جدید معنی پیدا ہو سکتے تھے۔

لیکن افراد کی طرح اقوام کا بھی صعود و مو ا کرتا ہے۔ ایک صعود پذیر عضویت ایسے سیاسی نظریہ کے لباس میں لپیٹ دینا جو ہم کو اہل مشین سے ترکے میں ملے ہیں ایک نہایت مایوس کن بات ہے یا تو خود نظام کو نقصان پہنچ جاتا ہے یا وہ اپنے قیود کو توڑ بھڑ کر ان سے آزاد ہو جاتا ہے جیسا کہ نشاۃ جدیدہ میں واقع ہوا تھا۔ اگر یورپ میں اتحاد پیدا کرنا منظور تھا تو وہ اتحاد پتھر کی طرح نہیں بلکہ ایک نمود پذیر درخت کے مانند ہونا چاہتے تھا۔ خلاصہ کے طور پر یہ ظاہر ہے اس کے علاوہ زمانہ وسطیٰ کے اتحاد نے کبھی غلطی جامہ پہنا ہی نہیں مختلف اقوام کی جدا جدا حکومتیں قائم ہو گئیں جن میں رقابت باہمی کی حادث کے خلاف کام کرنے کی ذرا بھی طاقت نہ تھی۔ لیکن کوئی نہ کوئی مہلک غلطی اس معیار میں یقیناً موجود ہوگی جو اس زمانہ میں محض ایک ارمان ہی ارمان رہا۔ جب ایسی طاقتیں نمودار ہو رہی تھیں جن کا

اس کو مقابلہ کرنا لازمی تھا۔

یہ ایک غیر تکمیل شدہ معیار تھا کیونکہ اس کا مقصور نہایت بدنام طریقے سے کیا گیا تھا۔ مہذب طبقہ انسانیت کے اتحاد کا یہ نشانہ گر نہیں ہے کہ ہر ایک طبقے کو کسی مرکزی قوت کا ماتحت کر دیا جائے۔ بہر حال چودھویں صدی میں جوئی نئی حکومتیں پیدا ہو گئیں اور جن کو پندرہویں صدی میں طاقت حاصل ہو گئی تھی انہوں نے اس معیار کو پس پشت ڈال دیا کہ تمام انسانوں کے اغراض عام اور یکساں ہیں اور ان کے درمیان ایک عالمگیر اخوت کا رشتہ قائم ہے۔

تاہم عہد وسطی کے معیار کی یہ خامی اس کی طاقت نہیں بلکہ اس کی کمزوری تھی اس زمانہ کے دوسرے ممالک کی سیاسیات میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ بعض جرمنی کے مصنفوں کے سیاسی نظریوں اور جرمن بدبروں کے دستوروں میں اس کا پتہ چل سکتا ہے کیونکہ جن طاقتوں سے سلطنت جرمنی کا اتحاد قائم ہوا تھا انہیں قوتوں سے مقدس سلطنت روم کے معیار کا بھی ظہور رہا جو عہد وسطی میں رائج تھا اور اس معیار میں جو غلطیاں تھیں وہ اس وقت سے اب تک برابر چلی آتی ہیں۔ اس کا ذمہ دار یہ خیال ہے کہ تمام دنیا میں ایک ایسی حکومت ہونا چاہئے جو سب پر غالب ہو لیکن ایسے ذرائع سے جو امن، آمان پیدا ہو گا وہ ایک مردہ اور غیر منضبط اتحاد کہا جائے گا وہ اتفاق دیمتھر کا سا ہو گا۔ دخت کے مانند نہ ہو گا۔ وہ اتحاد اس قسم کا ہو گا جو کسی ایسی جگہ سے شروع ہوتا ہے جس کا اس پر خارجی دباؤ پڑتا ہے۔ وہ اتحاد کسی اندرونی محافظت کے ارتقاء کا اظہار نہ ہو گا۔

گویا تمام یورپ کو متحد کر دینے کے متعلق جرمنی کا عام خیال پچھلے دنوں تک زمانہ وسطی کے قصصی معیار کا شکار ہوتا رہا ہے۔

ہماری نظر میں تو جس حد تک ہمیں یورپ میں تمام مہذب اقوام کے مابین حقیقی اتحاد ہو جانے کی امید ہے اس حد تک زمانہ وسطی کا معیار ابھی تک قائم ہے اور اس میں طاقت بھی موجود رہے لیکن نصب العین اس زمانہ کی روح ہے اس کا جسمانی ظہور بدلتا رہے اور ہمیشہ ایسا ہی تھا کیونکہ اس سے یہ پہلو رونما ہوتا تھا کہ اتحاد یورپ سے ایک ایسی عالمگیر طاقت مراد ہونا چاہئے جو خدا کے نام پر امن و ترقی کی راہیں دکھاسکے۔

ممکن ہے کہ مقدس سلطنت روم اقرن وسطی کے اتحاد کا مجسمہ ہو لیکن اولاً اگر ہمیشہ حقیقی اتحاد کے قیام میں رخنہ انداز رہی ہے اور زمانہ حال میں اس کے متعلق بہت کچھ خیالی اختلاف ہے اس معیار کا مادی پہلو اب ایک ایسے پامال شدہ عضویت کے مانند ہے جس کے ہاتھوں جرمن قوم کی سیاسی معیار بندی احمقانہ ثابت ہوتی ہے کیونکہ زمانہ وسطی کی سلطنت گواصولاً بین الاقوامی تھی مگر دراصل اس کی باگ ڈور جرمن قوم کے ہاتھ میں تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ سابق شہنشاہ جرمنی کو جو کچھ نقصان پہنچا ہے وہ اس وہم کی بدولت پہنچا ہے کہ مختلف اقوام کی جماعت کو زیر اطاعت رکھنے کے لئے ایک خاص قوم اور حکومت خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ اس وہم کا نشو و نما اس کے بدبرد کے ہاتھوں سے ہوا تھا۔

ممکن ہے کہ اس مہم کی اطاعت کا یہ منشا ہو کہ ہر جگہ امن و اتحاد قائم ہو جائے مگر زمانہ وسطی کے دستور کی ناکامی کی وجہ سے یہ قطعاً ثابت ہو چکا ہے کہ قیام اتحاد کا مزاج

طریقہ یہ نہیں ہے کہ مختلف اقوام کو کسی خاص قوم کا سلطیع بنا کر رکھا جائے۔ یورپ میں اتحاد قائم ہو جانے کی اس وقت بھی توقع کی جاسکتی ہے لیکن اس صورت میں جس میں قرون وسطی کے لوگوں کو اسید بھتی کیونکہ اس قسم کے اتحاد کا یہ مذہنا تھا کہ کئی حکومتوں کو ایک مرکزی قوت کے ماتحت کر دیا جائے۔ موجودہ نقطہ خیال میں عہد وسطی کے نظریہ سیاسیات کی غلطیوں کی درستی ہو جاتی ہے حالانکہ دوسری جانب اس کے محاسن کا بھی اعتراف کیا جاتا ہے کیونکہ ہمارا معیار کئی مشترک اجزاء سے بنا ہے۔ یہ سیاسی عناصر کا ایک مجموعہ ہے مخصوص اور مرکوز قیصریت کا اتحاد نہیں۔

اگر زمانہ حال کے اس جرمن مدبر نے جس نے کہا تھا کہ سلطنت جرمنی سیاسیات عالم میں ایک غالب ترین طاقت ہے۔ واقعی زمانہ وسطی کے شہنشاہیت پسندوں کی محدود تعلیم سبق لیا ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس نے اس تعلیم کے وہ اجزاء لوح دل پر نقش کئے ہیں جن کا وار و مدار نہ اس پر جہالت ہے۔

ازمنہ وسطی کا مدبر اپنے خیال کے مطابق جس سلطنت روم کو از سر نو قائم کر رہا تھا اس کو درحقیقت اس کی نوعیت ہی کا علم نہ تھا وہ اس کو ایک ایسی سلطنت سمجھتا تھا جس کی اطاعت مقامی بادشاہتیں کرتی ہیں۔ اور قرون وسطی کی سیاسیات میں اس کا اس صورت میں پتہ بھی چلتا ہے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ اس زمانہ میں ان حصص عالم کے اندر کوئی بھی ایسی قومی حکومت جو زمانہ وسطی میں قائم ہوئی تھی روم کے زیر اطاعت نہ تھی گالیہ کی قوم اور اہل برطانیہ کو جس زمانے میں روم نے محکوم بنایا تھا اس وقت ان قوموں پر زمانہ وسطی کے نوابوں اور بادشاہوں کی فرما روائی نہ تھی۔ لہذا موجودہ جرمنی میں اب یہ بد شکل خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں جب ہر قوم کی ایک جداگانہ آزاد حکومت قائم

ہو گئی ہے۔ روم کے اس طریقہ کا بھرا عاودہ ہو سکتا ہے کہ دیگر اقوام ایک خاص اور حکمرانی کے مطیع بنائے جائیں اور اس کے علاوہ قرون وسطیٰ میں بھی تمام اقوام کو ایک مرکزی حکومت کے ماتحت بنانے والی سلطنت کی طاقت کا دار و مدار اسلام پر نہ تھا سلطنت کی روح اس کی روحانی حیثیت تھی جو فوجی طاقت سے علیحدہ کر دی گئی تھی لیکن جدید نقطہ خیال کے مطابق جو باطل بھی ہے۔ اتحاد کو زبردستی مقدس شہنشاہ جرمی کے حایہ کردہ قوت اسلام کا محتاج بنایا جاتا ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ معیار قدیم اپنی نہایت غیر پختہ شکل میں ابھی تک بعض جرمن مصنفوں کی انگلوں کے اندر موجود ہے اور اول تو یہ نہایت فرسودہ اور قدیم تھا ہی اس کے علاوہ اس میں سپاہانہ طاقت کی جدید کذبیت بھی شامل ہو گئی ہے۔ یہ مدبران سیاست ایک نئے ارمان کے بہترین پہلوؤں کی پروتھی کرتے ہیں اس طرح اس خیال سے کہ قرون وسطیٰ میں لوگ خدائی تھی اور قوت اسلام کے درمیان ذرا بھی فرق نہ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ خود اپنے ہی بزرگوں کی تحقیر کے ذمہ دارین گئے ہیں۔ سیاسیات یورپ کی ارتقا میں مقدس سلطنت روم کی قدر و قیمت کا پتہ اس کی کمزوری ہی سے چلتا ہے کیونکہ یہاں اتحاد کا آغاز فوجی طاقت سے نہیں بلکہ روحانی قوت کے اثر سے ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ چارلس اعظم کی سلطنت بڑی شمشیر قایم ہوئی تھی لیکن جس زمانہ میں اصول شہنشاہیت کی کامل طور پر برکت ہوئی تھی سلطنت کے پاس نہ کوئی فوجی طاقت تھی نہ معاشی قوت بایں ہمہ وہ مہذب دنیا میں قیام اتحاد کی حامی تھی شہنشاہ کی سلطنت کسی نسلوں تک کمزور رہی۔ نہ تو وہ چھوٹے چھوٹے تاجداروں کے مابین کوئی تصفیہ کر سکتا تھا اور نہ حقیقی عالم گیر طاقت مثلاً کلیہ کے قیام کا بند و بست کر سکا۔ سیاسی نقطہ خیالی کے

مطابق قرون وسطی کے بعد سے یورپ میں اس قدر تفرقہ ہوا ہی نہیں جس قدر اس زمانہ میں تھا جب لوگ اتفاق کی ہر جگہ خواہش کرتے اور اس کی ضرورت تسلیم کرتے تھے لیکن اس امر سے جس نے ان کے معیار کی قدر و قیمت کے متعلق ہمیں شک میں ڈال رکھا ہے ہم کو اس کی توانائی کی اور بھی زیادہ تعریف کرنا چاہئے کیونکہ جس یورپی اخوت کے احساس عامہ کا ہم پہلے ذکر کر اسے ہیں وہ ہمارے انھیں بزرگوں کی نامکمل امیدوں کا عملی نتیجہ تھا اور یہ انھیں کا خیال ہے جو کم از کم جزوی طور پر خود پایہ تکمیل کو پہنچا ہے۔

تہنشاہ کی اسی مطلقیت سے اس کی مختار حیثیت کے نظریہ کو اعانت ملی بہت کم شائبہ نشاہوں کے پاس دولت یا جنگی استعداد موجود تھی۔ بادشاہ محض اسلحہ جات کے زور سے اپنے جاگیرداروں کے مقابلہ مرتبہ و منزلت میں فائق ہو سکتے تھے لیکن ان سب باتوں میں ایک پاکیزگی کام کر رہی تھی جس نے اقدار و منزلت کے معاملہ میں تہنشاہ کو جنگی طاقت یا مال و دولت کے شرائط کی ضرورت سے بد جدا کر دیا تھا۔ ہمارے زمانے میں اس قسم کے اصول کو لوگ سیاسیات کے متضاد و مخالف سمجھیں گے جس میں مال و متاع کے علاوہ اقدار و منزلت کا اندازہ کرنے کے لئے کوئی اور کسوٹی ہی نہیں ہوتی لیکن یہ ایک شاندار اور پر اثر معیار تھا جس سے اگر حقیقی اتحاد نہیں پیدا ہو سکا تو کم سے کم حلو متوں کے درمیان محض دشمنی کے بجائے دوسری قسم کے تعلقات قائم ہونے کی امید قائم رہ سکی گویا قرون وسطی کے مندر معیاروں میں ایک نصب العین یہ باقی رہ گیا ہے کہ تمام یورپی اقوام اپنی ماہمی خود مختاری کے باوجود ایک ہی رشتہ اتحاد سے منسلک سمجھی جائیں۔ غالباً اب ہم کو یورپ کے احیاء کے زمانہ کے اس نظریہ پر بھر توجہ کرنا پڑے گا کہ اقوام کی ایک ہی شاہی حکومت ہونا چاہئے جس کے متعلق دوسرے

باب میں بحث کی جائے گی۔ لیکن پھر بھی یورپی اتحاد کے بارے میں ہمارا یہ قیاس قائم رہ سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس کے حصول کے لیے جدوجہد ضرور ہونا چاہئے۔ اس طرح ہم زمانہ وسطی کے اس خیال کو رد کر دیں گے کہ تمام یورپ میں ایک ہی بادشاہ یا ایک ہی حکومت ہونا چاہئے اور سیاسی اقتدار کے لئے کسی فوق الطبع بنیاد کا ذکر کر کے جو اس عقیدہ میں مضمر ہے کہ شاہنشاہ اور خدائے غرور جل کے درمیان ایک خاص رشتہ ہے ہم اب سیاسیات کو پیچیدہ نہ بنائیں گے۔ لیکن باوجودیکہ سلطنت اور شاہنشاہ دونوں میں سے اب کسی کا وجود نہیں ہے اور ایک ایسے عالمگیر کلیہ کا خیال بھی اب داغ میں نہیں آ سکتا جس کا رشتہ تمام مختلف حکومتوں کے ارکان سیاسی کے ساتھ یکساں ہو۔ عہد وسطی کا معیار اتحاد پھر بھی قائم ہے اور قبل اس کے کہ یہ معیار سیاسی طور پر پر اثر ثابت ہو اس سے تمام اقوام یورپ کو اور بھی زیادہ آگاہ ہونا چاہئے۔ اس کے ان ممکن الوقوع قبائح سے اس کی حفاظت کرنا نہایت ضروری ہے جو ایسی حالت میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں جب یورپی تہذیب کا دوسرے ممالک کی تہذیب کے ساتھ مقابلہ کرنے سے یورپی اقوام کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے اور وہ اس بات کا گستاخانہ مطالبہ کرنے لگیں کہ چونکہ وہ خود تمام طبقہ انسان سے برتر و فائق ہیں اس لئے تمام عالم میں انہیں کی حکومت کا علم ملند ہونا چاہئے۔

نظام جاگیر پر خیالات کا اظہار

غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ جاگیری طریقہ پر ابھی تک ذرا بھی بحث نہیں

کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہمیں تمام سیاسی معیارات کیا بلکہ مغربی یورپ کے اہم نصب العین سے مطلق سروکار نہیں ہے۔ ہمیں تو مطلب ہے ان معیاروں سے جو فی الحال کسی نہ کسی صورت سے بہ حیثیت معیار کارگر رہ رہے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان تمام معیارات کا تذکرہ کریں کہ جو کسی زمانہ میں بھی سود مند ثابت ہوئے ہوں ہم صرف موجودہ سیاسی معیارات پر تاریخی نقطہ خیال سے تنقید کرنا چاہتے ہیں اور ایسا کرنے سے موجودہ واقعات کا مکمل تذکرہ نہیں ہوتا بلکہ موجودہ مسائل کے متعلق بحث پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ نظام جاگیر سے اس وقت بھی ہمارے سیاسی دستور اور فطریہ پر اثر پڑتا ہے ہم معاشرتی فرقہ بندیوں اور طریقہ زمینداری کو پس پشت نہیں ڈال سکتے جن کی نوعیت و حقیقت جاگیر سے نہیں تو کم از کم ایسی تو ضرور ہی ہے جو جاگیر داری کے فوری نتائج کی وجہ سے بنی ہے۔ سیاسی تاریخ پر پوری بحث کرنے میں جاگیر سے نظام کو فطرتاً ایک نہایت اہم جگہ دی جائے گی کیونکہ جس حد تک زمانہ ماضیہ کا وجود عہد حال میں ہے طریقہ جاگیر ابھی تک کام کر رہا ہے اور ہم اس کو سیاسیات کا ایک جز و قرار دیکر اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

لیکن معیار کی حیثیت سے نظام جاگیر کا اب نام و نشان بھی نہیں۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ اب یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جاگیر ملکیت یا منصب کے پس ماندہ حصے کو کوئی شخص بھی سنجیدگی کے ساتھ برقرار رکھنا اور ترقی دینا چاہتا ہے۔ زمانہ وسطی میں ایک انسان کے دوسرے انسانوں کے ساتھ جو تعلقات تھے ان کے از سر نو قایم کرنے کے لئے کوئی عملی تدبیر سعی نہ کر سکے گا حالانکہ جیسی کہ دلیل پیش کی

جاچکی ہے کہ یورپ کے تمام قومی گروہوں کے تعلقات کا جو معیار قرون وسطیٰ میں تھا اس کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ نظام جاگیر کی کو نظر انداز کر لینے کی یہ وجہ نہیں ہے کہ اب کوئی شخص اس کا خواستگار نہیں۔ کیونکہ ہمیں صرف ان حقیقی قوتوں سے سروکار ہے جو زمانہ حال کو مستقبل میں بدل رہی ہیں زمانہ ماضیہ سے یہاں ہم کو اسی حد تک مطلب ہے جہاں تک اس کے ذریعہ۔ عہ زمانہ حال کو بہ شکل مستقبل تبدیل کرنے میں مدد ملتی ہے اور جس چیز کی اب ضرورت نہیں رہی اس کا موجودہ انقلاب میں ذرا بھی زور نہیں ہے خواہ عہد موجودہ نے اپنی یہ شکل اس وجہ سے اختیار کی تھی کہ ہمیشہ لوگ اس کے آرزو مند تھے۔

مگر ان تمام باتوں سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم جاگیریت کے طریقہ کو بوجھ یا ترقی کے لئے سد راہ قرار دیتے ہیں۔ اب معیارات ماضیہ پر کسی قسم کا فیصلہ صادر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہت ایسی چیزیں جو اب درکار نہیں ہیں ایسی ہیں جو بلاشبہ قرون وسطیٰ میں مناسب سمجھی جاتی ہوں گی۔

طریقہ جاگیر کا ذکر نہ کرنے کا منشا یہ نہیں کہ ہم اس کی مذمت کرتے ہیں لیکن بخلاف اس کے یہ مسلمہ نہیں تصور کر لینا چاہیے چونکہ یہ نظام قرون وسطیٰ میں موجود تھا اس لئے بہتر و خوب تھا۔ اکثر ایسی باتیں ہیں جو عہدہ بھتیں حالانکہ لوگ ان کے آرزو مند تھے۔ ممکن ہے کہ جاگیر کا نظام رکاوٹ لانے والا ہو۔ کیونکہ یہ طے شدہ ہے کہ زمانہ وسطیٰ کے اکثر دیگر معیارات غلطی پر مبنی در خراب تھے لوگوں کو ایسی چیزوں کی خواہش تھی جن کی خواہش ہونا نہ چاہئے انھوں نے ایسے دستوروں کے لئے جدوجہد کی جو خراب تھے اور انھیں حاصل بھی کر لیا اس لئے ہمارا یہ منشا نہیں کہ طریقہ جاگیر

کے حق میں یا اس کے خلاف فیصلہ صادر کریں لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اس کے متعلق دونوں میں سے کوئی نہ کوئی ایک فیصلہ طے ضرور ہونا چاہیے۔
 اس قسم کے بیان سے بظاہر یہ پہلو پیدا ہو جاتا ہے کہ کوئی خاص کسوٹی ایسی موجود ہے جس کے ذریعہ سے دستوروں کاموں اور معیاروں کے حسن و قبح کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اگر کلی طور پر نہیں تو زیادہ تر خراب دستوروں سے اچھے و سائیر کا امتیاز ان کے نتائج کے لحاظ سے اور بغیر کسی ایسے خیال کے کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک بھی دستور کا وجود دنیا میں کبھی تھا یا نہ تھا لیکن یہ ایک بڑا پہلو ہے اور اس پر ہم ہاں بحث نہیں کر سکتے۔

ہم نے اس کا ذکر محض اس وجہ سے کیا ہے کہ لوگوں کے دل پر یہ واقعہ بخوبی نقش ہو جائے کہ جاگیر داری کے طائفے کو فرو گذاشت کر کے ہم یہ جہت ماننا چاہتے ہیں کہ اس کے متعلق تاریخی اور اخلاقی دونوں قسم کے فیصلے ہو سکتے ہیں۔
 اس لیے اس کی فرو گذاشت سے ہم کوئی اخلاقی فیصلہ نہیں ملکہ محض ایک تاریخی تصفیہ تحریر کرتے ہیں۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ ہم دکھلائیں گے کہ نظام جاگیر سی احسن تھا یا قبیح۔ اور اس کے متعلق ذرا بھی ذکر نہ کرنے کا مدعا یہ نہیں کہ ان دونوں صفتوں میں سے کسی ایک صفت کا بھی اس پر اطلاق کیا جائے بلکہ موجود زمانے کے سیاسی تجربے کے ایک واقعہ کی حیثیت سے یہ کہا جاتا ہے کہ جاگیر داری کا طریقہ اب معیار نہیں رہا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ یہ طرز قرون وسطیٰ میں محض ایک مسلمہ واقعہ نہ تھا۔ جن معنوں میں اشتراکیت یا انفرادیت زمانہ موجودہ کا معیار

ہیں انہیں معنوں میں نظام جاگیر بھی ایک معیار تھا۔ لوگوں نے خالی یہ دیکھا ہی نہیں کہ معاشرہ کی تربیت سوردنی حیثیت کے اعتبار سے قائم تھی بلکہ وہ اس کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے بھی خواستگار تھے۔ یہ مصلحانِ وقت کو شکایت رہا کرتی تھی کہ ادنیٰ پٹی دار بھی اس حکومت کی اطاعت نہ کرتے تھے جو ان کے فائدے کے لئے کی جاتی تھی۔ نوہین باغی ہو رہے تھے اور سرداروں کے نظام نے بدظمی کی شکل اختیار کر لی تھی۔

لینگ لینڈ نے ارکانِ عہدہ یہ سے خطاب کر کے کہا ہے :-

”جاؤ خرگوش و لومڑی کا شکار کرو“ کیوں کہ وہ نواحِ ملک کو برباد

سے پاک و صاف رکھنے کے فرض سے غافل تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکمل نظام جاگیری کا ایک نہایت مختاط تحلیل پیدا ہو گیا جس میں شخص کو اس کی منزلت حیثیت معلوم رہتی تھی اور بڑے عہدیدار کو اپنی مہرت اپنے ماتحتوں کی خدمت کرنے کی وجہ سے حاصل تھی۔

ولیم مارس کا قول ہے کہ کوئی شخص اس قدر کافی طور پر اچھا نہیں ہے کہ وہ دوسرے کا مالک اور آقا بن سکے“

اور ان کے اس بیان سے جان و مال کے انقلاب اور زمانہ وسطیٰ کی اشتراکیت کا پتہ چلتا ہے علاوہ اس کے تصوری نظام جاگیری میں بھی ایک نہایت اعلیٰ اصول کی تلقین کی جاتی تھی اور وہ اصول یہ تھا کہ کوئی انسان اس قدر اچھا نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسان کا خدمت گزار بن سکے لیکن ایک رتبعِ ارمان اور ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے جو ننگدلی پر مبنی ہو جاگیر داری کا نقش اب صفحہ ہستی پر باقی نہیں ہے۔

چھٹا باب

نشأت جدیدہ کے دور کی فرانہوائی

(ب)

زمانہ حال کے سیاسی خیالات اور افعال میں خود مختار حکومتوں کے باہمی متصادم میں ایک عنصر غالب ہے۔ ہر ایک مملکت کی یہی خواہش رہا کرتی ہے کہ کسی نہ کسی صرح اس کو آزادانہ اور مکمل ترقی کا موقع حاصل ہوتا ہے اور دوسری قومیں اسکی برابر ہی نہ کر سکیں اس کی خارجی حکمت عملی یہ رہتی ہے کہ اپنے زمانہ کی تمام جماعتوں کے اختیارات مقرر کیا کیے۔

اس کیفیت کی تشریح یورپ کے زمانہ احیاء کی تاریخ کا ذکر کرنے ہی سے ہو سکتی ہے۔ متحدہ سلطنت روم اور قرون وسطیٰ کا اتحاد ان دونوں چیزوں کا نقش رفتہ رفتہ دکلا کے دل و دماغ سے بھی مٹ گیا۔ قبل اس کے کہ نظریہ ساز اصحاب کسی جدید معیار کے متعلق کوئی کیفیت مہیا کرتے باعلیٰ اشخاص نے اس خیال کو

بالائے طاقت رکھ دیا کہ یورپ میں واحد یورپی سلطنت ہونا چاہئے۔ بد میں گزریں کہ مختلف آزاد حکومتیں مثل انگلستان، فرانس، ہسپانیہ اور جرمانی اختلاف نیرا لالیہ میں قائم ہو چکی تھیں۔ اس وقت تک ان ملکوں کے حقوق کے متعلق کوئی واضح خیال نہیں پیش ہوا تھا جو نئی نئی قائم ہوئی تھیں مابراہن تعاون ایک ایسی سلطنت کی صرف زبانی مدح و ستائش کیا کرتے تھے جس کا وجود اس زمانے میں معیار کی حیثیت سے باقی نہیں رہا تھا یورپ میں اختلاف روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا اور جب بالآخر نصب العین صاف طور پر نمایاں ہوا تو وہ یہ نکلا کہ تمام یورپ میں شخصی بادشاہت ہونا چاہئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کہ یہ لفظ یعنی بادشاہت یا یورپ کے سیاسی میراث میں ملا ہے لیکن اس کا استعمال نہایت وسیع معنوں میں ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ نہایت ضروری ہے کہ اس میں دو تصور مضمربوں یعنی (۱) ایک آزاد اور مسلط حکومت بہ شکل بادشاہت کا اصول

(۲) جذبہ قومیت کی شروع شروع کی باتیں جس کا منشا یہ ہے کہ ہر ایک جداگانہ جماعت کو اپنی علیحدہ ترقی کے لئے موقع ملنا چاہئے۔

بہر حال ہم اس وقت آزاد مملکت کے متعلق یورپین نشاۃ جدیدہ کے معیار اور زمانہ حال کے اصول قومیت کے درمیان کوئی موازنہ نہیں کریں گے پہلے قوم نہیں بلکہ حکومت کا ذکر کیا جائے گا اور لوگوں کے سمجھنے کے لئے یہ بات چھوڑ دیا جائے گی۔ یہاں نسل۔ روایات بازبان کا نہیں بلکہ قانون اور مابراہن کے امتیازات کا ذکر ہے۔

سیاسیاتِ حالیہ میں معیار کی حیثیت

موجودہ زمانہ کی سیاسیات کا فرائز دو مملکتوں سے زیادہ تعلق ہے۔ اس بیان سے اولاً ہمارا یہ منشا نہیں کہ جن جن حکومتوں میں مسلط نظم و نسق قائم ہو وہ سب باہم دیگر ہمسایہ میں پہلے تو اس خیال سے عہد وسطیٰ کے اس تصور کی ترقی بدیتی ہے کہ تمام حکومتوں کا ایک سرِ شنبہ ہونا چاہئے۔ اس زمانہ میں کوئی بھی شاہی حکمرانی خواہ وہ کتنی ہی زیادہ طاقتور اور بڑی کیوں ہو مرتبہ میں کسی دوسری حکومت سے کمتر نہیں ہو سکتی۔ داخلی معاملات کے لحاظ سے ہر ایک مملکتِ کامل طور پر مکمل مطلق العنان ہے اور کسی نہ کسی مرکزی حکومت کے محکوم ہوتی ہے یہ ایک تکمیل شدہ امر ہی نہیں ہے بلکہ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک قابلِ تماشائ چیز ہے اور اس کو ترقی دینا چاہئے۔

اب مختلف ممالک میں قانون اور حکومت کے اختلافات اور خصوصیات کے خلاف کوئی شخص بھی آواز نہیں بلند کرتا ہے جیسا کہ مثال کے طور پر ڈینیٹی نے کہا تھا کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب کا دار و مدار کسی جداگانہ حکومتوں کے قیام پر ہوتا ہے۔

یہاں سے ایک بین الاقوامی قانون کا تصور پیدا ہو جاتا ہے جس کا تعلق مملکتوں کے باہمی رشتے کے ساتھ ہے لیکن اس سے کوئی ایسی طاقت قائم کرنے کا منشا نہیں ہے جو حکومتوں پر حاوی ہو کر ان کو اپنا مطیع بنائے

اس قسم کے قانون کی حیثیت اس وقت تک ایسے بیانات کے ایک مجموعہ سے کسی طرح زیادہ نہیں جو آئے دن پیش آنے والے واقعات یا قابل ستائش اور تمام غیر موثر ارمانوں کے بائے میں ہوتے ہیں۔ لیکن زمانہ حال کی سیاسیات میں اس احساس پر اعتبار کر سکتے ہیں کہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو کوئی مہذب حکومت کم از کم کسی دوسری مہذب مملکت کے ساتھ نہیں کر سکتی ہے۔

جس انسانیت کے خیال نے ایسی حکومتوں کے درمیان ہر قسم کی جنگ و جدل کا دائرہ محدود کر دیا ہے اس کی توسیع بہر حال اس سلوک تک نہیں کی گئی ہے جو وحشیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ سیاسی جذبہ بڑھتا ہے مگر نہایت سست رفتار کے ساتھ۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وحشیوں کے خلاف جابرانہ طور پر جدال و قتال کا سلسلہ جاری رکھنے سے ایک مہذب حکمرانی کی ذرا بھی وقعت نہیں رہتی۔ پھر بھی یہ ایک بہت بڑا فائدہ ہے ہم کو فرق کہیں نہیں نظر آ جاتا ہے اور ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ مملکتوں کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ ایما داری کے ساتھ شرائط معاہدات پر کار بند ہوں یا اگر جنگ و جدل کریں تو اعتدال کے ساتھ بہر کیف ہم فرض کرتے ہیں کہ اس قسم کے قوانین کی پابندی سب مملکتوں کے لئے لازم ہے خواہ کوئی ایسی حکومت موجود ہو یا نہ ہو جو ان قوانین کو نافذ کرے۔

اس کے علاوہ سیاسیات خارجہ میں ہم یہ ہمیشہ خیال کرتے ہیں کہ طاقت کا توازن یا اس سے ملتی جلتی کوئی نہ کوئی چیز ضرور قائم ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر کوئی حکومت سب سے زیادہ طاقتور ہو جائے خواہ اصولاً وہ دوسرے کے بقا بلے مرتبہ میں برابر ہی کیوں نہ ہو تو اس کی قوت زیادہ ہو جائیے دوسروں کی آزادی

سلب ہو جانے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ نظری آزادی ایک بیکار شے ہو
تا وقتیکہ اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کا اختیار نہ حاصل ہو سکے
اور اگر کہیں کوئی مملکت جنگی یا معاشی طاقت کے اعتبار سے افضل تر ہو جائے
تو کوئی دوسری حکومت اپنا نظم و نسق اپنی مرضی کے مطابق ہرگز نہ کر سکے۔ مگر اس
امر سے قطع نظر کر کے کہ کوئی مملکت واقعی حملہ ہی کر بیٹھے یا اس کو فتح حاصل ہو جائے
جس حکومت کا بھی اثر یورپ میں غالب ترین ہے اس کی وجہ سے تمام مقامی
اختلافات کا انسداد ہو جائے گا۔ اس لئے موجودہ معیار یہ ہے کہ ہر ایک
فرمانروا حکومت کو تمام دیگر حکومتوں کے ساتھ یکساں اور مساوی تعلق رکھنا اور
ہر ایک حکومت کو اپنی مرضی کے مطابق ترقی کرنا چاہئے۔ نیز کوئی ایسی
طاقتور حکمرانی ہرگز نہ ہونا چاہئے جس سے دوسری حکومتوں کی آزادی کو
ضرر پہونچنے کا اندیشہ ہو یہ معیار اس وجہ سے ہے کہ ابھی تک مدبروں کا
یہ کام کر رہا ہے کہ حالات وقت کو ان کی موجودہ صورت میں برقرار رکھکر ان کو فروغ
ترقی دیں اور حالانکہ ایک معمولی رائے دہندہ کی سمجھ میں یہ بات مشکل سے آسکتی
ہے۔ اس سے بظاہر یہ خطرہ معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کسی روز غیر ملکی مٹابعت کا
سامنا نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں رائے دہندہ کے ذاتی طریقہ قانون
اور حکومت کے تحفظ کامل کی خواہش بھی مضمر ہے۔

عہد گذشتہ میں فرمانروائی کا نصب العین

اس معیار کے معنی یا اس کا پیشرو قیاس دریافت کرنے کے لئے ہم کو

اس زمانہ ماضیہ پر نظر ڈالنا پڑے گی۔ جب قرون وسطی کے طریقہ خیال و عمل کا زوال ہو رہا تھا۔ یہ تبدیلی یکایک نہیں بلکہ تدریج واقع ہوئی تھی۔ اس کے مود کا کسی کو احساس بھی نہیں ہوا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ مابوجودیکہ احیاء یورپ کے زمانہ میں فلسفہ کو معلوم تھا کہ دنیا سے خیال میں ایک عظیم انقلاب واقع ہو رہا ہے اور مابوجودیکہ ان علماء جو ہسپو دی خلافت کے جو یا تھے تہذیب کی نمایاں ترقی کے معاملے میں خود کو ایک غیر مطلوب اہمیت دے رکھی تھی اور جانبازوں نے ہم کے ذریعہ نئی دنیا میں دریافت کر لی تھیں مگر اس بات کا کسی کو علم نہ تھا کہ قبائل کی تقسیم کے بجائے جو قیام اتحاد کی مبہم آرزوؤں کے زیر اثر واقع ہوئی تھی۔ یورپی اقوام میں ایک مکمل قطع تعلق ہو جائے گا اور فی الواقع یہ ایک نہایت عظیم الشان سیاسی انقلاب تھا۔

اس تغیر کا اس وقت تک کسی کو بھی علم نہ تھا جب تک یہ ظہور پذیر نہیں ہوا صرف اس وقت اس تکمیل شدہ واقعہ کا عذر دریافت کرنے کی سعی کرتے کرتے سیاسی مدبروں کو ایک جدید معیار کے اعلان کرنے کی نوبت آگئی۔

پہلی ضرورت یہ تھی کہ قومی امتیازات یا قانونی انفاط میں سماروا حکومتوں کو تسلیم کیا جائے یعنی مدبر اور قانون داں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اس زمانہ میں سیاسی طور پر خود مختار جمہوروں کا وجود تھا جن کے تعلقات باہم دیگر جاگیریں نہ تھے۔ سلطنت زمانہ وسطی کے فطریہ کے مطابق ان کی تشریح نہیں ہو سکتی تھی۔ گویا جمہوروں کے اغراض کے امتیاز پر جدا جدا حکمرانیوں کے قیام کا داع و داء تھا۔ لیکن جمہور کی وقعت رعایا سے محکوم سے ذرا بھی زیادہ نہیں سمجھی جاتی تھی مختلف حکومتوں کو باہم گفت و شنید کا بند و بست کرنا پڑتا تھا لیکن کسی شخص کے دل میں یہ شبہ نہیں پیدا ہوا تھا

کہ مملکت باشندوں کی تھی نہ کہ حکام کی۔ متفقینوں کا خیال تھا کہ حکومت بادشاہوں کی تھی یا کم از کم ایک سسلطہ عہداری کا نام حکومت تھا یہاں پر جیسا کہ موجودہ زمانہ میں آج ہے معیار قومیت کی جھلک ضرورتاً قومی اصول قوانین میں نمایاں تھی اس کا سبب یہ تھا کہ جو فرق قوم اور حکومت کے مابین ہے اس پر کسی نے غور نہیں کیا تھا۔ ابھی تک یہ فرق نہایت اہم ہے اور اس کی اثرِ زمانہ اسیاے یورپ میں ہوئی تھی۔ مگر اس وقت بھی یہ عہد ماضیہ کے برابر نہ امتیازات کے ترکے میں حاصل ہوا تھا۔ تاؤنیکہ مملکت قومیت کے قدرتی اختلافات کو تسلیم نہ کرے۔ ممبروں کو اس کی وجہ سے ہمیشہ الجھن ہونی ہوگی عام طور پر قوم کا منور فطرتی ہوتا ہے۔ یہ ایسے متعدد خاندانوں یا افراد کا ایک مجموعہ ہے جن کے روایات یکساں ہوں۔ لیکن حکومت نام ہے ایک منظم عہداری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مملکت ایک منظم قوم ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک قوم کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ایک ایسے نظام حکومت کے ماتحت ہو جو خود اس کا نہ ہو۔ اس امتیاز کے باوجود اس زمانہ حال میں ہمارا قیاس یہی ہے۔ لیکن نشاۃِ جدیدہ کے ممبروں کو یہ امتیاز نظر نہیں آتا اور نہ اس وقت محکموں کی کثیر تعداد کی سمجھ میں آیا تھا جو حکمران کے نقشِ قدم پر چلتے یا حکام کے تابع ہوتے تھے کہ ہر قوم کے آزاد ہونے کے حق اور ہر قوم کو اپنی خود حکومت اختیار کرنے کے حقوق میں کیا فرق ہے۔ اس لئے اجارہ یورپ کے زمانہ کی فراہم ہونی قومی معیار نہیں بلکہ حکومتی معیار تھی۔ لیکن موجودہ قومیت کا جو معیار بعدہ قائم ہوا اس زمانہ کے نصب العین میں بھی موجود تھا۔ اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ اس زمانہ میں قومی جذبہ موجود ہی نہ تھا۔

چودھویں صدی کے فرانس اور انگلستان میں صاف طور پر یہ جذبہ بحیثیت

لیکن یہ قومی جذبہ تسلط یافتہ اور مستحکم خاندانوں اور اقتدار حکومت کا حامی تھا۔

معیار کی حیثیت بہ لحاظ واقعات

زمانہ وسطی کے آخری حصے میں یورپین تہذیب کے مختلف گروہ کافی طور پر نمایاں تھے حالانکہ اس وقت تک کوئی ایسا اصول موجود نہ تھا جس کے مطابق ہر ایک گروہ کو خود مختار فرما زردائی کا حق دستیاب ہو کر رہا ہے۔ جب عالمگیر طاقت محل کرنے کی سعی تبلیغ میں بوئی فیس شہتم کو قانون انگلستان اور فرانسیسی تاجدار کی سپاہانہ چابکداری سے شکست نصیب ہوئی اس وقت یہ ظاہر تھا کہ سیاسیات میں نئی نئی قوتوں کا نمود ہو گیا ہے۔ حکومت انگلشیہ اور حکومت فرانس ان دونوں کا وجود جدا جدا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کی زندگی اپنے اپنے علیحدہ طرز کی تھی۔ اس کے بعد پھر جس زمانہ میں ستر سال تک پاپا کی حکومت رونیاں میں رہی اور پاپا براہ راست فرانسیسی تاجدار کے زیر اثر تھا۔ اس وقت یہ ظاہر تھا کہ قدیم اصول عالمگیری اور جدید فرانسیسی مملکت کے مابین ایک مقابلہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ ثانی الذکر نے ازمینہ وسطی کی مذہبی حکومت کے غفلت و اقتدار پر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد مغرب کی مذہبی جنگ و جدل چھڑ گئی جس میں اہل اطالیہ مذہبی حکومت کے لئے فرانسیسیوں کے خلاف صف آرا تھے جو قومیں نئی نئی بنی تھیں ان میں سے کچھ ایک فرقہ کی حامی ہوئیں تو کچھ نے دوسرے فرقہ کی کمک کی۔ انگلستان اور جرمنی پاپائے روم کے جانب دار تھے اسکاچینا اور فرانس نے پاپائے ادینان کی حمایت کی۔ ان جداگانہ سیاسی گروہوں کے متعلق یہ واقعات اہم ہیں جنہیں اس زمانے میں اقتدار حاصل ہو رہا تھا۔

ہمیں مقامی فرانزوائی کی فریڈ مشالوں کا حوالہ دینے کی چند اہم ضرورت
 نہیں جو بعد کے زمانہ احیاء یورپ کی تاریخ میں مل سکتی ہیں۔ فرانسیسی بادشاہوں نے
 بہت جلد ایک زبردست مرکزی حکومت قائم کر دی۔ انھوں نے اس عام مگر تمام
 تر قومی جذبہ سے کام لیا کہ جاگیرداروں و نوابوں کو اختیار سے محروم کر دیا
 جائے اور بالآخر سترہویں صدی میں انھوں نے جذبہ عمامہ کو پامال کرنے کی کوشش
 کی۔

یورپ کے نشاۃ جدیدہ کے دور میں حکمرانی کا آخری درجہ فرانس میں
 حاصل ہوا جب حکومت اور بادشاہ کی مستی ایک ہی سمجھی جاتی تھی جیسا کہ لوئی چہارم کے
 زمانے میں ہوا تھا۔

لیکن تاریخ انگلستان میں چودھویں اور پندرہویں صدی کے درمیان جو واقعات
 ظہور پذیر ہوئے ہیں ان میں بھی وہی منازل اور مدارج نظر آ سکتے ہیں۔ معمولی قدیم
 طریقہ کے مطابق غیر ملک والوں کے خلاف جدال و قتال ہونے کی وجہ سے ایڈورڈ
 سوم اور ہنری پنجم کے دور حکومت میں یہ قومی جذبہ رفتہ رفتہ تیار ہوا اور اسی جذبہ
 کو بنیاد قرار دیکر ٹیوڈر خاندان والوں نے عوام کی یا قومی حکومت نہیں بلکہ زمانہ احیاء
 کی طرح بادشاہت قائم کر دی۔

ہسپانوی بیڑہ کا واقعہ شاید قومی جوش و خروش کا محل تھا۔ لیکن
 چالاک خاندانی مدبروں نے اس قومی جوش و خروش کو نہایت سرعت کے ساتھ
 شخصی حکومت کا حامی بنا دیا حتیٰ کہ ۱۶۴۳ء سے ۱۶۸۸ء کے زمانے کے سیاسی
 انقلاب میں شخصی حکمرانی کے بجائے جمہوری آزادی کے اصول کی واقعی تقدیر

ہونے لگی تھی۔

ہسپانیہ میں صدرت حالات زیادہ دشوار گزار تھی۔ کیونکہ شہروں اور مقامی جاگیروں کی زمانہ وسطی کے طرز کی زندگی کے علاوہ وہاں فرڈیننڈ اور ازابیلا کی بادشاہت میں زمانہ احیاء کے طور پر ایک غیر ملکی نسل اور حکومت موجود تھی۔

دوسرے مقامات کے بمقابلہ ہسپانیہ میں اتحاد جمہور کا دار و مدار ایک بادشاہ کی واحد حکومت پر تھا اور جب تک نیپولین کے زمانہ کا انقلاب عظیم نہ برپا ہوا اس وقت تک ہسپانیہ کے قومی ارتقاء میں کچھ ہوتی رہی۔

اطالیہ میں نشاۃ جدیدہ کی فرمانروائی سے مقامی حکومت کے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے جس کی وجہ سے یکساں سبباً زبان اور روایات رکھنے والے اقوام میں تعلق کی واقع ہو گئی اور جرمنی میں بھی اسی نقطہ نیل کے سبب سے ایسا تفرقہ پیدا ہو گیا جس سبب سے آئے دن خٹک و جدل ہونے لگی۔ جیسا کہ نیپولین کے زمانہ میں ہوا تھا۔ غیر ملک والوں کو نہایت آسانی سے فتح حاصل ہوجاتی تھی لہذا آگبر کا کے قول کا منشا یہ ہو گزرتھا کہ ہر قوم کو اپنے طرز کا مذہب اختیار کر لینا چاہئے بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر ایک ضلع کے لئے اپنے فرمانروا کے دین و ایمان کی پیروی مناسب ہے۔ اس میں حکومت کے اعتراض کا نہیں بلکہ مقامی تاجداروں کے مفاد کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اس طرح جب اٹھارویں صدی میں انگریزی اور فرانسیسی حکومتوں نے متعدد اقوام کو شہتہ اتحاد سے منسلک کر دیا تھا اس زمانہ میں جرمن قوم کئی مملکتوں میں منقسم تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نشاۃ جدیدہ میں فرمانروائی مقام جغرافیہ اور نسل کے نقطہ خیال کے مطابق کس قدر جداگانہ افراتفری

ایک جائز تجویز اور جاہلانہ غیر قومی خاندانی تقسیم کے لئے ایک تادیبی عذر مٹتی

زمانہ احیاء کے نصب العین کی تشریح

ہماری بحث کے مطابق جو کچھ بھی واقعات ظہور پذیر ہوئے وہ کسی سیاسی ضرورت کی بہم رسانی کے سبب سے ہوئے ہوں گے جس محدود صورت میں اس کا قیاس کیا گیا تھا یہ سیار اس میں بھی ضرور ایک قوت محرکہ رہا ہوگا۔ لیکن یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ لوگ اس با خواہش کو جمہور کی اصلی فرمانروائی نہیں سمجھتے تھے اور بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ زمانہ احیاء کے ناجدار اور غمخوار اے یہ خیال کرتے تھے کہ ان کو اپنی منزلت سعایا کی صفی سے حاصل ہے۔ پھر کن معنوں میں اتحاد کے لئے زمانہ وسطی کی خواہش کے بجائے جدید نصب العین قائم کر کے سیاسی ضرورت فراہم کی گئی تھی؟ مگر ضرورت مہیا کی گئی تھی ایک زبردست مرکزی حکومت کی۔ لوگ اپنے فرمانرواؤں کو ان کے صوبہ خاطر ہر قسم کے حقوق دینے کے لئے رضامند تھے تاکہ ملک مقامی امرار کی دوامی مخالفت سے آزاد ہو جائے۔

یہ امر بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اتحاد کے متعلق وسطی کا جو قیاس تھا اس کا وجہ سے سیاسی طاقت نہایت چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو گئی۔ اگرچہ انتہائی دنیوی اقدار کے متعلق لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ ایزد تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایک انسان پر نازل ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت اصلی سیاسی طاقت ہشمار مقامی نوابوں کے قبضہ میں تھی۔ اس طرح ہم زبان اور ہم روایات اقوام نے جو نادانستہ طور پر اتحاد کی

جسٹیس مائل تھے۔ خود کو اپنے ملک کی قیمتی تقسیم کے خلاف پایا۔ بادشاہ یا فرمانروا انٹر کے پیچھے سے دائمی رہائی حاصل کرنے کے لئے ایک وسیلہ قرار دیا جاتا تھا۔ اس طرح انگلستان میں گلابوں والی جنگ کے بعد ٹیوڈر خاندان کی بادشاہت رہی اور جیسا کہ میکملڈ کا خیال تھا۔ فرانس میں بادشاہ عوام کو اثرافہ کے خلاف کام میں لاتے تھے۔ یادافہ حال کے الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں جمہور نافستہ طور پر امرار کے خلاف بادشاہ سے کام لیتے تھے۔

اس طرح اطالیہ میں بھی میڈیکی اور دیگر خودسروں نے جماعتوں کی پیہم ہدوگیر کے بجائے کم از کم ایک اتمراسی حکومت جیسا کر کے ایک بڑی ضرورت کا فقیہ کیا۔ ہم یہ فرض کرنے سے قاصر ہیں کہ مقامی بادشاہت کے قیام اور نفاق و خدائی سے اپنی آزادی حاصل کرنے کی غرض سے لوگ کسی بادشاہ یا شہزادے کو تختین کرنے کے لئے متفق الرائے ہوتے تھے۔ اس طرز عمل سے ناواقفیت تھی مگر اس کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ عوام واقعی لوہوں کی لڑائیوں یا جماعتوں اور حالات کی کشمکش سے تنگ آگئے تھے۔ اس وقت ایک جاگیر کے مالک کی شہگامی طاقت یا کسی ایک جماعت کی موقعی کامیابی سے مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ مقامی مرکزی حکومت کا آغاز ہو گیا تھا اور یہ دستور اس قابل تھا کہ اس کی نشوونما کی جائے۔ اگر جمہور کو تباہا جاتا تو ان کو یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ جس وقت انہوں نے خود کو بادشاہ کے حوالہ کر دیا تھا تو انہوں نے کس قدر اختیارات اپنے ہاتھ سے نکال دیے تھے۔ جیسا کہ آگے چل کر دیکھا جائے گا۔ ارباب فہم نے ان کو یہی نصیحت دی تھی کہ اپنے تمام اختیارات کا بادشاہ کے حوالہ کر دینا ان کے لئے بہتر تھا۔ انقلاب فرانس کا ہم پر اس قدر اثر

پڑا ہے کہ ہم یہ بات کسی طرح پسند نہیں کر سکتے کہ محکوم جماعت اپنی کل طاقت و اختیار
 غیر کے حوالے کر دے۔ لیکن اجباریورپ کے زمانہ تک تجربے نے ہم کو یہ نہیں
 بتایا تھا کہ شہزادوں کی حکمرانی پر کون کون سے تیود مادہ کا پڑے تھے۔
 اس لئے یہ تاریخ ایسی غیر سنجیدہ خود سر حکومت کی نہیں ہے جو قومی حقوق و اساس
 عامہ کی پامالی کے لئے قائم کی گئی ہو۔ لہذا زمانہ اجبار پر تبصرہ کرنا گویا بار و سمو
 کے متعدد و معلومات پر نظر ڈالنا ہے۔ یہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت ایک
 نہایت مطلق العنان فرمانروا کی ذات سے عوام کی ضرورت پوری ہی ہوتی تھی اور
 لوگ شرفایا جماعتوں کو باہمی کشمکش اور جنگ و جدل سے عاجز ہو کر خود سر بادشاہ
 کو عھدا و اصولاً اپنا فرمانروا تسلیم کرتے تھے۔ گویا زمانہ وسطیٰ میں شہنشاہ کو
 "طل الہی کا شرف پانے کا جو حق حاصل تھا وہ دور جدیدہ کے بادشاہوں اور
 شہزادوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

اس بات کے بڑے بڑے ثبوت ملتے ہیں کہ اس زمانہ میں بادشاہ کو خدا
 حق حاصل تھا یعنی وہ حکومت کرنے کے لئے باری تعالیٰ کی بارگاہ ازلی سے مقرر
 کئے گئے تھے۔ زمانہ وسطیٰ میں شہنشاہ براہ راست رب العالمین کی طرف سے مقرر
 ہو کر دنیا میں آتا تھا اور اب یہ بات زمانہ اجبار کے تاجداروں کو حاصل ہو گئی گویا یہ
 اصول کہ بادشاہ کی حکومت خدائی حکومت ہے یا یہ کہ بادشاہ خدا کے تعالیٰ
 کی طرف سے داد جہا نہائی وینے کے لئے دنیا میں نزول پذیر ہوتا ہے۔ قریب
 قریب دونوں زمانوں میں یکساں رہا۔ اس طرح طرہ شہنشاہیت مقامی تاجداروں
 نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کلیسائی نظام کے سلسلے میں دوران قرون وسطیٰ

شہنشاہ کو چوچیدہ حیثیت حاصل تھی اس کو شاہان انگلستان نیز فیصلہ جرنی نے اختیار کیا اور خوب ترقی دی۔

ایسے گروہوں میں بھی اندرونی تفرقات کی دبا نمایاں تھی جو ایک خون ایک زبان اور یکساں روایات کے لحاظ سے قائم تھے اور اگر کچھ مبہم سی امید اس کے وسیعہ کی تھی تو وہ یہ تھی کہ کسی نہ کسی قسم کی مرکزی حکومت قائم ہو جائے لیکن دور احیاء کی تحریک کا ایک اور بھی پہلو تھا۔ حکومت مضبوط اور مرکزی ہی نہیں بنادی گئی تھی بلکہ وہ مطلق العنان تھی اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی آزاد ریاستیں ظہور پذیر ہو گئیں۔

نشاة جدیدہ میں یورپ منقسم اور غیر متحد کیوں تھا؟ اس کا کچھ تو سبب یہ ہے کہ زمانہ وسطی کے کلیسہ اور سلطنت دونوں اسی شخصیت کی مخالفت کرتے تھے جس کے ہاتھ میں مقامی حکومت کی عثمان ہوتی تھی۔ سیاسی نقطہ نظر سے سلطنت کمزور تھی لیکن خاص اصول اطاعت کے اعتبار سے متحد می شہزادوں کے اختیارات کا جو دستور تھا اس کی وجہ سے واقعی جہاں تک مقامی اختیارات کے عمل درآمد کا سرو تھا سیاسیات میں ہرج و مرج واقع ہوتا تھا۔

ایسے دستور کی جنگی ضروری تھی جس سے حکومت کے بددبہ و اقتدار میں کمی واقع ہوتی تھی۔

اس وجہ سے خود مختار فرمانرواؤں میں مساوات مطلق کے قیام کی تحریک کیستند نہ بھی رنگ لئے ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ایک نیا اصول کلیسا ئی قائم ہو گیا جس سے جدید سیاسی معیار کی بنیاد متواتر ہوئی تھی۔

مختلف مذاہب کے اصلاح و نظام سے واقعی مختلف ریاستوں کے قیام پر اثر پڑا تھا۔ لیکن سیاسی معیار کے دریاخت کے لئے یہاں یہ ضروری نہیں ہے کہ سیاسی نقص سے آگے نظر ڈالی جاسے۔

فرانس میں بھی مذہب کو جو برائے نام رومن کیتھولک اور اسی وجہ سے زمانہ وسطی کا تھا (کیونکہ یہ دیگر مذاہب کے خلاف تھا) درحقیقت عالمگیر ہونے کا فخر حاصل نہ رہا۔

بحث طلب کیتھولک ملک ایک قسم کا ریڈیٹنٹ عقیدہ دوسری شکل میں ہے اور نظام مملکت مکمل مقامی حکومت کی بہبودی کے لئے ان میں سے کسی ایک عقیدہ کو اختیار کر سکتا ہے۔

سیاسی نصب العین انہا کام کرتا رہا۔ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں اصولاً بھی ایک حکومت دوسری حکومت کو اپنا طبع نہ بنا سکتی تھی۔ یہاں متعدد مساوی خود مختار ریاستیں قائم ہو رہی تھیں۔ کیونکہ قانون کی حفاظت اور مقامی اعتراض کا یہ اثر انتظام محض یہی طریقہ اختیار کرنے سے ہو سکتا تھا۔

یہ ہے علامت معیار کی جو اس زمانے کے واقعات سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہ واقعات عوام کے نیم ساختہ ارمانوں اور باطل مدبروں کے محدود خیالات کی وجہ سے رونما ہوئے تھے۔ اس زمانہ کی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں باخبری کے ساتھ وحی ذرائع اختیار کئے گئے ہوں جو ایک بخوبی سوچے سمجھے مقصد کے حصول میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ تحریک ایک بدنما تجربہ ہے جو غیر مستقل خواہش کے زیر اثر کیا گیا تھا لیکن بہہ وجہ معیار اس زمانہ میں بھی شروع سے آخر تک ایک محرک قوت

روا ہے جس کو یا تو لوگوں نے محسوس نہیں کیا یا جو غلط طریقہ سے ظاہر کیا گیا۔

علم و ادب میں نصب العین کا بیان

معاصر ادب باب فہم نے اپنی تصنیفات میں مقامی اغراض کے امتیازات تسلیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال ان کے ایسا کرنے سے زمانہ احیاء کے معیار کی ایک دوسری جھلک دکھائی دیتی ہے۔ نشاۃ جدیدہ کے ابتدائی دور کے علم و ادب میں نیکوئیں ڈی کیوسا کی تصنیف تھا یہ رجحان پایا جاتا ہے۔ جس صحیفہ میں نفاقِ یورپ کے خلاف شکوہ بنیاں کی گئی ہوں اس کا نفس طلبی ہی ہے کہ مختلف اقوام اس لئے بنائے گئے ہیں کہ وہ عدالت میں خدا سے انصاف کے سامنے جداگانہ خیال پر بحث کرنے کے لئے اپنا اپنا ایک نمائندہ بھیجا کریں۔ اس طرح جوہن انگریز، فرانسیسی اور اہل اطالیہ کے متعلق عربوں اور ترکوں کے ساتھ ساتھ جداگانہ خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ایک انگریز اگر دستوراً نشاۃ ربانی کاشا کی ہے تو ایک عرب معیبت کے خلاف شکایت کا دفتر کھول کر رکھ دیتا ہے۔

تو سائنس کو اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ مقامی امتیازات کے سبب قدیم زمانہ وسطی کا مسلک عالمگیریت قریب قریب نامکمل ہو گیا تھا۔ بہر حال میں اس کا منشاء اس کے سوا اور کچھ نہیں جس طرح کہ قدیم زمانے میں مختلف قبائل کے باہمی امتیازات کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اس زمانے میں مقامی امتیازات کی وقعت کی جاتی تھی۔

درحقیقت یورپ کے مختلف حصص کی حکومتیں خود مختار تھیں لیکن نظری طریقہ پر اس وقت تک جائز اور درست نہیں نظر آتا ہے۔۔۔۔۔

... جب تک شہنشاہ میں چین بوڈن نے اپنی کتاب جس کا نام دولت عامہ کے چھ ستون تھنیں شائع کی تھی۔ جو قیاس حکومت کے متعلق اس میں ظاہر کیا گیا ہے ہم کو اس کی تفصیلات سے یہاں غرض نہیں یہ کچھ نور وایتی ہے اور کسی حد تک مشاہدہ شدہ واقعات کا ایک مدلل بیان ہے لیکن اس کتاب میں فرارزوا کے خیالات کی تشریح پر ساری کوشش صرف کر دی گئی ہے۔

حکومت کا مقصد اور ماتحت طبقوں کا وجود بالکل آئینہ ہے جو اس کتاب کے آٹھویں باب میں درج ہے۔ بہر نوع فرارزوائی کے عمل سے کام لیا گیا ہے جو اس مباحثہ کے پہلے لکھے گئے ہیں۔ جس میں اس کے معنی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور کل کتاب سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ فرارزوائی دو اجزاء پر منقسم ہے۔

(۱) خود مختاری (۲) ان جمہور تنظیم کی قدر قیمت جو با اقتدار ہوتے ہیں۔ بوڈن نے جو تئیس دلائل دیے ہیں ان میں بھی مذکورہ بالا امر کا اعتراف اس طور پر کیا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہو جائے کہ کمال خود مختار حکومتوں کا اس زمانہ میں وجود تھا اور یہ عمدہ سمجھی جاتی تھیں۔ بوڈن کی نظر اس خلیج اختلاف پر بھی ہے جو اس زمانہ کی معاشی حکمرانی اور زمانہ وسطیٰ قدیم شہنشاہی اختیارات کے درمیان واقع ہے۔ حالانکہ زمانہ احیاء کے طریقہ کے مطابق وہ کئی مساوی تاجداروں کے درمیان صرف ایک شہنشاہ کا رختہ قائم کرتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ حکمرانوں کے معاہدہ کرنے کے اختیارات کا مدعا یہ ہے جو اس زمانے میں تسلیم کیا جاتا تھا کہ کسی جد اجداد اطاقتوں کو حکمرانی کے حقوق حاصل تھے اور ان کو سلطنت سے کچھ تعلق نہ تھا۔

بعض اصحاب غلطی سے یہ تصور کرتے ہیں کہ سوٹنز لینڈ کے کینٹون کا شمار

ایک ہی حکومت میں ہے۔ حالانکہ تعداد میں وہ تیرہ ہیں جن کی جدا جدا فرمانروائی ہے لیکن ایسا کہنا گویا دور جدیدہ کی سیاسی زندگی کے ایک جدید پہلو کو ایک عمدہ شکر قرار دینا ہے جس کی مزید ترقی ہونا چاہئے۔

شانیا کامل اور دوا می طاقت کو حکمرانی کہتے ہیں اور یہ قول باؤن کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مراد یہ ہے کہ مقامی حکام کے متعلق انتظامی انجمنوں یا مقامی اغراض کو ایسے مقصد کے ماتحت کر دینا چاہئے جس کے لئے تمام گردہ منظمہ قلم ہے۔ ہم یہ مسلمہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ طاقت ایک آدمی کے ہاتھ میں ہوتی ہے حالانکہ اصولاً یہ جماعت عامہ کے قدرت میں ہو سکتی ہے۔ اس طرح اصطلاحات کی ایک غیر محسوس تبدیلی سے مملکت کا امتیاز فرمانروائی کا پہلو اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ہے ایک تعلق اور مرکزی طاقت کے معیار کی صورت جو دوران زمانہ آجیا رائج تھا اور بارشانی ہیں وہ نقص نظر آ سکتا ہے جس کے مقابلہ میں اس نقطہ خیال پر زور دیا جاتا تھا۔

مقامی قوانین۔ نوابوں کی حکومت اور جمہوروں کے اندر دستوروں اور اغراض کے اختلافات ان باتوں کے سبب سے جو روایات جاگیریت کی میراث تھے ایک مطلق اور غالب ترین مرکزی طاقت کو مہذب زندگی کی اصلی بنیاد تصور کرنا ہی بہتر سمجھا جائے گا۔

کسی مساوی یا فائق شخصیت کی رضامندی نہ لے کر قوانین وضع کرنے کا اختیار فرمانروائی کی علامت ہے اور اسی میں صلح و جنگ کا بھی اختیار شامل ہے اگر جیسا کہ انگلستان میں ہوتا ہے بعض اوقات باشندوں سے مشورہ کیا جائے تو اس سے حکمرانی کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ اس میں شک بھی نہیں کہ

”اشد ضرورت کے موقع پر بادشاہ کو باشندوں کی رضا حاصل کرنے کے لئے توقف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

معلوم ہوتا ہے کہ بوڈن کا منشا یہ ہے کہ ان واجزائیں سے اس جزو کا منود ہونا چاہئے جس کا تعلق مملکت کے اندرونی انتظام سے ہے۔
 ہیوگو ڈی گروٹ نے اس کے بعد جو کتاب تصنیف کی ہے اس میں فرما دیا ہے کہ دوسرے جزو یعنی ”با اقتدار جمہوروں کے مساوات و خود مختاری“ کی نہایت واضح طور پر تشریح کی گئی ہے۔

اس کتاب میں یورپین نظام حکومت کے متعلق ایک بہت بڑی پیشقدمی کی گئی ہے لیکن یہ معیار محض مصنف ہی کا معین کیا ہوا نہیں بلکہ وقت نے اس کے تعین میں خاص طور پر حصہ لیا ہے۔

اس دلیل کی تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ دکھانا صرف یہ منظور ہے کہ اقتدار اعلیٰ کا قیام کس طرح ہوتا ہے۔ غور کرئیے یہ معلوم ہوگا کہ دیگر نصب العین کی طرح اس معیار میں بھی دو بیان شامل ہیں اولاً ڈی گروٹ نے جداگانہ فرمانروا مملکت کے حقیقی دجو کو تسلیم کیا ہے اور دوم اس قسم کی حکمرانی کو قائم رکھکر اس کے منود کا خواستگار ہے۔

کتاب کا آغاز اس بیان سے ہوتا ہے کہ مقننوں نے پیشتر (۱) ایک ایسے قانون کے متعلق جو تمام انسانوں کے لئے عام مواد (۲) ایسے قانون کے لئے جو ہر جماعت کے لئے مخصوص ہو غور کیا ہے۔ لیکن کسی نے ابھی تک اس تعلق پر نگاہ تعمق نہیں ڈالی ہے جو تمام گروہوں کے درمیان قائم ہے۔

اقدار اعلیٰ کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ یہ وہ سیاسی طاقت ہے جس کی کارروائی کسی دوسری طاقت کے ماتحت نہیں ہوتی۔
جس مملکت کو اس قسم کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں وہ لازماً کبھی جلتی ہے جس کو مکمل جماعت یا طبقہ بھی کہتے ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ فرض کر لیا جائے کہ ہمارے سامنے یہ فطریہ پیش کیا گیا ہے کہ انسانوں کے ہر گروہ کو جداگانہ حقوق حاصل ہیں لیکن اس کے بعد ہی مصنف نے ان لوگوں پر حملہ کیا ہے جن کا خیال ہے کہ اقدار اعلیٰ جمہور کے علاوہ کسی اور سے رہتا ہے۔

وہ رقمطراز ہے کہ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ رعایا اپنے بادشاہوں سے بھی باز پرس کر سکتی ہے۔ یہ ایک لغو بات ہے کیونکہ یا تو جمہور نے آزادی کے ساتھ اس قسم کا طرز حکومت پسند کیا ہے یا ایک زبردست اور فائق طاقت کے سامنے سراسر طاعت خم کر کے اس کے زیر اثر رہنا منظور کیا ہے۔ بہر حال دونوں میں سے کسی ایک طریقہ سے بھی جو نظام حکومت قائم ہو گیا ہے اس کی کسی طرح حریفی نہیں ہو سکتی۔ دونوں میں کسی قسم کی مملکت میں بھی جو باشندے رہتے ہیں ان کی ہستی سے اسی حکومت کا اظہار ہوتا ہے جسے ابتداء میں انتخاب کیا تھا اور جو انتخاب ایک مرتبہ کر لیا گیا ہے اس کی سب کو اسی طرح پابندی کرنا چاہئے جس طرح ایک عورت پہلے تو اپنا خاوند منتخب کرتی ہے اور منتخب کرنے کے بعد پھر اس کا یہ فرمل ہوتا ہے کہ مکمل طور پر شوہر کا حکم بجالائے۔

یہاں کوئی تعلقین جمہوری یا قومی ارتقار کے لئے نہیں کیجاتی ہے کیونکہ

گردہ محض ایک جداگانہ حکومت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حکومت محکوم کی بہتری کے لئے ہوتی ہے لیکن اس کا کام بجنسہ ایک تالیق کے کام کے مانند ہے جس کے لئے اس شخص کے اغراض کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے جو اس کی زیر نگرانی رکھا گیا ہو جمہور کے لئے تو فیصلے کا حق باقی ہی نہیں رہ جاتا ہے۔

پھر ایک طبقہ کو آزاد فرما کر مملکت کیسے کہتے ہیں جمہور انسانوں کی اس جماعت کا نام ہے جس میں ایسی باتیں شامل ہوں جو باہم دیگر بعید ہوتی ہیں۔ جو ایک شخص کا مطیع ہے۔ اور پلوٹارک کے قول کے مطابق جس کے تمام افراد کے عادت یکساں اور جس میں مشہور مفن پال کے حسب منشاں ایک ہی اسپرٹ حصلت مذہب موجود ہو۔ جمہور میں اس قسم کی عادت یا اسپرٹ کا موجود ہونا ہی مہذب انسانوں کا مکمل اشتراک ہے۔ جس کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سرتاج ہو جاتا ہے اور اسکی بدولت وہ ایک ایسی کڑی بن جاتا ہے جس سے مملکت کی زنجیر تیار ہو جاتی ہے اور ایک ایسی روح ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس قدر لوگ جیتے ہیں جیسا کہ سنیگانے قلمبند کیا ہے۔

اصلی طریقہ عملداری سے کوئی فرق نہیں واقع ہوتا۔ فوقیت جس چیز کو حاصل ہوتی ہے وہ ہے حکومت منظمہ۔ خواہ وہ کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو اور ایسی معتد مملکتیں ہیں اور ہونا بھی چاہئے۔

زمانہ احیاء کی فرزندانی کے متعلق تیسری معرکہ آرا کتاب لیو یا مچھن ہے جسکا مصنف ٹامس ہابز ہے۔ یہاں بھی ہمیں دلیل کی تفصیلات سے سروکار نہیں

کیونکہ موجودہ معاہدہ برابری کے لئے غرض صرف اس معیار سے ہے جو نہایت کچھ ہے
ہمارے خیال کے مطابق تمام انسان ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔
لیکن اپنی اپنی حفاظت کے لئے وہ باہمی معاہدے عمل میں لاتے ہیں۔ اس طرح
حکومت کا وجود اس لئے ہوتا ہے کہ وہ جذبہ انسانیت کی نگرانی اور بھروسہ کی حفاظت
کرے۔ ہمارے خیال تھا کہ ضرورت اگر ہے تو زبردست مرکزی حکومت کی اور اس امر
پر بے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کا دار و مدار محکوم پر ہونا چاہئے۔ اس وقت
کے واقعات سے مرشح ہے کہ لوگوں میں نفاق کی دباہیلی ہوئی تھی۔ غیر ملک والوں کے
مقابلے میں کمزور تھے۔ زمانہ اسباب کی فرمانروائی اس وقت کا معیار تھی۔

اس دباؤ کے خود پر عائد کرنے میں (جس کے زیر اثر ہم ان کو ملک عام میں
رہتے ہوئے دیکھتے ہیں) ان لوگوں کا آخری مدعا یا مقصد جنہیں قدرتا آزادی
اور دوسرے دل پر اپنی حکومت کے دلدادہ ہوتے ہیں) اس بات کی پیش بینی کرتا
ہے کہ وہ اپنی حفاظت اور اس کے ذریعہ سے ایک زیادہ با فراغت زندگی بسر کریں
یعنی یہ کہ وہ جنگ و جدل کی افسوس ناک حالت سے آزاد ہو جائیں۔ گویا بچا
اس کے طوائف الملو کی پھیل جائے تو فراغت حاصل کرنے کے لئے اپنی آزادی کی قربانی
کر دینا مناسب ہے۔ جس معیار کا منشا۔ اس میں مضمر ہے وہ ایک ایسی مرکزی حکومت
ہے جو اس قدر صاحب و بدہ وطن ہے کہ ہمیشہ لوگوں کو بد نظمی کی طرف مائل ہوئیے
روک سکے۔ ہمارے خیال تھا کہ لوگوں کا بد نظمی کی طرف مائل ہو جانا اقتضا سے
فطرت ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ لوگ محض اس کے زمانے میں اس عادت کے فکار
تھے۔ جب مرکزی یعنی فرمانرا حکومت کا تسلط ہو جاتا ہے تو اس آزادی کا قیام

ان باتوں میں ہوتا ہے جن کو حکمران کی طرف سے اجازت مل جاتی ہے اور مزبور دنیا
صنعت نہیں ہو سکتی حالانکہ اس قدر غیر محدود اختیارات سے لوگوں کو اکثر خراب نتائج
کا اندیشہ رہتا ہے۔ لہذا اس کی اختیار کا نتیجہ یعنی شہنشاہ کا اپنے ہمسایہ کے
ساتھ ہمیشہ برسرِ جنگ رہنا اور بھی زیادہ خراب ہوتا ہے۔

ہائز کی نگاہ میں انسان کے لئے مکمل فزائون کے مطیع ہونے کے علاوہ
اور کوئی بات بہتر نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی زندگی اس مہم کی زندگی کی طرح خراب
نہ تھی جو اس کے بجائے ظہور پذیر ہو سکتی تھی اور اگر کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ
جس زمانہ قدیم کی جہالت کا ہائز کو خیال تھا وہ واقعی ایک خطرے کی بات
تھی تو یہ ایک بہت تھوڑی تعریف ہے لیکن معیار کے متعلق جو عام خیال ہے وہ
صاف ہے اور وہ خیال یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی تسلط اور محفوظ مرکزی حکومت
ایسی ہونا چاہئے جس کے ذریعہ سے زمانہ وسطی کی ذاتی جنگِ جدل اور زمانہ
احیاءِ یورپ کے بچپن رکھنے والے ارمانوں کا ہمیشہ کے لئے قطعی انسداد ہو جائے
اس طرح خیالی طور پر اور حقیقتاً دونوں طریقوں سے کم از کم معیار
کے معاملے میں یورپین تہذیب کو زبردستی خود مختار فزائون حکومتوں کا محتاج
بنادیا گیا تھا۔ اتحاد کے بمقابلہ اختلاف و تفریق کو زیادہ اہمیت دی جاتی
تھی اور سیاسیات کا کام یہ ہو گیا تھا کہ مختلف طاقتوں کے درمیان توازن
برقرار رکھے۔

تنقید

مختلف جماعتوں میں اس علیحدگی کا واقع ہونا اچھا تھا اور برا بھی۔ اچھا اس لئے تھا کہ ایسا کر میسے ہر ایک گروہ کو اس حالت میں اپنی ترقی کی گنجائش کی توسیع کا زیادہ موقع مل سکا۔ جب اسے دوسرے طبقوں کے ساتھ غیر محدود تعلقات کی زنجیر سے آزادی حاصل ہو چکی تھی۔

مقامی بول چال کی زبانیں سرکاری اور ادبی زبانیں ہو گئیں۔ مقامی دستور نے مسلط قوانین کی صورت اختیار کر لی اور لوگ خود کو کال اور تمام تر خدائی طاقت کے نائبوں کے جسدِ رقیب خیال کرتے تھے اسی قدر خوش محکموں کے اغراض میں بھی پیدا ہوتا جاتا تھا۔ لیکن جس حد تک اس آزادی کا مدعا تمام فرموں کے مابین پیہم مخالفت کا جاری رکھنا تھا اسی حد تک یہ تقسیم مضرت رساں بھی تھی۔ ممکن ہے کہ ایک معنی میں خود مختار نہ قومی بیداری کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہو لیکن یہ کہنا نہایت خطرناک ہے کہ جو کوئی بھی خرابی واقع ہوئی وہ ناگزیر تھی۔ یعنی اس کے واقع ہونے کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر اس جہاں کا محض یہی منشا ہے کہ جو کچھ بھی واقع ہو چکا ہے اس کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا تو یہ نہایت لغو ہے اور اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ بھی آئندہ وقوع پذیر ہونے والا ہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا تو یہ ایک امر باطل ہے۔

اس لئے یہ حقیقت قائم رہتی ہے کہ جماعتوں کی باہمی مخالفت سے اکثر

ان کی دوا تیار نہیں ہونے پائی جو خود مختاری کا مدعا و مقصد ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زمانہ نشاۃ جدیدہ کا ایک لغو خیال یعنی توازن طاقت کا اصول خواہ مخواہ ہم پر حاوی ہے۔

ہر ایک طبقہ کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ فطرتاً ہی دوسرے طبقوں کو جو اس کے بمقابلہ کمزور ہے برابروپامال کرنا چاہتا ہے۔ اور ابھی تک حکمت علی اور سیاست میں الاوامی دونوں قدیم زمانے کے اس اصول فرمانروائی کے شکنجے میں گرفتار ہیں۔

جس طرح ابتدائی زمانوں میں انفرادی آزادی کے متعلق لوگوں کا خیال تھا اسی طرح مملکت کی آزادی کے متعلق قیاس کیا جاتا تھا۔ یعنی کوئی انسان اپنے ہمسایوں کو برابروپامال کئے بغیر آزاد نہیں ہو سکتا ہے۔

چونکہ جدید حکومتوں میں اپنے حریفوں کو برباد کرنے کی طاقت نہ تھی اس لئے اگر کبھی کسی دوسری حکومت کو کامیابی کے ساتھ تباہ کرنے کا موقع مل جاتا تھا تو ہر ایک مملکت خم ٹھونک کر جنگ آزمائی کے لئے میدان کارزار میں اتر آتی تھی۔

خود مختار حکمرانیوں کے متعلق اس خیال میں جو قیود موجود ہیں وہ بالکل ظاہر ہیں کیونکہ جماعت کے متعلق واضح طور پر کبھی یہ خیال نہ کیا جاتا تھا کہ یہ جداگانہ قانون اور عملداری کا منبع یا مخرج ہے۔ قومیت اس وقت تک صفحہ ہستی پر نمودار نہ ہوئی تھی اور گروہوں کا امتیاز ان کے حقیقی خصوصیات کی بنا پر نہیں بلکہ اس خاندان کے لحاظ سے کیا جاتا تھا جو ان پر حکمراں ہوتا تھا۔

گویا اس زمانے کے لوگ مادہ احیا کی زمانہ زوال کی ایک خاص قوم کا حق نہیں سمجھتے تھے

بلکہ مقامی حکومت کی آزادی قرار دیتے تھے اور اس تنگ خیالی کا براہ راست نتیجہ
خاندانوں کی باہمی جنگ و جدل کی شکل میں ظاہر ہوا جو مذہبی لڑائیوں کے بعد ہوی تھی
توازن طاقت اقوام متعلقہ کے باہمی معاہدوں کے ذریعہ سے نہیں بلکہ غیر
محرور اور غیر ذہن چھوٹے چھوٹے تاجداروں کے ذریعہ سے قائم تھی۔ یورپ کی زمین
اور دولت کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ ان خاندانوں کی ملکیت ہے جن کے
درمیان وہ حیثیت ذریع آمدنی منقسم تھے۔ اور یہ خاندان ہمیشہ کمینہ فحشیت یا خود
پسند نہ ہوتے تھے ان کی حیثیت اس زمانے کے معیاروں نے قائم کی تھی۔ تمام
لوگ انھیں کو محض قانون اور عملداری کا قائم رکھنے والا سمجھتے تھے۔

فرانز دانی کے متعلق یہ تصور کہ وہ ایک خاص خاندان کے قبضہ میں رہنا چاہتے
وادی خیال سے بہت قریبی تعلق رکھتا تھا۔ میکیا ولی کی کتاب سے اس کی کافی
شہادت ملتی ہے اس کی تصنیف میں یہ معیار منعکس نہیں ہے لیکن دراصل اس میں اس کی
ابتدائی شکل ضرور ظاہر ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ یہ امر آئندہ ہے کہ مشہور رہے
بائندہ فلاسف نے کئی خود مختار حکومتوں کے معیار کے بہت غلط معنی ظاہر کئے ہیں بلکہ
اس نے اس کی صورت ہی بگاڑ دی ہے۔ یہ غور کر لینا کافی ہے کہ اس کی تصنیف
اخلاق کے متعلق بحث کرنے کے لئے ضبط تحریر میں نہیں آئی تھی۔ اس کے خیال
کے مطابق دنیا سے سیاسیات میں حسن و قبح یہ دونوں الفاظ بے معنی تھے۔ برخلاف
اس کے کتاب میں ان حقیقی اصولوں کی ایک نہایت لطیف تقسیم کی گئی ہے جو پندرہویں
اور سولہویں صدی میں اٹالوی سیاسیات پر حاوی تھے۔ اور اگر مصنف اس زمانے
کے فرانز دانیان انگلستان و جرمنی کے طرز عمل پر غور کرتا تو جو زمانہ اس نے اخذ کئے

وہ ہرگز بہت زیادہ مختلف نہ ہوتے۔

جداگانہ خود مختار حکومت کے خیال نے بہت جلد گھٹ کر یہ صورت اختیار کر لی ہے کہ ہر ایک طبقہ کو ایک مطلق العنان فرمانروا کے ماتحت ہونا چاہئے اور سیاست کا مقصد یہ تھا کہ اس مطلق العنان طاقت کو برقرار رکھ کر اس کو ترقی دینا مناسب ہے ایک معیار پرست کے دل میں کبھی کبھی محکوم کی فلاح و بہبودی کے لئے اضطراب پیدا ہو جاتا ہو گا لیکن سرحدوں صدی کے آخر تک کثیر التعداد جماعت کا یہ خیال تھا کہ حکمران کو اپنے ذاتی اغراض کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ لوگوں پر اس طریقہ سے حکومت کرنا کہ یا تو وہ اس سے مطمئن رہیں یا اس قدر کمزور ہو جائیں کہ پھر اس کے خلاف نہ اٹھانے کی ان میں تاب ہی نہ رہے۔ حکمران ہی کے حق میں مفید ہے۔ بالفاظ میکیاولی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ حکومت اس طریقہ سے کی جائے کہ لوگ اس سے محبت بھی کریں۔ اور ڈرتے بھی رہیں۔ لیکن ایسی حالت میں جب ان دونوں باتوں میں سے ایک کو خیر باد کہہ دینے کی فوجت آجائے ایک بادشاہ کے لئے زیادہ سہولت اسی میں ہے کہ وہ ایسا طرز عمل اختیار کرے جس سے لوگ اس کے ساتھ محبت نہ کریں بلکہ ہر وقت اس سے خائف رہا کریں۔

پس اسی حد درجہ آزاد دماغ میں فرمانروائی اچانک یورپ کے معیار سے اس صورت میں جس میں ہم عصر عملی مدبر سمجھتے تھے۔ نہ تو فوقیت اور نہ جداگانہ گروہ کے اغراض کی تعلیق ہوتی تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کا ایک سمجھنا نظریہ عملداری تھا جو یکایک ظہور میں آگئی تھیں۔ اس لئے ہم میکیاولی کی تصنیف کو معیارِ نشاۃِ جدیدہ کا کافی اور قرار واقعی تذکرہ تصور نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تاریخی نقطہ خیال سے یہ زیادہ درست ہے کہ وہ

یا ڈی گروٹ کی تصنیفات میں اس تصور کی نفی پیش کریں لیکن تصنیف حکمران میں اس معیار کے لازمی قیود ظاہر ہیں۔ میکا ولی کا جمہور کے خلاف ہونا اسی کی ذات تک مخصوص تھا اور اس کی اس عادت کے سبب سے ہماری بین الاقوامی سیاسیات کو ابھی تک ضرر پہنچ رہا ہے جمہوری حکومت کی آزادی قائم کرنے میں محکوم گروہ کے اغراض کا نظر انداز کر دینا ایک نہایت خطرناک غلطی تھی۔

اس غلطی کا آخری اور سب سے زیادہ مجرمانہ اطلاق تقسیم پولستان میں (پولینڈ) کیا گیا تھا۔ مہذب یورپ کے سرکاری مدبروں نے قومی روایات عادات و حضائل اور معیارات کو حقارت کے ساتھ نظر انداز کر کے یا ان کے متعلق ایک وحشیانہ لاعلمی کا اظہار کر کے ایک ایسے اہم گروہ کا غیر ازہ بکھر دیا جس کے خدمات کم از کم ان کو یاد تو تھے۔ اگر ان میں یہ دیکھنے کی ذہانت نہ موجود ہوتی کہ پولستان والے اس وقت تک تمام مہذب طبقے کے لئے اور بہت کچھ کیا کر سکتے تھے۔ محض ایک قوم کو علیحدہ کر دیا گیا تھا گویا مملکت کے اقدار کو قوم سے کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔ یعنی تسلط یافتہ حکمران یا عملداریاں اپنی رعایا یا ممالک کو اپنی جائداد سمجھتے تھے۔ مہذب یورپ کو اب بھی سیاسی اور خاندانی مدبروں کے جرم کی اجازت دیتے یا اس میں کسی قسم کی ترمیم سے پہلو تہی کرنے کے عوض میں بہت کچھ تلافی کرنا پڑے گی۔

حکومت یا اقدار کے متعلق ایسے محدود اور بھونڈے طور پر مرکوز تصور سے یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ ہم کو کوئی عمدہ شے ترکے میں نہیں ملی ہے مگر تاہم اپنے مختلف النوع مقامی ارتقار کے باوجود اس میں موجودہ یورپ کی ساخت کی طرف قدم اٹھایا گیا تھا۔ سیاسی معیارات بہت سست روی کے ساتھ بنتے ہیں اور جب پہلے پہل ان کا ظہور ہوتا ہے

تو یہ عموماً اس قدر بعد سے ہوتے ہیں کہ انہیں دھیکر ہیست طاری ہو جاتی ہے لیکن امتداد زمانہ سے وہ پھر دنیا کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں پس دو جدیدہ میں فرما زوائی کے متعلق جو خیال تھا وہ موجودہ زمانہ کے اس معیار کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے کہ ہر ایک مہذب مملکت کو اپنے اپنے طریقہ کے مطابق اپنے ذاتی قانون اور حکومت کی تربیت کرنا چاہئے اور ایسے قبیلوں میں جیسے کہ جزائر برطانیہ جس میں انگریز اور ایرستانی دو مختلف قوموں سے مل کر ایک حکومت قائم ہے قوست کا لحاظ کے بغیر اس بات میں سہولت ہوتی ہے کہ معاشرتی عدل و انصاف اور انظم و نسق حکمرانی کے عام اصول پر اس طریقے سے عمل درآمد کیا جائے کہ اس میں بیرونی فتنوں یا ایسے عالمگیر مطالبوں کی ذرا بھی مداخلت نہ ہو جو زمانہ وسطی کے پایا اور شہنشاہ نے کئے تھے۔ اس طرح ایک ایسی مملکت میں بھی جو قومی ہو۔ مثلاً آسٹریا تمام نسلوں کے شہنشاہ کے شخصی اقتدار کے ماتحت ہونے سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور حاصل ہوا ہے۔

ہم کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ زمانہ انبیاء کے تصور سازوں کی محالیت کے باوجود آزاد فرما زوائی کے نظریہ سے قومیت کا معیار بعد میں ظہور میں آسکا۔ ایک مقامی حکومت کے ماتحت لوگوں کے لئے اپنی خواہش کا ظاہر کرنا زیادہ آسان تھا جب کہ یہ اس حالت میں نہیں کیا جاسکتا تھا اگر ایک تسلط یافتہ اور غیر جمہوری حکومت کی حمایت کوئی وسیع ارضی طاقت سے ہوتی۔

نشا قجیدہ کے آخر میں مسلط حکومت کا فائدہ مند ہونا ثابت ہو گیا فی زمانہ اکثر اشخاص کے دل میں مسلط حکومت کے متعلق شکوک پیدا ہو جاتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ انقلاب و انس کے تصور سازوں کے محدود خیالات کی وجہ سے

لوگ ایسا کرنے لگے ہیں برخلاف اس کے بعض لوگ ایک قائم شدہ شے کو متبرک سمجھنے لگتے ہیں اور یہ عادت زمانہ احیاء سے ترکے میں ملی ہے۔ لیکن دونوں دھیروں میں غلطی سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ جس چیز کا بھی دنیا میں وجود ہے وہ لازمی طور پر نہ عمدہ ہی ہو سکتی ہے نہ خراب قرار دیا جاسکتی ہے۔ واقعات کا اندازہ اخلاقی کسوٹی کی مدد سے کیا جاتا ہے لہذا ایک قائم شدہ عملہ اری کے رنگ و روپ پر اس خیال سے نظر ڈالنا چاہئے کہ محکموں پر اس کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ بعض اثرات کی وجہ سے تو خوشی حاصل ہوتی ہے اور بعض دل کو رنج پہونچاتے ہیں۔ اچھائی یا برائی کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ ان دونوں میں سے کس کو منسوخت و مسدود کرنا اور کس کو تیز کرکھنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہم لوگ بعض انتہائی جماعتوں میں انقلابی حقوق پر ایمان لے آتے ہیں بہر حال ہر ایک قسم کی عملہ اری کے متعلق جو اس قدر طاقتور ہو کہ نظام قائم رکھ سکے اور اس طرح خانہ جنگی یا افراد کی سخت باہمی بخشش کا دفعیہ کر سکے۔ کچھ کہنا ضروری ہے کہ ہم ایسی حکومت کو عمدہ نہیں تسلیم کرتے لیکن اس کو برقرار رکھکر اس کی طاقت میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ مقامی یا نسلی اتحاد کے لئے یہ طاقت بھی ایسی ہے جس سے ایک قسم کے افراد پر دوسرے اشخاص کی زبردستی کے خلاف جدوجہد کی جاسکتی ہے صرف اسی بنا پر ہم اس کو قائم رکھکر اس کی تنصیب کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ محض زمانہ ایسا کی فراوانی کے ایسے پیش پیش تصور میں جن کا جابرانہ شخصی حکومت یا غیر جمہوری میلان طبع سے ذرا بھی علاقہ نہیں ہوتا۔ گویا موجودہ زمانے کی سیاسی زندگی میں سے وراثتاً ملے۔

ساتواں باب

انقلابی حقوق

(۱۸۱)

”حقوق انسانی“ ایک ایسا کلمہ ہے جو ہر طرف تاریخی فضا سے گھرا ہے کیونکہ اس دور کو گزرے ہوئے ایک مدت ہو گئی جب اس کو بڑی بھاری طاقت حاصل تھی۔ اس کی مدد سے زمانہ موجودہ میں دو عظیم الشان جمہوری حکومتیں یعنی فرانس اور امریکہ ظہور پذیر ہوئیں پھر ان میں بھی اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ ترقی ہوئی ہے کہ ان الفاظ میں جو قدیم جا دو پنہاں تھا وہ بالکل منت برود ہو گیا۔

زمانہ انقلاب کے قیاسی انسان کو سب ایک بے معنی وجود سمجھتے ہیں اور حقوق کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ انعکاس فرضی ہیں۔

بہر حال حالیہ زندگی میں ایک معیار قطعاً ابھی تک قائم ہے جو انقلاب فرانس سے چلا آتا ہے۔ ہم لوگوں کو جمہوری حکومت کے طرفداروں سے ذرا بھی دہشت نہیں ہو سکتی جس طرح ہمارے بزرگوں کو رہا کرتی تھی اور اب ایک بنیاد

کے پادری کے سامنے آزادی مساوات اور اخوت کا تذکرہ کرنے سے اس کے دل میں بھی بہ مشکل سنسنی پیدا ہو سکتی ہے۔

مساوات کا موجودہ نصب العین

جو معیار اس طرح ظہور پذیر ہوتا ہے اس کا تعلق دو افراد کے باہمی تعلقات سے ہے کیونکہ زمانہ انقلاب کے نظریہ سازوں نے مملکت کے متعلق بہت کچھ اظہار خیالات کیا لیکن حکومت ”مجموعہ افراد“ ہی قرار دیتی تھی۔ حالانکہ انقلاب پسند فرانس نے دوسرے ملکوں میں جابروں کی پامالی کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ مگر انسانوں کے ان قومی گروہوں کے باہمی تعلقات سے کوئی جدید معیار رونما نہیں ہوا۔ حقوق انسان لئے جس بات نے خاص طور پر جوش دلایا وہ یہ تصور تھا کہ یک انسان کو اس لحاظ سے کامل آزادی حاصل ہونا چاہئے کہ وہ حادثہ ارتقار میں قدمزن ہو سکے اور دوسروں کے ساتھ گفت و شنید کے لئے اس کو مساوی موقع حاصل ہو۔

ان تمام تغیرات کی تحریک اسی نصب العین سے ہوئی تھی جن سے تاریخ سنین واقعات مملو ہو کر تھی ہے۔ مثلاً انقلاب انگلستان جو ۱۶۴۲ء اور ۱۶۸۸ء میں واقع ہوا تھا اور انقلاب فرانس جو ۱۷۸۹ء میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ ان میں تمام بالغ اشخاص کے لئے سیاسی مساوات کے حصول کی وہی مبہم کوشش جو انگلستان میں نادانستہ ہوئی تھی اور انفرادی آزادی کے متعلق وہی غیر معین اور کسی قدر غلطی پر قائم شدہ تخیل یہ دونوں باتیں اپنا کام کر رہی تھیں۔

یہ ہے وہ معیار جو انقلابی کہا جاتا ہے مگر اس وجہ سے نہیں کہ اس سے تہذیب کی باتا عمدہ ترقی کا رخ یلٹ جاتا ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ اس فرانسیسی تحریک میں شامل ہے جس کو بڑھاپڑھا انقلاب کہتے ہیں۔

اس سے شاید فلسفیانہ انفرادیت کا مسلک ظاہر ہو جاتا ہے جیسا کہ روشن زمانہ میں ظاہر ہوا تھا۔ یہ ضمیر انفرادی کی تلقین ایسی متغنی عقیدت ہے جیسی ایموئل کینٹ نے کی تھی لیکن انفرادیت کا خیال ایک زیادہ حال کے معیار میں مضمر ہے۔ برخلاف اس کے انقلابی نصب العین کا مدعا زیادہ ترویسا ہی ہے جیسا کہ اشتراکیت کا منشا ہے۔ لیکن اس موضوع کو بھی آگے چل کر بحث کرنے کے لئے یہاں چھوڑ دینا چاہئے۔

ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ اسی امر کو واضح کریں کہ تاریخ آغاز کے لحاظ سے تاریخ ارتقائیں سیاسیات حال کا کونسا خیال زمانہ انقلاب سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ اصول غالباً موجودہ دور کے اس تصور میں نظر آئے گا کہ معاشرتی حلقے کے اندر انسانی زندگی کی ضروریات کی تعداد حتی الامکان کم ہونا چاہئے اگر کوئی معیار ایسا ہے جس سے معیار مترشح ہو سکتا ہے تو وہ ”مساوات“ ہونا چاہئے۔ اس کے خلاف جو خیال ہے وہ ایک ایسی صورت حالات پر دلالت کرتا ہے جس میں بعض آدمیوں کو تو بہ کثرت اور زیادہ آدمیوں کو تلیل آسائش حاصل ہوں ان زیادہ لوگوں کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو جو کچھ تکمیل میں مقدار میں حاصل تھا اس کے لئے وہ ان لوگوں کے حکم و رضا کے محتاج تھے۔

جن کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں۔

اس بات سے سب کو اتفاق ہے کہ جب تک کہ ہر شخص کو خودش اور پوشش کے لئے دوسروں کے رضا و حکم سے آزادی حاصل نہ ہو اس وقت تک جذبات نفسانی زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ مراد کلام یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں متعدد حکومتوں کے اندر ایک غلام کو زمانہ حال کے کاشتکاروں کے بہ مقابلہ زیادہ فارغ البالی حاصل ہو گی لیکن اس کے لیے وہ ایک اراضی کی خوشنودی مزاج کا محتاج تھا۔ لیکن اب ہم کسی ایک جذبات ملک کے کثیر التعداد باشندوں کے حوائج زندگی کی تقسیم کا انتظام کسی خاص شخص کو سپرد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جو وہ اپنی مرضی کے مطابق عمل میں لائے گا۔

اس لئے زمانہ حال کا تصور اس واقعہ پر محمول ہے کہ ایک فرد واحد کے معاشرتی رتبہ اور حیثیت مزدور اس کی ان ضروریات سے قطع نظر کر کے جو اس کو فرد کے قابل بناتی ہیں۔ پہلے اس کو کوئی ”انسان“ تصور کرنا ضروری ہے۔ یہ حقیقت اس قدر آئینہ معلوم ہوتی ہے کہ ہم بہ مشکل ایسے زمانہ کا خیال کر سکتے ہیں جب معاشرہ کی فرقہ بندی میں اس قدر نہ زیادہ طاقت موجود تھی جس سے کسی ایک نسل کے تمام ارکان کی بنیادی ثلثت پر پردہ پڑ جاتا تھا۔ ہم یہ بھی بہ مشکل یقین کر سکتے ہیں کہ کوئی ایسا زمانہ بھی تھا جب مذہب پرست اشخاص رسم غلامی کو غلام کے حق میں منفعت بخش سمجھتے تھے۔ جس کی پردوش اس کے مالک اس غرض سے اس قدر کرتے تھے کہ وہ ان کے (مالکوں) کے لئے بخوبی کام آسکیں۔ گویا ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر انسان کو کسی دوسرے شخص کی محتاجی کے بغیر خوراک اور پوشاک کا استحقاق حاصل ہے۔ کم از کم نظری

طور پر تو ہم اس کا اعتراف کرتے ہی ہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ بعض اشخاص کا یہ خیال ہے کہ جن لوگوں کو کافی خوراک اور پوشش میسر نہیں ہوتی ان کو چاہئے کہ دوسروں سے خیرات لے کر شکم پر ہی کریں۔

دنیا میں اس وقت تک ایسے صد ہا اشخاص ہیں جنہیں بعض زندگی بسر کرنے کیلئے کافی کھانا اور کپڑا نہیں دستیاب ہوتا اس وجہ سے اس معیار نے عملی صورت نہیں اختیار کی ہے۔ ابھی تک ہمیں اس تصور کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے کہ تمام انسانوں کے پاس اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے حتی الامکان کافی سامان ہونا چاہئے۔ لیکن اگر ہمارے افعال میں بعض خیرات کی نیت شامل ہے یا ہم خیرات کا ایک باقاعدہ بندوبست کرتے ہیں تو ہمارا ایسا کرنا ازمنہ وسطی کے دستور کا اعادہ کرنا ہے خواہ ہم اس بات کو بخوبی سمجھے بھی ہوں کہ ایک مہذب مملکت کے تمام باشندوں کو زندگی کے خاص خاص ضروریات ضرور میسر ہونا چاہئیں۔ ہمیں حقیقت یہ معلوم ہے کہ قرون وسطی میں اکثر رنج تکلیف کا انتظام کیا جاتا تھا۔ خوب دل کھو کر خیرات کیجاتی تھی۔

نصب العین جدید کا منشا لفظ ”حق“ سے ظاہر ہے اور حالانکہ زمانہ وسطی میں کلیہ کی طرف سے اصول خیرات کی تلقین کی جاتی تھی۔ مگر اس زمانے میں یہ اصول کہیں نہیں رائج تھا کہ ہر شخص کا یہ حق ہے کہ اسکو خوراک اور پوشاک ضرور مہیا کی جائے۔ لطف و کرم کے خیال سے خیرات کے طور پر کچھ دے دینا اور ایک جائز مطالبہ کا مہیا کرنا ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ زمانہ انقلاب میں خیرات نہیں طلب کی جاتی تھی۔ بلکہ انسانی حقوق کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ شاید ہم

مبہم ترین معنوں میں اس بات میں متفق الرائے ہیں کہ خاص خاص ضروریات زندگی کے لحاظ سے ہر شخص کو مساوی حق حاصل ہے۔ یہ بھی اغلب ہے اور اکثر سیاسیات کے ارباب فہم اس خیال پر صاف کریں گے کہ سیاسی نقطہ نظر سے تمام انسان مساوی ہیں اگر واقعی یہ صحیح ہے تو کچھ معنوں میں زمانہ انقلاب کا معیار ابھی تک صفحہ ہستی پر موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حالانکہ ہم کو کسی قدر برابری حاصل ہو گئی ہے مگر ابھی اور حاصل کرنا باقی ہے اور بعض ایسے انغمص موجود ہیں جو کم از کم مساوات حاصل کرنے کے لئے میدان عمل میں مصروف کارزار ہیں۔ اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تمام انسانوں کے مساوی حقوق کی تشریح و تعریف کیا کیونکہ اس معاملے میں بہت کچھ اختلاف رائے واقع ہو جانے کا احتمال ہے۔ مثلاً ممکن ہے کہ اس خیال سے متفق ہوں کہ مختلف قسم کی ذاتی آمدنی یا موروثی دولت یا دیگر روایاتی مراعات کے ساتھ ساتھ حقیقی مساوات کا دستور کام کر سکتا ہے لیکن معاملہ یہ ہے کہ مختلف جماعتیں سیاسی مساوات کے خواہ کوئی بھی خاص معنی اخذ کریں لیکن سب یہ تسلیم کرتی ہیں کہ کسی نہ کسی صورت میں سیاسی مساوات ہونا ضرور چاہئے۔ اس سے پاگل۔ از کار رفتہ۔ یا اطفال نہیں بلکہ ایسے صحیح الدماغ بالغ اشخاص کی مساوات مراد ہے جنہیں ہم انسان کہہ سکتے ہیں۔

نصب العین کا آغاز انقلابی ہے

یہ ہے انقلابی معیار کی موجودہ صورت اب ہم کو اس کے ارتقاء ابتدائی

پر نظر ڈالنا چاہئے۔ جو بحث اس کے نمود و صعود کے متعلق کی جائے گی اسی میں اس کے فوائد اس کی معنی اور اس کی خامیاں سب باتیں بیان کی جائیں گی۔

خدا خواہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ کلیسامے مسیحی نے مساوات انسانی کے خیال کی بنیاد ڈالی۔ یا کم از کم اس کو عمومیت اس کی بدولت حاصل ہوئی مگر اس زیادہ بعید از حقیقت اور کوئی بیان نہیں ہوتا۔

عیسائی حکام نے فرقہ وارانہ قصب کی تنگ نظری کو درست کر نیکی کبھی کوشش نہیں کی۔ یہ پہلے تو سلطنت روم کے عہدیداروں اور اس کے بعد رسم جاگیر کے فرقوں کو تسلیم کرتے تھے اور اس دستور کی خامیوں کو درست کر نیکی جاتے یہ لوگ ایک ایسی سیاسی حالت کے حق میں دلیل تلاش کرتے رہے جو پہلے ہی سے موجود تھی۔ لیکن یہ بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہمیں زمانہ وسطی کے کلیسہ کے خلاف شکوہ سرائی کرنا منظور نہیں۔ کیونکہ ہم سب کو معلوم ہے کہ شاید انھوں نے غلطی سے اپنے مداخلات کا دامن عافیت نظریہ سیاسی تک دراز کر دیا تھا یہ ایک واقعہ ہے کہ اس حریت۔ مساوات اور اخوت کا ہر شہہ مینا کرنے کے لئے جو انقلاب فرانس کی روح رواں تھی۔ قرون وسطی کے کلیسہ نہیں بلکہ اس نشاۃ جدیدہ پر نظر ڈالنا پڑے گی جس میں شرک و کفر کا بڑا زور تھا۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کلیسہ اور اس کے مدبروں نے کہہ دیا تھا کہ تمام انسانوں کے درمیان رشتہ اخوت قائم ہے اور ان سب کا باپ خدا تعالیٰ ہے۔

جمہوریت حقیقی کے لئے ایک اصولی شکل یہ واقع ہوئی کہ اس بیان میں

یہ اضافہ اور کر دیا گیا کہ ”خدا سے تعالیٰ کی نظر میں تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔“
 اس بات سے پہلے بیان کا اثر زایل ہو گیا۔ اور تمام انسانوں کو خدا سے
 برتر کی نگاہ پاک میں مساوی نہایت کرنے کا کام زمانہ روشن کے ان سیاسی فلسفہ والوں
 لئے رکھ چھوڑا گیا جو دستور کلیسائی کے خلاف تھے۔ جو بات صرف خدا کی نگاہ میں صحیح
 تھی وہ سیاسی مقصد کے لئے سچی نہ تھی۔ لیکن جب یہ دکھایا گیا کہ لوگ خود ہی سمجھنے
 لگے ہیں کہ تمام انسان مساوی ہیں تو مغربی تہذیب کے روایات میں ایک جدید اور
 نہایت شاندار معیار کا داخلہ ہو گیا۔

تمام انسانوں کے حقوق تسلیم کئے جانے کے قبل ہی نظریہ سازوں نے
 ان کے اغراض پر غور کر لیا تھا۔ قرون وسطیٰ کے سیاسی مدبروں نے بھی یہ بات نظر
 انداز نہیں کی تھی کہ تمام بنی نوع انسان یکساں ہیں۔
 ہامس اکویناس کا خیال تھا کہ حکومت کا قیام محکوم کی رضا پر منحصر ہوتا ہے
 اور واقعی موصوف کو اس حقیقت کا پتہ لگ گیا تھا کہ حکومت کا وجود محکوموں کی
 بہبودی کے لئے ہوتا ہے لیکن ابتدائی زمانہ میں سرکاری داغظین پر جو بات آشکار
 نہ تھی وہ یہ تھی کہ لوگ یہ نہیں چاہتے ہیں کہ ان کی بہبودی ایک قسم کی خیرات تصور
 کی جاتی ہے۔ کسی بادشاہ کا اپنی رعایا کے مفاد کو ہر وقت مد نظر رکھنا اس کی کوئی
 خاص صفت نہیں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس کا وجود کسی اور مقصد کے لئے ہوتا ہی
 نہیں کیونکہ یہ لوگوں کا حق ہے۔

مفروضہ حق اولیٰ کے ولیم اور پڈوا کے مارلیس کے بیانات میں کسی قدر زیادہ
 صاف ہو گیا ہے جو کثر نہ تھے۔ لیکن سیاسی طور پر یہ بے اثر نہایت ہوا۔ کیونکہ یہ مانہ

وسطی کی سلطنت کے ایک نظریہ سے خلط ملط ہو گیا تھا اور وسیع پیمانہ پر اس کی اشاعت کبھی نہیں ہوئی۔

اب رہا اس زمانے میں اس معیار کے اظہار کا سوال جب پہلے پہل اس طاقت آئی تھی۔ اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ افراد کے باہمی تعلق کے بارے میں جدید نصب العین کے کچھ اشارات ہائز کی تصنیف یوں اچھن میں مل سکتے ہیں۔ اس معرکہ آرا کتاب میں جماعت کے سائے نظام کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ افراد ذاتی تنغظ کے لئے باہم دیگر مل کر رہا کرتے ہیں۔ وہ اپنی اپنی ذاتی حق کو ایک ایسی مرکزی حکومت کے سپرد کر دینے کے لئے رضامند ہو جاتے ہیں جس کا وجود ابتداء میں جمہور کی مرضی پر مبنی اور ان سب کے حق میں یکساں طور پر فائز بخش ہوتا ہے۔

اب یہاں ایک ایسا اصول پیدا ہو گیا جو موجودہ حکومت کی طرف سے بے اطمینانی کو حق بجانب قرار دے سکتا تھا لیکن یہ ایک انقلابی تلقین کی صورت اختیار کر سکا۔ کیونکہ ہائز کا خیال تھا کہ جو حکومت ایک مرتبہ قائم ہو جائے اس کو پھر ہمیشہ کے لئے کل اختیارات حاصل ہو جانا اور کسی کے ماتحتی میں نہیں رہنا چاہئے۔ تبادله اختیارات ہو چکا تھا گویا ہم پھر ابھی تک وزیر اختیار کی فرازدائی میں موجود ہیں معاشرتی معاہدے میں ہائز کو بھی انگریز شیش کے ساتھ جگہ دیا جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حالانکہ ہائز کی تصنیف میں ایسا خیال بہ شکل نظر آئے گا۔ مگر دونوں اس بارے میں ہم نوا ہیں کہ تبادله اختیارات سے عوام اس قبضہ اقتدار^{اعلا} سے نظری طور پر بھی محروم ہو جاتے تھے جو انجام کار ظہور پذیر ہو جایا کرتا ہے۔

ابتداءً حکومت کے نظریہ سے یہ تخیل ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کثیر التعداد اشخاص سیاسی نقطہ خیال سے مساوی نہیں ہیں جن پر حکومت مطلقہ کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ سیاسی حالات کے جس اصلی تغیر سے مساوات کا معیار واقعی بار آور ہو سکا۔ وہ بعض ممالک میں یکایک واقع ہو گیا۔ اور بعضوں میں اس کا ظہور رفتہ رفتہ ہوا تھا۔

انگلستان میں کثیر التعداد باشندوں نے اپنی طاقت کو سولہویں صدی کے بعد آہستہ آہستہ با اثر بنا دیا۔ سیاسی قبضہ اختیارات کے دستور کی درستی پورٹیتی انقلاب اور اس کے بعد ۱۸۳۲ء میں ہو گئی تھی۔ اس طرح قانون اور سیاست دونوں باتوں میں تمام بالغ اشخاص کو بدرجہ مساوی الحق بنادیا گیا لیکن فرانس میں زمانہ وسطی کی قدیم حالت اس وقت تک جاری رہی جب تک ۱۷۸۹ء کا انقلاب عظیم نہ واقع ہوا تھا۔ قدیم حکومت کی طاقت سے اس کے مخالفین اور بھی زبردست ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ امر مشکوک ہے کہ بن جرایم کا اخوت کے نام پر ارتکاب کیا جاتا تھا وہ انقلاب کے سبب سے سرزد ہوئے تھے یا اس فرقہ بندی کے باعث جو مدت الایام سے رائج تھا اور جس کی وجہ سے یہ انقلاب رونما ہوا تھا۔

روسو کا نصب العین

اسی آثار میں تبدیلی خیالات کا آغاز ہو گیا تھا اور انقلاب کی تلقین روسو کی تصنیفات میں چھلکنے لگی۔ ان تصنیفات کی تشریح بار بار اور بخوبی کی جا چکی ہے۔ اب اس بات کے علاوہ اور کچھ دکھانا ضروری نہیں کہ اس بنیادی خیال

سے ان تصنیفات کو اس طرح تقویت پہنچی کہ تمام انسان مساوی الدرجات میں۔ معاشرتی معاہدے کے نقطہ نظر کے مطابق جماعت میں لوگوں کا اتحاد ایسے مساوی حقوق و اختصاص کا اتحاد ہوتا ہے جو اتحاد کو عمل میں لانے کے وقت مساوات کی ضمانت نہیں کرتے ہیں جیسا کہ لیویاتھن میں دکھایا گیا ہے۔ روسو نے جمہور کی قیام کی ہوی حکومت اور معاشرہ کی بنیاد یا افراد کے باہمی تعلقات ان دونوں چیزوں کے مابین ایک حد امتیازی قیام کر دی تھی۔ موصوف کی نگاہ میں قدرتی امتیاز سرف وہی اتحاد ہو سکتا ہے جس میں بنیادی مساوات یا اخیت کی حفاظت کی جاتی ہے اگر تمام جماعت کی ساخت کا دار و مدار ایک ایسی شرکت داری پر منحصر ہو جس میں مساوی الحقوق و اختصاص اپنی اور دائمی نسلوں کی طرف سے شامل ہوتے ہیں تو ایسے اتحاد کی نوعیت ایسی نہیں ہے جیسی کہ اس حالت میں ہوتی ہے جب ارکان اتحاد اپنی اپنی آزادی کسی فائق اور برتر طاقت پر قربان کر دینے کے لئے اس میں شامل ہوتے۔ ایک معنی میں یعنی باہر کے خیال کے مطابق جماعت انسانوں کے ایک ایسے مجموعہ کو کہتے ہیں جس میں وہ کسی کی اطاعت کے لئے باہم معاہدہ کر لیتے ہیں اور دوسرے معنوں میں جماعت اس گروہ انسانی کا نام ہے جس میں وہ سب ایک رفتہ اخوت سے منسلک ہونے کے لئے عہد کرتے ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اگر جمہور کا براہ راست حکم نہ چلنا ہو خواہ اس کی وجہ ہی کیوں نہ ہو کہ انہوں نے اپنی طاقت اور اپنے اختیارات خوشی سے خود لیک برتر قوت کے سپرد کر دیئے اور وہ ان سے زبردستی چھینے نہیں گئے۔ تو جتنی قسم کی حکومتیں رائج تھیں وہ سب خراب تھیں۔ ان حکومتوں سے ایک قدرتی حکومت یا یوں

کہنا چاہئے کہ ایک حقیقی امر کی پامالی ہوتی تھی۔

”انسان آزاد پیدا ہوتا ہے اور ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے“ یہ الفاظ معاشرتی معاہدے کے شروع میں استعمال کئے گئے ہیں انھیں الفاظ میں اس حد تک مصیبت کار و نار ویا گیا تھا جس کی وجہ سے انقلابی شورش نمودار ہوئی۔ جس ہیئت ناک حکومت کے ساتھ روسو گروٹشیس کو ایک ایسا شخص قرار دیا ہے جس نے ان زنجیروں اور بھی مضبوط بنادیا تھا اس پر غور کرنا باعث پیمپی ہوگا۔ گروٹشیس کا نام بار بار آگیا ہے روسو کے اس غیظ و غضب سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ احیاء کا معیار کس قدر مکمل طور پر فراموش ہو گیا تھا۔

صرف خاندان ہی ایک قدرتی معاشرہ ہے اور تمام جماعتیں رسمی اور انسانی کی بنائی ہوئی ہیں۔ حکومت بھی واقعی اس حد تک ایک رسمی جماعت ہوتی ہے جہاں تک اس کا ظہور کسی آزاد اقرار نامہ کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن اس میں کسی طرح انفرادی آزاد سلب نہیں ہوتی۔

روسو کا خیال ہے کہ تمام انسان قدرتی طور پر نہیں بلکہ سیاسی طور پر مساوی ہوتے ہیں اگر ایسا ہے تو پھر اس جدید مساوات کے کیا معنی اخذ کئے جاسکتے ہیں جو معاشرتی معاہدے میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اس کتاب میں فقہ وارانہ قانون سازی اور مراعات اور ان لوگوں کے طرز عمل کی مخالفت کی گئی ہے جو دوسروں کے بمقابلہ قدرتا اپنے اغراض کا زیادہ خیال کیا کرتے ہیں ان کی یہ عادت ابھی تک قائم ہے اور اس کی حمایت میں قدیم زمانے کا یہ غدار ابھی تک پیش کیا جاتا ہے کہ انسان کم و بیش زمین اور طاقتور پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن روسو کا

یہ خیال حق بجانب ہے کہ اس کی دستی اسی طریقے سے ہو سکتی ہے کہ تمام انسانوں کی باہمی مماثلت کا دستور اس حد تک رائج کر دیا جائے جہاں تک وہ مملکت کے رکن ہوں۔ روس نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ کسی حکومت کے قائم کرنے میں محض ذہین اور ہونہار اشخاص ہیں بلکہ تمام اشخاص یکساں طور پر شریک معاہدہ ہوتے ہیں خواہ ذہین ہوں نہ ہوں۔ اقرار نامہ کی رو سے جس قدر جماعتیں شریک ہوتی ہیں سب مساوی ہیں خواہ دوسری صورتوں میں وہ یکساں نہ ہوں سیاسی مساوات کے یہ معنی ہیں۔

مگر یہ بتانا کہ سیاسی مساوات اصل معنوں میں کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ ذرا مشکل کام ہے لیکن مساوات کوئی فرضی فحش نہیں ہے۔

ایک ذی اقدار جمہور اس مقصد کے لئے فرمانروائی قائم کرتا ہے۔ حکومتیں کئی قسم کی ہوتی ہیں اور خرابی کی طرف بھی مائل ہو سکتی ہیں لیکن جمہور یا اختیاری فرمانروا ایک ایسی چیز ہے جس میں کبھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ گویا یہ نگھنا کہ اختیار فرمانروائی ایک ناقابل انتقال چیز ہے اور کسی حکومت کے قائم ہو جانے کے بعد بھی وہ زایل نہیں ہو جاتا (جلد دوم باب اول) بعد میں اس بیان کی مشکل اختیار کر لیتا ہے "کہ جمہور کے ہاتھوں ہی میں غنان حکمرانی رہنا ہی محض ایک محفوظ طریقہ ہے"

بادشاہوں مجتہدوں اور تمام قسم کے صوبہ داروں پر ہمیشہ شک کی نگاہ رہنا چاہئے کیونکہ وہ اپنی قابلیتوں ہی کی بدولت مقدر ہو جاتے ہیں اور اس طرح باختیار ہو جائیں وہ ایک ایسی صورت حالات کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی طاقت کام میں لا سکتے ہیں۔ جس کو محکوم ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں چاہتے

حق انقلاب کے متعلق صرف روس ہی نے اپنے خیالات ظاہر نہیں کئے

حالانکہ دوسروں کے بہ مقابلہ موصوف کو زیادہ واضح طور پر یہ معلوم اور محسوس ہوتا تھا کہ جمہوری فرما زروائی کے تصور سے کیا کیا عملی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے نظریہ سازوں کا خیال تھا کہ دنیا میں ایک ایسا قانون قدرت موجود ہے جس کے مطابق قبول بلکہ اسٹون ایسے قدرتی حقوق مثلاً زندگی اور حریت حاصل ہوتے ہیں جس پر نہ کوئی انسان کا وضع کیا ہوا قانون حاوی ہو سکتا ہے اور نہ جس کا امتیض کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں تو ایک ایسا انقلابی تخیل کام کر رہا تھا جسکو قانون مسلط کی بنیاد بتایا جاتا تھا۔ کیونکہ ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے موجود آئین سے قانون قدرت کے مطابق اس کی حق شکنی ہوتی ہے یہ قانون قدرت کسی کو بھی نہیں معلوم ہے مگر ہر شخص اس کا حوالہ دے سکتا ہے۔ لوگ ہر طریقے سے اس بات پر متفق تھے کہ اس قانون قدرت کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو بہ حیثیت انسان چند حقوق حاصل ہیں خواہ معاشرے اس کی کوئی بھی حیثیت نہ ہو اور وراثت اسکو کوئی بھی حقوق کیوں نہ حاصل ہوں۔

جو حکومتیں اس زمانے میں موجود تھیں ان کو پامال کرنے کا ایک اعلیٰ ترین باعث قدرت تھی لیکن عملی طور پر اخوت پسند اور مساوی درجات قوم کی بلا واسطہ حکومت انقلاب پسندوں کے ہاتھوں سے بھی نہیں قائم ہو سکی جن کے دلوں میں رد سو کی تعلیم سے تحریک ہوئی تھی۔ بالراست جمہوری حکومت چھوٹے چھوٹے گروہوں ہی میں قائم ہوتی ہے لیکن زمانہ انقلاب کو تمام فرانس جس پر شاہی حکومت تھی فرما زروائی کے لئے حاصل ہوا تھا۔ اسی وجہ سے ایک بالواسطہ جمہوری حکومت قائم کرنا پڑی اور پیرس کی مختلف انجمنوں اور مشورہ دہندہ مجلسوں نے مرکزی حکومت کے قدیم طریقے

اختیار کئے۔ لہذا انقلاب ہی کے اصول سے جس نے شاہزی حکمرانی کا وجود دنیا سے مٹا دیا تھا اور بھی تمام حکومتیں یا مال ہو گئیں جو انقلابی عین قائم ہوئی تھیں کیونکہ روسو کے سچے ماننے والے ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ اگر تمام قوم ہر ایک مسئلہ پر رائے زنی نہ کرے یعنی روٹ نہ لے، تو ہر قسم کی حکومت جابرانہ حکومت ہو سکتی ہے۔

روسو کی ایک تصنیف جس کا نام ”انسانوں کے مابین عدم مساوات کی ابتدا“ ہے اس میں اسی عام موضوع پر بحث کی گئی ہے اور تسلیم کیا گیا ہے کہ تمام انسان قدرتی مساوی نہیں ہیں لیکن اس میں ایسے سیاسی عدم مساوات کی مخالفت کی گئی ہے جو قدرتی مساوات پر مبنی ہو۔ روسو نے واضح طور پر اس وقت کی تمام مشکلات بیان کی ہیں لیکن سب کا باعث عدم مساوات ہی کو قرار دیا ہے۔

روسو رقمطراز ہے کہ اگر کوئی نوعمر کسی سن رسیدہ پر حکمراں ہو یا ازکار رفتہ شخص کسی عقلمند آدمی کی رہنمائی کرے اور چند اشخاص کو ضرورت سے زیادہ سامان آسائش حاصل ہو جب کہ دوسری طرف دیگر صدا بانگ خاص کو خاص خاص حاجت بھی نصیب نہ ملے تو ایسی حالت میں بھی قدرتی عدم مساوات کا اظہار غلط پہلو سے کیا جاتا ہے۔ روسو نے جو واقعات بیان کئے اور سیاسی فیصلے صادر کئے ہیں ان کی غلطیاں تو بہت آسانی سے بتائی جاسکتی ہیں۔ مگر جو بات آسان نہیں ہے اور اس کے علاوہ نہایت اہم بھی ہے وہ اس پر غور کرنا ہے کہ روسو نے عام تکلیف اور اس کے دفعیہ کے متعلق تسلیم شدہ خیال کا اظہار کس قدر وضاحت کے ساتھ کیا ہے اگر ہم تمام انسانوں کو مساوی سمجھ لیتے تو انقلاب پسند یہ کہتے کہ ہم کو کم از کم مساوات مد نظر رکھ کر بذریعہ مقابلہ یہ دریافت کر لینا چاہئے تھا کہ ان میں کون بہتر انسان ہیں

پس عدم مساوات کی بجائے سیاسی مساوات تخلیم کرنی ہے ہم کو یہ پتہ چل سکتا تھا کہ تمام انسان فطرتاً برابر نہیں ہوتے مگر بحفاظت اس کے کہ کچھ اشخاص میں خاص خاص قابلیتیں ہوتی ہیں تمام انسان دراصل ہمہ پاد اور محافل میں لیکن حقوق کے معاملے میں سیاسی مساوات بالراست جمہوری طریقہ حکومت کے ذریعہ سے قائم ہو سکتا تھا۔ روسو کے سیاسی تصویرات منتشر اور ناقابل عمل تھے لیکن جس معیار کا اثر اس کے دل پر پڑا تھا اس کے کوشش اشخاص حامی اور مؤید تھے۔ اور جو تسخیر آمیز نتائج اس کے استعمال کی پہلی کوشش سے رونما ہوئے ان کے بعد بھی یہ نصب العین قائم رہا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ نیابتی حکومت کی مخالفت سے ہی تمام انسانوں کو مساوی سیاسی حقوق دینے کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ حالانکہ روسو کا خیال تھا کہ جمہوری طریقہ ہی ایک ضروری وسیلہ ہے پھر بھی ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس کے علاوہ اور بھی وسائل موجود ہیں اگر واقعی تمام انسانوں کو ایسے بڑے بڑے جمہوروں میں برابر سیاسی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں۔ جن میں تمام مسائل پر براہ راست رائے زنی نہیں ہو سکتی تو ہم اس کے سیاسی پیش نامے کے متعلق اپنے فیصلے کا لحاظ کئے بغیر ناانقلاب کے معیار کی قدر و قیمت کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ روسو کے بیان میں درج ہے وہ نصب العین یہ ہے کہ ایسے افراد کی پیدائش اور ارتقاء ضرور ہونا چاہئے جنہیں اپنی تمام قابلیتوں کے اظہار کا حتی الوسع آزاد ترقی ملے۔ تاہم معنی یہ کہ ایک انسان کی ترقی کے لئے کسی دوسرے انسان کی قربانی نہ ہوگی۔ سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ سب میں ایک رشتہ برادرانہ موجود رہے اور ہر شخص خود آزاد ہے۔ اس کے بھی

زیادہ ایک ادب اساسی تصور جو بالکل حقیقت بجانب سبب یہ ہے کہ انسان یقیناً "اچھا" ہوتا ہے۔ مساوات کی ابتدائی بنیاد میں یہ تبدیلی نہایت ہی ارباب فہم کے ذریعے سے واقع ہوئی حالانکہ ان کے آرائیق ان کے نزدیک قوم کے اہل خیال ملک اور باہر سے تھے۔ کیونکہ بالخصوص بازرگی فطری تنگ خیالی جو یونین فرقہ سے ترکے میں ملی ہوئی ہے کہ خرابی کی طرف مایل ہونا سرخشت انسانی میں داخل ہے۔

معاشرتی تنظیم انسان کی نزاع پسندی کا نتیجہ ہے انسان کو ترقی حکومت کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے روس کا خیال تھا کہ حکومت انسان کو قعر ندلت میں گرائی ہے کیونکہ انسان آزاد اور خود مختار ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر جماعت ایک خراب شے تھی تو اس کا ظہور کیونکر ہوا؟ وہ بنی کس طرح؟ جماعت کا قیام اس وجہ سے ہوا کہ یہ دو خراب چیزوں میں نسبتاً کم خراب تھی۔ قدرتی حکومت قدرتی طاقتوں مثلاً مجمع وغیرہ کے نامزد یہ معدود نمود کی وجہ سے مثالی جا رہی تھی۔ اس پامالی سے بچنے کے لئے افسانوں نے حسب دستور متحد ہو کر اپنے پر رضانہ ظاہر کی بالفاظ دیگر حکومت کا وجود جس قدر کم ہوا اسی قدر اچھا ہے۔ کیونکہ اس طرح ہم ایک ایسی آزادانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں جو فطرتاً پاکیزہ انسان کو نصیب ہوتی ہے یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ حکومت ایک خراب شے ہے یا فطرت انسانی کا فطرتی نتیجہ تصور کی جاتی ہے ان تخیلات کا نتیجہ زمانہ حال میں یہ ہوتا ہے کہ طوائف کی یا فخر اکیست کا دور دورہ ہو رہا ہے لیکن ان مسائل پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے ہماری موجودہ بحث کے لئے سب سے زیادہ اہم بات اس خیال میں اعتقاد رکھنا ہے کہ فطرت انسانی شروع شروع میں پاک ہوتی ہے یہ زیادہ اعتقاد ہے جو تمام بشر

بڑے انقلاب پسندوں کے دل پر جاگزیں تھا۔

واقعات میں معیار کا وجود

انقلاب کے متعلق تمام واقعات ہر کس و نا کس پر روشن ہیں لیکن شاید یہ تباہی دنیا ایک ضروری امر ہے کہ قبل اس کے کہ وہ واقعات بیان کئے جائیں جن میں اس معیار کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔ اس کے ان معنوں پر بحث کرنے کی ضرورت کیوں ہے جو روسو نے اخذ کئے ہیں یہ خیال تمام تر صحیح نہیں ہے کہ انقلاب کے بانی مابانی فلسفہ و ان شخصوں سے لیکن یہ درست ہے کہ دوسرے نصب العین کی تاریخ کے بہ مقابلہ زمانہ انقلاب کے معیار کی ختم رج اس کے علی جامہ پہنانے کی کوشش کے قبل ہی کی جا چکی تھی۔ اس کا نشانہ نہیں ہے کہ جس ضرورت کے سبب سے یہ معیار ظہور پذیر ہوا تھا اس کا احساس اس وقت نہیں ہوا جب تک کہ روسو یا اس کے معاصران باب خیال نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انقلاب کسی سیاسی نظریہ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ لوگ ایک خاص مصیبت میں مبتلا تھے اور وہی کلفت اس کا باعث ہوئی۔ آر تھر نیگ کو جو خوابیاں نظر آتی تھیں ان سے ہر کس و نا کس کو واقفیت ہے یعنی :-

”لوگ اسی قدر غیر مہذب ہیں جس قدر ان کا ملک ویرانہ ہے ان کا شہر کام پورگ ایک نہایت کثیف مقام ہے اس میں بچے مکانات ہیں جن میں کھڑکیاں بھی ندارد پیادہ راہ گیروں کے لیے چوڑے بنے ہوئے ہیں وہ بھی اس قدر غراب اور جگہ جگہ شکستہ کہ قدم قدم پر راستہ چلنا دشوار ہے کہیں ذرا بھی آرام کا نام و نشان نہیں

مگر بائیں ہمسہ یہاں ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جس میں آبادی بھی ہے اس کا مالک انس موی چیشو برانڈ کون ہے؟ جس کے اعصاب اس قدر مضبوط ہیں کہ وہ ایسی کثافت اور افلاس کی دنیا واری کی حالت میں یہاں رہتا ہے۔ ایک چیشو برانڈ اپنی نو عمری کی حالت میں یہاں رہتا تھا اور زمانہ حالیہ میں وہ دور قدیم کی تعریف کیا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ آر تھرنے مندرجہ ذیل حالات قلمبند کئے ہیں ”اس صوبہ کا متعہ حصہ میں نے دیکھا ہے اس کا تہائی حصہ غیر فروغ پڑا ہوا ہے۔ قریب قریب کل رقبہ مصیبت میں گرفتار ہے۔ بادشاہوں۔ وزیروں۔ پارلیمنٹوں اور حکومتوں کے پاس اپنے ان نقصانات کے لئے جو اپنے ہزاروں آدمی جو خاکش ہو سکتے ہیں سست اور بے کار اور کوٹھکڑی کو فوج ہیں اس کے لئے نہ اس خود رانہ حکومت ذمہ دار ہے اگر نہیں تو جاگیر دار شرفاء کے اسی طرح قابل نفرت نقصانات اس حالت کے لئے مورد الزام ہیں“

بے زبان زراعت پیشہ لوگوں کے غیظ و غضب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف بغاوت پھیل گئی لیکن اس سفاکانہ کارروائی میں بھی ہر شخص کو ایک ایسی ضرورت نظر آ سکتی ہے جس کے سبب معیار ظہور پذیر ہوا کرتا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں جو کچھ حال تمام واقعات کا شائع ہوا ہے اس میں اس زمانے کی شکایات و مصائب کی داستان طویل درج ہے اس بیان سے اور اس قسم کے دیگر حالات سے بھی ظاہر ہے کہ اس وقت کی ضرورت کیا تھی۔ یہ ضرورت اقتصادی تو تھی ہی مگر سیاسی بھی تھی۔ مالی مصائب اور وحشیانہ افلاس کے ساتھ ساتھ متروک نظام اور خاص حقوق کارور تھا جس کے سبب سے جماعت کی تمام قوموں کا رخ ہی بدلت گیا۔ خوف زیادہ تر نادانستہ طور پر ایک تصور لوگوں کو اٹھار کر میدان عمل میں لانا تھا۔ یہ ایک خواب تھا کہ اگر خاص

حقوق کا دستور مٹا دیا گیا تو سب کو خوشحالی نصیب ہو گئی۔ لوگ چاہتے تھے کہ کوئی شخص ان کا بادشاہ ہو جائے تو ان کے جان و مال کی حفاظت کرے ان کو مصیبتوں سے نجات دلائے۔ مگر اس نجات کے حامل ہونی سے اس قدر خیر واقع ہوئی کہ لوگوں کا یہاں نہ بھر لبریز ہو گیا۔

دنیا میں ایک کثیر تعداد ایسے اشخاص کی ہے جن کو اس وقت اپنے حقوق کی غذا بھی فکر نہیں ہوتی جب تک ان کو دونوں طریقوں سے یعنی جسمانی اور دماغی نقصان نہیں پہنچ جاتا لیکن اس حالت تکلیف کو برقرار رکھنے کے لئے حکومت مسلط کی تمام طاقت صرف کر دی گئی تھی کہ انجام کار دیہاتے انقلاب کی طغیانی سے تمام شہر شکست ہو گئے اور کل نظام متروک کیا گیا۔ پیرس نے علم بغاوت بلند کیا بائیسٹیل چھین لیا گیا اور جمہوری جماعتوں نے سرتاپا اصلاح کے حق میں رائے دی اس کے بعد انقلاب کی قوتیں آپس ہی میں تقسیم ہونے لگیں۔ ایک متروک طریقے کی اس قدر خرابیوں کے باعث بے شمار بدبیر اصلاح پیدا ہو گئے اور رعب و اسے کام لیکر جس سے حکومتیں بھی قائم ہو جاتی ہیں اور دیوتا بھی بن جاتے ہیں ان لوگوں کے خلاف نہایت سخت قوانین عائد کئے جانے لگے جو قدیم خرابی کو از سر نو اختیار کرنے کے علاوہ کسی اور خستے کے تمنہی تھے۔ زمانہ احیاء میں جو بادشاہ مقرر ہوئے تھے وہ سب فرانس جدید کے خلاف یعنی ۱۷۹۱ء میں متحد ہو گئے اور دوسری طرف انقلاب پسندوں نے افواج کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ جب خانہ جنگی کا اندیشہ ہونے لگا تو ۱۷۹۳ء میں لوئی شہنشاہ کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

یہ تمام جدوجہد فرانس کے تمام باشندوں کو مساوی سیاسی حقوق ملنے کے لئے

کی گئی تھی۔ ملک میں امتیازی حقوق اور فرقہ بندی کے دستور کا استیصال کر کے حقوق کے سیاسی مساوات کی توسیع کی جانے والی تھی لیکن مسلط حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اسلئے مختلف جمہور اقوام اعلیٰ کو اپنے قبضے میں کرنے کے لئے آپس میں لڑنے لگے یہ س میں جماعتی کشمکش بہت شدہ و مد کے ساتھ جاری ہو گئی۔ تمام فرانس میں ایک انتشار کا عالم پائی رہی تھا۔ دور انقلاب کے افواج ۹۲-۹۳ء میں سرحد کے اس پار چلے گئے۔ اس اصولاً نہیں بلکہ عملاً یہ صاف طور پر ظاہر تھا کہ مسلط حکومت کے بغیر بھی فرقہ واری اور حقوق خاص کے دستور کی جنگینی ممکن تھی۔ لیکن ایسا کرنے سے کسی کی بھی حالت سنبھل نہیں سکتی تھی۔ بدامنی اور زبردست فوجوں کی وجہ سے ۱۹۵۶ء میں ایک ڈائریکٹریٹ (مجلس نظام) قائم ہوئی جس نے یونائیٹڈ پارٹی کا نام روشن کر دیا۔ اس کا انجام یہ نکلا کہ پہلا تو فصل جو مقرر ہوا وہی ۱۹۵۶ء میں شاہنشاہ ہو گیا۔ مساوی سیاسی حقوق کی تلقین سے ایک قسم کی سیاہانہ خود مختاری پیدا ہو گئی اس کی بدولت اوسط درجہ کے شہریوں کو کچھ حاصل بھی ہو گیا اور یہ تلقین یوں ہی برابر کام کرتی رہی جس کے زیر اثر ۱۹۵۶ء کی تحریک کا ظہور ہوا۔

نصب العین کی حد بندی

لیکن یہاں یہ بیان کر دینا بھی مناسب ہے کہ جس حصول مساوات کو دور انقلاب نے اپنا نصب العین مقرر کیا تھا اس میں قابلیت کا لحاظ نہیں کیا گیا تھا۔ مساوات بہ لحاظ استعداد عارضی اور غیر متشکل ہوتا ہے۔ ہم کو یہ نہیں تصور کر لینا چاہیے

کہ دور انقلاب اس مساوات کو ایک امر واقعی بنانے میں ناکام رہا کیونکہ اس زمانے میں اس کے قیام کی کوشش بھی نہیں کی گئی اس دور کے معیار کا یہ مدعا نہیں ہے کہ تمام اشخاص کا دماغ اچھا ہوتا ہے۔ صرف زبانی جمع و خرچ کرنے والے اشخاص جو عقل و خرد سے دور ہیں یہ خیال کر سکتے ہیں کہ وہ قدیم جو شیلے اشخاص پر یہ دکھا کر اپنا اثر ڈال سکتے ہیں کہ سب انسان قابلیت پیدائش اور اخلاقی چال چلن کے اعتبار سے برابر نہیں ہوتے ہیں۔ دنیا میں کسی نے بھی سمجھی ان تمام پہلوؤں سے تمام انسانوں کو مٹا قرار نہیں دیا۔ اگر انقلابی اصول سے ثابت ہو جاتا کہ تمام انسان مساوی نہیں بلکہ یکساں ہیں تو گمراہی کا اندیشہ کم ہوتا۔ ایسا کہنا ایک مجربات ضرور معلوم ہوتا لیکن وہ ایک بے سود مشاہدہ نہ تھا۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ اہالیان انقلاب بحسنہ اسی مجرب کی متواتر فروگزاشت کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔ سیاسی ارباب فہم ہدیر اور کلان یہ سب لوگ واقعی بھول گئے تھے کہ ان امتیازات کی تہ میں تمام انسانوں کی بنیادی حالت مضمر تھی امتیازات کو اس قدر فوقیت دی گئی کہ ان کی وجہ سے ممانعت پر یہ وہ ٹکریا حتیٰ کہ لوگ یہ بھی بھول گئے کہ ہر انسان میں انسانیت ہوتی ہے بعض لوگ چوہا یہ سمجھے جانے لگے اور بعضوں کو دیوتا مان لیا گیا۔ پہلے پہل دور انقلاب یہ اصول قائم کرنا چاہتا تھا کہ تمام انسان ”انسان“ ہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسا خیال کرنا اس تکلیف کا ایک مبالغہ آمیز بیان ہو۔ جس کے خلاف انقلاب پسند طبقہ صدائے احتجاج بلند کر رہا تھا ممکن ہے کہ لوگ یہ بات یقین نہ کریں کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب مدبروں کے دل سے یہ اصول نقش فرسودہ ہو گیا تھا کہ تمام انسانوں کے درمیان ایک عالمگیر رشتہ انسانیت تسلیم ہے ممکن ہے کہ لوگ اس بات کا اندازہ نہ کریں

کہ ہمارا تخیل مساوات ہمیشہ رائج نہیں رہا لیکن اگر کوئی وقت محسوس ہوئی ہو تو ہمیں
زمانہ انقلاب کے ایسے ہی اصولوں کا خیال کر لینا چاہئے جو آج کل عورتوں کے متعلق
راج ہیں۔

حالانکہ فلاطون نے اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے مگر تمام تاریخ سے
چشم پوشی کر کے اور واقعات کا حوالہ دے کر آج بھی مہذب ممالک میں اکثر اشخاص
واقعی ایسا خیال کرتے ہیں کہ ذاتی اختلافات کی وجہ سے لوگ اس بات کو غیر ضروری
سمجھ کر بھول جاتے ہیں کہ جس طرح مرد انسان ہے اسی طرح عورتیں بھی انسان
ہیں واقعی لوگوں کا خیال ہے کہ عورتیں محض اپنی جنس کے سبب اس قدر زور کی اور
فہم نہیں ہوتیں کہ سیاسی مسائل پر غور و فکر یا عمل کر سکیں۔ علم کا ذہن اس بات
پر زور دیا جاتا ہے کہ عورتیں اپنی جسمانی ساخت کی وجہ سے کاروبار سیاست میں
حصہ نہیں لے سکتی ہیں۔ بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ جب اس قسم کی دلیل یہ دکھانے
کے لئے پیش کی جاتی تھی، اپنے جسم کی بناوٹ کے سبب سے عورتوں کو ریاضی
طبیعیات۔ فلک۔ فزیک۔ فنون کے دیگر شعبوں میں مہارت نہیں حاصل ہو سکتی۔ لیکن
اس قسم کے اختلافات کا حوالہ دینا جن سے بنیادی مماثلت کی مخالفت ہوتی ہے
بجائے دور قدیم کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ پیدائش۔ دولت۔ تعلیم اور فہم و فراست
کے اختلافات کے متعلق بھی بالکل یہی کہا جاتا تھا۔ ان اختلافات میں ہر ایک
سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ سیاسی مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کرنے کے لئے تمام طاقتیں
مقابل ہیں اور ان کے اغراض کو دوسری ہی قوم کے اشتخاص بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔
ان اختلافات سے جو دلیلیں اخذ کی گئیں ان سے کسی زمانہ میں فرقہ بندی

اور حقوق خصوصی کو بھنسہ اسی طرح حمایت ہوتی تھی جس طرح آج کل وہ اس لہر کی موذ ہیں کہ عورتوں کو سیاسی معاملوں میں دخل نہیں دینا چاہئے۔

اس قسم کے متروک اور قدیم خیالات کی تردید کرنے کی ہیں ذرا بھی ضرورتیں معلوم ہوتی۔ اگر واقعی دلائل مذکورہ درست ہیں تو صرف اس بات پر غور کرنا کافی ہوگا کہ چونکہ عورتیں بھی بلی۔ سگ مادہ اور دیگر اس قسم کے جانوروں کی طرح بوجہ کنشی کر سکتی ہیں۔ اس لئے یہ بات غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے کہ عورتوں کی دماغی نبھاؤ مردوں سے مختلف ہوتی ہے۔

مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر اکثر اشخاص سیاسی معاملوں میں اس وقت تک دباؤ اور عورتوں کو یکساں نہیں سمجھتے تو ہم کو اس بات کا اندازہ بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں یہ معلوم کس قدر اشخاص ہوں گے جو طبقہ مذکور کے تمام افراد کو انسانوں میں نہیں شمار کرتے تھے اس لئے اس زمانہ میں یہ کہنا کہ مرد و اور دو کا انداز کو وہی سیاسی حقوق حاصل ہونا چاہیئے جو زمینداروں اور درباریوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ کوئی پوچھا بات نہ تھی بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس پر باطل غلاف چڑھا ہوا تھا۔

معیار کے تقاضے

اب ہم اس معیار پر نکتہ چینی کریں گے۔ معیار انقلابی جس وقت بہترین صورت میں تھا اس زمانے میں بھی اس میں واقعات کے متعلق کچھ غلطیاں تھیں۔

ان کے علاوہ کچھ اور بھی فرد گزشتہ موجود تھیں جو قدر و قیمت کے بارے میں اخلاقی فیصلے میں واضح ہو جاتی ہیں۔ گو اس معیار میں مبالغہ آئینری سے کام لیا گیا اور ذرا غلطی ادل میں اس کا قیام بے سود ثابت ہوا۔ نیز اس کے بعد سلطنت میں اس کو قطعاً ناکام بھی نصیب ہوئی لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے یہ دکھانا ضروری ہے کہ یہ کس قدر محدود تھا۔

معار انقلابی میں جو غلطیاں سرزد ہوئیں وہ سب پر ظاہر ہیں ان پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ قدامت کے مقابلے میں ہیں ان لوگوں کے قیود جلد نظر آسکتے ہیں جو ہم سے کچھ عرصہ پیشتر موجود تھے۔

زمانہ موجودہ میں جو بغاوت ہوتی ہے اس سے لوگوں کے دلوں میں انھیں خرابیوں کی حمایت کا عجیب و غریب جوش پیدا ہو جاتا ہے جن کو رفع کرنے کے لئے بغاوت کی جاتی ہے۔

اس انقلاب میں جس سے امیدیں بہت تھیں مگر نتائج بہت کم حاصل ہوئے۔ جو خرابی تھی وہ زبردست معلوم ہوتی ہے اور خراب رویوں کے خلاف جنگ جمل کرنے میں اپنی حسن و خوبی کا اس نے خون کیا ہے اس کے بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح شیٹو براڈ اور جوزف ڈی میسٹرے سے جو بیہوشیاں سرزد ہوئیں ان کا ذکر اس مایوس خیز تذکرہ واقعات میں ملتا ہے۔

ہمیں کے بعد سے سیاسی معیاروں کا صعود ہوا ہے خود سر کے ٹیڑھی بہوول کی موت ہی پر وہ داری کرتی ہے جس حکومت قدیم کا وجود کسی زمانے میں معدوم ہو گیا تھا ایک طرف تو وہ لطف انگیز اور متانت خیز معلوم ہوتی تھی اور دوسری

حائب جدید جمہوریہ اس کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھا۔

انگلستان میں بھی انیسویں صدی کے اشیاء میں یہ باد کرنے لگے تھے کہ دور وسطی ایک زریں زمانہ تھا۔ جب تمام زمیندار نیک سرشت جاگیردار خوش و خرم سردار شجاع اور عورتیں حسین ہوتی تھیں۔ گویا صاف طور پر معیار انقلابی میں اس امر سے ایک نقص کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد وہ باتیں یعنی افسانہ نگاری وغیرہ نہایت شد و مد کے ساتھ رائج ہو گئیں جن کا ازمنہ وسطی میں بڑا دور تھا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے دل میں یہ خیال تھا کہ افراد کے باہمی تعلقات کے متعلق جدید تصور میں کچھ فرو گذاشت لگتی۔ اور ان کی وجہ سے کسی اچھی چیز کی بربادی ہو گئی ہے۔ بیشک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انسانوی معیار سے کسی بہتر اخلاقی فیصلے کا اظہار ہوتا تھا۔ دور انقلاب کے بالمقابل تاریخی واقعات کا کسی قدر بہتر علم لوگوں کو تھا لیکن یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں جو بادشاہتیں اور سلطنتیں موجود تھیں اور جن پر خوش کتابوں کا روانہ تھا ان میں کسی حد تک بجا طرز پر انقلابی معیار کی مخالفت کی گئی تھی۔ قصوں کا اثر بھی سیاسی خیال پر کارگر ہوا۔ مگر چونکہ اس میں ایک دور زریں کی تعریف کی جاتی تھی جس کا کبھی وجود ہی نہیں ہوا تھا اسے کوئی نیا معیار دیا نہیں ہوا۔ اس کی اصلی طاقت صرف اس قدر تھی کہ اس میں انقلاب کے متعلق تمام مبالغہ آمیز لویوں کے خلاف نکتہ چینی کی گئی تھی اس لئے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ خواہ انقلابی معیار بہتر سے بہتر کیوں نہ ہو اس کے خلاف کچھ کچھ لکھنا ضروری ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا منظور ہے کہ یہ معیار کن کن پہلوؤں سے ناقص تھا۔

پہلی بات یہ ہے کہ دور انقلابی میں ایک فرد کے متعلق جو تسخیل تقایم کیا گیا
تھا وہ گراؤ کرنے والا تھا۔ حقوق کو انسانی ملکیت قرار دینے کے یہ معنی تھے کہ لوگ اس کا
کا مطلق خال نہیں کرتے تھے کہ نظام حکومت کا نمود ایک تدریجی امر ہے۔ یہ بھی کہا جاتا
تھا کہ تنظیم معاشرہ انسان کے حقوق قدرتی کی حفاظت کا ایک خود ساختہ اور قریب
قریب خود مختار ذریعہ ہے۔ گویا لوگ انسان کو بذات خود ایک قدرتی ہستی تصور
کرتے تھے اور جماعت ایک مصنوعی یعنی انسان کی بنائی ہوئی اور ایک رسمی چیز سمجھی
جاتی تھی۔ انقلاب پسند اکثر اور قومی جذبات کی مخالفت کرتے تھے جن کی حمایت اگر
وہ چاہتے تو اپنے اصولوں کے مطابق بھی کر سکتے تھے کیونکہ وہ خالص عمومیت
تقایم کرنے کے متمنی تھے۔ نسل یا جمہور کے بنیادی امتیازات کو بالکل نظر انداز کرتے تھے
نیوٹن نے فرانس جدید کی قومی طاقتوں کا استعمال پہلے خود سروں کو معزول اور
رعایا کو آزاد کرنے کے بہانے سے کیا مگر آخر میں اس نے انھیں قوتوں کے ذریعہ سے
تمام قوموں کو فرانسیسی دستوروں کا پابند اور فرانس کے مطلق العنان بادشاہ کا طبع
بنانا چاہا۔ پولین کی فوجی خود سری کے لئے انقلاب کو قابل الزام ٹھہرایا غالباً نامناسب
ہو گا۔ لیکن یہ بخوبی ظاہر ہے کہ انقلاب کے مرغنہ ”انسان“ کو بہت کچھ تصور کرتے
اور فرانسیسیوں۔ اطالویوں۔ جرمنوں اور انگریزوں کے درمیان اختلافات کا
بہت کم خیال کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ تمام انسانوں میں ایک فطری
ممانعت موجود ہے جس کی بناء پر فرقہ واری اور حقوق خاص کے دستور کو مٹا دینے
کے لئے بہت زور دیا جاتا تھا۔ لیکن یقین مساوات میں اس قدر مبالغہ سے کام لیا
گیا تھا کہ خود اس بنیادی ممانعت میں کمزوری واقع ہو گئی۔ جن باتوں میں تمام انسان

ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں ان کو تسلیم کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے باہمی اختلافات کے تسلیم سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ اور جو امتیازات مختلف نسلوں کے مابین واقع تھے وہ خود فرانس کی معاشرتی جماعتوں کے باہمی امتیازات سے بد بجا اہم تھے۔ یہ عام غلطی اس وجہ سے سرزد ہوئی کہ جماعت ایک رسمی شے سمجھ لی گئی تھی کیونکہ اس سے یہ منشا اخذ ہوتا تھا کہ کل اور اصلی معنوں میں ”انسان“ وہی ہے جو درشت یا تہذیبی تعلقات سے آزاد ہو۔ حالانکہ معاشرہ دراصل ایک قدرتی خستہ ہے اور کسی فرد کی ہستی علیحدہ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانوں کے خیالات و افعال میں جو غیر فطری اجزا ہوتے ہیں ان کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ زمانہ انقلاب کے نظریہ سازوں نے جن میں روشن زمانے کی تنگ خیالیاں موجود تھیں اس بات کی ہمت حد سے زیادہ جتنی کہ صدر افعال میں فہم غافل اور ہوشمند کی بڑی ضرورت ہے۔ انھوں نے یہ نہیں غور کیا کہ ہر شخص کے تقریباً نصف افعال جذبات کی تحریک سے سرزد ہوتے ہیں اور ان کا اثر بھی جذبات ہی پر پڑتا ہے نیز یہ کہ تمام افعال قانون تقلید کے اثر سے صادر ہوتے ہیں اور جیسی صنعتی یا مذہبی ہوا جلتی ہے اس کے مطابق ان افعال کا صدور ہوتا ہے اسی طرح ان کا اثر اس ہوا پر پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ افسانہ سازوں نے زمانہ انقلاب کے محدود اغراض کے خلاف آواز بلند کی اور حکومت قدیم کی صفت یا فضا سے جذباتی کو ایک ایسی عمدہ شے قرار دیا جس کو وہ کھو بیٹھے تھے۔

نتیجہ

پس یہ ظاہر ہو گیا کہ زمانہ انقلاب کے معیار میں بھی خامیاں موجود تھیں اس کی تکمیل نہیں ہوئی۔ اور اگرچہ نصف تکمیل ہوئی تھی۔ مگر اس نے اپنے حامیوں کو مایوس کر دیا۔ اس کی وجہ محض یہ ہی نہیں تھی کہ لوگ ان کے شاندار احزاب کی تکمیل کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ دراصل خود اس میں حقیقی کمزوری موجود تھیں۔

اس نصب العین کی اصلی صورت اب باقی نہیں اور اس میں نرمی بھی آگئی ہے اب اس سے ایسا پہلو نہیں پیدا ہوتا جو محض پامال کرنے والا ہو۔ انفرادیت پرستی نیز ذہنی معاطوں میں اس کی اس طریقہ سے درستی کر دی گئی ہے کہ نفرت یا ہر ایک سیاسی جماعت میں تمام شہمنہد بالغ اشخاص کے مساوی سیاسی حقوق تسلیم کئے جاسکتے ہیں۔ اب یہ امر قریب قریب مسلمہ ہی سمجھا جانے والا ہے بہر حال اس قسم کے فقروں میں کہ ”نیک شخص کی ایک طے اور دونوں جنسوں کے بالغ اشخاص کو آزادی حاصل ہونا چاہئے“ ابھی تک زمانہ انقلاب کی صدا موجود ہے اور جذبات انسان کے دل پر اپنا اثر بھی ڈال سکتی ہے۔ دولا انقلاب کے تصورات ابھی تک معیار بنے ہوئے ہیں لیکن یہ سب باتیں صرف معدومے چند اشخاص کے لئے ہیں جو سیاسیات میں کچھ بھی سمجھتے ہیں۔ انکی تعداد کثیر پران باتوں کا اثر نہیں پڑتا۔ تاہم ان لوگوں کو ایک ایسے معیار سے تحریک ہوتی ہے جس کو ہم اس حد تک انقلابی کہتے ہیں جہاں تک اس میں عام طور پر

رائے زنی کا حق دیا جاتا ہے۔ اس راہ کو زندگی کی اس طریقے سے تقسیم ہوتی ہے جس سے سب کی
 نایندگی برابر برابر ہو سکے۔ یہ ہے نتیجہ انقلاب کا اور یہ محض اس شعور کی نشانی نہیں ہے
 جس کو ہم اپنی حاصل کردہ چیزوں میں نہایت منفید تصور کرتے ہیں بلکہ یہ ایک ایسے معیار
 کی ہے جس کو ہم ابھی تک قابل حصول سمجھتے ہیں۔ بعض معنی میں سیاسی حقوق کی مساوات
 پسندیدہ سمجھی جاتی ہے لیکن یہ نہیں خیال کیا جاسکتا کہ ہم کو یہ برکت پہلے ہی سے حاصل ہے
 ذات اور حقوق خاص کا دستور ابھی تک بعض ممالک میں موجود ہے اور ہمیں یہ یقین ہے کہ
 انگلستان اور ریاستہائے متحدہ میں بھی یہ باتیں دوسری شکلوں میں موجود ہیں۔

آٹھواں باب

قومیتِ حالیہ

ابتدائی خیالات

اب ہم ایک ایسے معیار پر بحث کریں گے جس کا ظہور زمانہ حال ہی میں ہوا اور جس کا تعلق ان مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات سے ہے جن میں تمام طبقات انسان منقسم ہیں۔

قومیت کا وجود دورِ احیاء کی فرمانروائی سے جس کے ساتھ حقوقِ انقلابی بھی شامل ہیں ہوا ہے۔ فرانزوا حکومت کی مقامی خود مختاری کا سلسلہ اس بات سے مل گیا کہ باشندوں کو اپنا ذاتی طریقہ حکمرانی پسند کرنے کا حق حاصل ہے اور آئی و

اس تصور کی بنیاد پڑی کہ جو کوئی گروہ کافی مستقل ہو اور ایک قومی شعور قائم کرنے کے لئے جس کے روایات جداگانہ نہ ہوں اس کو خود اپنے طریقہ حکومت کی ارتقار کا موقع حاصل ہونا چاہئے۔

واضح رہے کہ اس سے یہ فرض نہیں کر لیا جائیے کہ قومی خصوصیات مقررہ ہوتی ہیں ہماری موجودہ مقصد براری کے لئے یہی کافی ہے کہ کسی ایک گروہ کے اراکین کی عادتیں اور رسمیں ایسی ہوں جو اور دوسرے جمہوروں کے رکنوں کی عادتوں اور رسموں سے ملتی جلتی ہوں۔ واقعات موجودہ کے بیان کرنے سے لازمی طور پر یہ پتہ نہیں چلتا کہ آئندہ کیا کیا باتیں پیش آنے والی ہیں۔ آج کل تمام دنیا کے سیاسیات اور تجارتی معاملات میں یہ میلان طبع پایا جاتا ہے کہ جو قومیں دور دراز آباد ہیں وہ ایک ہی قوم میں مل جائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یورپی قوموں میں ایک قسم کا بین الاقوامی فرقہ پیدا ہو گیا ہے لیکن فی الحال انسانوں کے ایسے طبقے بھی موجود ہیں جن کو نہ ہم مملکت کہہ سکتے ہیں اور نہ شہر قرار دے سکتے ہیں۔ ان جماعتوں کو ہم قوم کا لقب دیں گے۔ حالانکہ اس نقطہ کا استعمال یہاں ٹھیک نہیں ہے اور اس کے اور بھی متعدد معنی رہ چکے ہیں۔ قومی امتیازات و باتوں کے سبب سے ہو سکتے ہیں (۱) نسل (۲) گروہ پیش کے حالات۔ اول کے سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ صدیوں سے ہمارے بزرگان سلف ہمارے خیالات و جذبات قائم کرتے آئے ہیں اگر تمام انسانوں کی ایک فہرست تیار کی جائے تو جو لوگ راہی عدم موجود ہیں ان کی تعداد ایسے انسانوں کے بہ مقابلہ بدرجہا زیادہ ہے گی جو گلشنِ ہستی میں ہوا کھا رہے ہیں اور اگر دنیا کے کل زندہ انسانوں کو یکجا کیا جائے تو یہی نقطہ

خیال سے ان کے مجموعی خیالات اور افعال کا اثر زمینگان کے خیالات اور افعال کے بغیر بہت زیادہ اہم ہوگا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سیاسی واقعات زیادہ تر عہد گزشتہ کے انہیں اثرات پر مشتمل ہیں۔

شکل و شبابیت۔ عادات دعاغی و جسمانی۔ زبان اور پوشاک میں قومی خصوصیات کا ہونا عہد ماضی کے زمانہ حال میں موجود ہونے کی ایک مثال ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کو جو کچھ واقعات پیش آئے تھے ان کے سبب سے ہمارے معاشرہ کی تنظیم موجودہ شکل میں ہوئی۔ تمام انسانوں کی ایک مجلس شوریٰ یا تمام عالم کے ایک وفاقہ کا معیار قائم ہونے میں ان قوتوں کی وجہ سے بھی ایک مدت صرف ہوگی جن کے ماتحت ابتدائی زمانہ میں طبقہ انسان کی تقسیم ہوئی تھی۔ اگر ان کی کھلی تاریخ نہ ہوتی تو بغیر کسی وقت کے ہم دنیا کا نظام حتی الامکان بہترین تدابیر کے مطابق قائم کر سکتے تھے جو ہمارے قیاس میں آسکتے ہیں۔ کیونکہ ایسی حالت میں تمام لوگ اس قسم کے بنا دیئے جاتے کہ ان پر ایک نہایت اعلیٰ تشریح انسانی کا اطلاق ہو سکتا۔ وہ ایک سانچے میں ڈھال کر ایسے رنگ میں رنگ دیئے جاتے کہ دوسروں کا درس کرے نیسے ایک کی تعظیم بڑی بہت سے ہو سکتی تھی۔ لیکن ہم میں سے ہر شخص فرداً فرداً اور ہمارا ہر گروہ مجموعی طور پر ان نتائج کا مرتفع ہوتا ہے جو زمانہ ماضی کے واقعات سے برآمد ہوتے ہیں یا یوں کہئے کہ ہم اپنے حسب و نسب کے اثر سے مغلوب ہیں ہمیں اس سے فائدہ پہنچا ہے۔ اب رہے گروہ پیش کے حالات ان کے سلسلے میں ہم قدرتی اور انسانی کیفیتوں کا ذکر کر سکتے ہیں۔ قدرتی ماحول۔ آج ہوا اور ذرائع ملک ان سب باتوں سے ہر ایک تسلط یافتہ جماعت میں بڑی بڑی تغیریں واقع ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ کچل ایسے معنوں نے

ان باتوں کے اثرات کا بیان مبالغہ کے ساتھ کیا ہے۔ لہذا نسلی خصوصیات کے متعلق کوئی اصول نہیں قائم کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کسی قوم میں کوئی صفت ہمیشہ قائم رہنے والی نہ تصور کی جائے۔ خواہ نسل کا نیاں درست بھی ہو اور خلقت انسانی کے عادات و فضائل تمام جغرافیائی اور آب و ہوا کی کیفیت کے اثر سے قائم بھی ہوں۔ اس لیے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ انسانوں کی کسی ایک خاص قوم یا نسل کا کسی خاص صفت پر قبضہ مخصوص ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نسل کے خیالات کے خلاف مختلف قومیں مختلف زمانوں میں ایک ہی مقام پر آباد ہوئی ہیں اور ان میں سے ایک کو ترقی نصیب ہوئی اور دوسری قوم اس سے محروم رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی قوم انھیں جغرافیائی حالات میں جن میں وہ ہمیشہ سے رہتی آئی ہیں مختلف زمانوں میں مختلف خصوصیات سے متصف ہی ہیں۔ اگرچہ یہ جغرافیا کی بنا پر مباحثہ مغالطہ آئینہ ہے اور نسلی عادات و فضائل کے متعلق سب کچھ مبالغہ کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت جو قوم جہاں جہاں اور جس جس حالت میں سکونت پذیر ہے وہ دوسری تمام قوموں سے مختلف واقع ہوئی ہے۔ ایک خاندان دوسرے خاندانوں سے بہ لحاظ خون جدا ہوتا ہے اور چونکہ وہ گھر یا جہو جس کو ہم قوم کے لقب سے موسوم کرتے ہیں۔ کم و بیش مختلف خاندانوں کا ایک مستقل مجموعہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ دو قوموں کے درمیان خونی اختلافات بھی ہوتا ہے اور نقل و وطن۔ تجارتی تعلقات اور سفر کے لحاظ سے مختلف قوموں میں یہ تومی تومی فرق مختلف ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم کئی صدی تک ایک جگہ پر رہی ہے تو وہ ماحول کے بدولت دوسری قوموں سے جدا گانہ ہو جائے گی۔

انسانی ماحول سے مراد ہے، مذہبی و رجس باقی اثرات جو ایک انسان

دوسرے انسانوں اور ایک گروہ سے دوسرے گروہوں پر پڑتے ہیں

یہ صاف ظاہر ہے کہ فرداً فرداً شخص کا خیال کر کے یا اس تغیر کا خیال نہ کر کے جو گروہوں میں ایک دوسرے سے مل کر رہنے کے سبب تمام لوگوں میں رونما ہو جاتا ہے کوئی شخص سیاسی مسائل پر غور نہیں کر سکتا۔ اس معاملے میں بھی لی بان ایسے مصنفوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے ”طبع جمہور یا روح قومی“ اس قسم کی اصطلاحات کے استعمال میں مذہبی انسانوں کی جھلک پائی جاتی ہے حالانکہ شاعرانہ نقطہ خیال سے یہ اصطلاحات پر اثر ہوتی ہیں۔

معائنہ ترقی ماحول کے متعلق: یگڈگل نے نہایت اعلیٰ بحث کی ہے اور اس نے اپنی تصنیف میں حالانکہ جمہور کو ایک قابل لحاظ شمع قرار دیا ہے مگر افراد کی ہستی باقی رکھی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قومی خصوصیات پیدائشی نہیں بلکہ خاص طور پر مختلف روایات کا اظہار ہوتی ہیں۔

تقلید کو ایک معنی میں ”قوت محفوظ“ کہتے ہیں اور جہاں تک بعض خصوصیات اصلی ہوتی ہیں ان کی تقلید کر نیسے ترقی حاصل ہوتی ہے۔ جماعتوں کی حیات افراد کی سرگرمیوں کی محض منظر نہیں ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے ہم کو ایک ایسے طبقے کا پتہ چلتا ہے کہ جو ذاتی عادات و خصائل کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔

محض جسمانی تعلقات کے علاوہ ہمیں روایات کے میل جول کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا۔ جو قومیں مدت تک برابر ساتھ ساتھ رہتی ہیں ان میں ان باتوں کے متعلق جو عادات و خصائل میں قابل ستائش یا زندگی میں فائدہ مند ہوتی ہیں اور اس امر کی نسبت کہ قانون اور حکومت کی دنیا میں کیا حیثیت ہونا چاہئے۔ ایک خاص

خیال یا تصور محض صعود پذیر تھا نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی پیدا بھی ہو جاتا ہے۔ یکساں سرگزشت اور یکساں معیار سے اس قدر قومیت بنتی ہے جتنی ایک خون سے نہیں۔
 گویا یہ وہ طاقتیں ہیں جن کے ذریعہ سے وہ گروہ انسانی تیار ہوتا ہے جس کو ہم قوم سمجھتے ہیں۔ انھیں طاقتوں کے اعتبار سے ہم طبقہ کی نوعیت کا اندازہ کر سکتے ہیں اور ہم کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ سیاسی اعتبار میں حیثیت ایک قوت کے اس کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

تاریخ کا انجام یہ ہوا ہے کہ اس قسم کے صد ہا گروہ قایم ہوئے جن میں اسی قسم کے امتیازات اور اختلافات ہوتے ہیں جن کو تسلیم کر نیسے کوئی بھی ذمی پوش سیاسی اہل خیال انکار نہیں کر سکتا۔ یہ اختلافات اور امتیازات ایک مبہم جذبہ کی شکل میں اکثر ایسے اشخاص کے دلوں میں موجود ہوتے ہیں جو کسی طرح بھی قوم پرست نہیں ہوتے اور اس جذبہ سے اس معیار کی حمایت بھی ہوتی ہے کہ اختلافات کو قایم رکھ کر ان کی نشو و نما ہونا چاہئے۔

نصب العین اور اس کے موجود معنی

اب یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ زمانہ حال کا ایک عقلمند قوم پرست کس نہایت پر مختلف قوموں کی مختلف روایتوں کو ترقی سے کر انھیں جاوہ صعود میں لگائے گا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ انسانوں کے گروہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کا یہ اختلاف سود مند کہاں تک ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ

جب یہ ممکن ہے کہ ایک فرد کی حیثیت کو مٹا دینے سے اس کی ذاتی قابلیت بھی منقرض ہو جائے تو سب گروہوں کو دستوروں اور ملکوں کے لحاظ سے بالکل یکساں بنا دینے میں ثابت قدمی یا ذکاوت ایسی خاص خاص صفات کے معدوم ہو جانے کا بھی احتمال ہو سکتا ہے جن کی ارتقا ایک چھوٹی سی قوم میں بھی ہو سکتی ہے۔ ہر گروہ میں ایک خاص صفت ایسی ضرور ہوتی ہے جس کی تمام انسانوں کی فلاح کی غرض سے حفاظت کرنا بہت مفید ہوتا ہے۔ لیکن اس صفت کا تحفظ اسی حالت میں ممکن ہے جب گروہ کو اپنے ذاتی قانونوں اور دستوروں کی امتیازی ترقی کے لئے موقع حاصل ہو گا۔

واقعات ماضیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی نسل اپنی خالص سیاسی زندگی سے محروم ہو جاتی ہے تو اس کی کارگزاریوں کی وقعت ٹھٹھ جاتی ہے اور جب کسی قوم کو سیاسی آزادی حاصل ہو جاتی ہے تو اس کے علوم و فنون سے تہذیب کی عام ترقی ہونے لگتی ہے۔

عہد ماضی میں متعدد چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتوں کے وجود سے ایتھنز اور فلورنس میں فنون کو بہت ترقی نہیں ہوئی یونانی شہروں میں فلسفہ اور سائنس کا بڑا زور رہا۔ اور انھیں کی بدولت بین الاقوامی قانون معرض وجود میں آیا جس کی ابتداء رڈچ قوم میں ہوئی تھی۔ اس لئے قوم پرست اصحاب قد ثناء یہ دلیل پیش کریں گے کہ جب ایک گروہ ایسی چیزیں پیدا کر سکتا ہے جو تمام طبقہ انسان کے لئے مفید ہو سکتی ہیں تو ہر ایک گروہ کو بھی جسے اپنی مہذب و آیات پرناز ہو آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس لئے جو تصور پیش پیش ہے وہ یہ نہیں ہے کہ چھوٹی چھوٹی ملکیتوں یا کمزوری کا اعتراف جذبہ کے لئے بڑا

ہو کر کر لیا جائے جس طرح جذبات نہیں بلکہ عقل خالص اس بات کی ہدایت کرتی ہے کہ اگر کم زور شخص ایک نہایت تندرست وحشی کے بہ مقابلہ اپنی نسل کو زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے تو ہمیں اس کو خارج نہیں کر دینا چاہئے لہذا معقولات کا اقتضا ہے کہ ہم کو ایک چھوٹی سی حکومت سے بھی کم از کم اسی قدر نفع بخش نتائج کی توقع رکھنا چاہئے جس قدر عظیم الشان اور دولت مند سلطنتوں سے حاصل ہوتے ہیں ہمیں لازم ہے کہ سیاسیات غلطی میں ہر ایک جداگانہ قومی گروہ کو اصلی سیاسی آزادی کا موقع دیں ورنہ افراد کی باہمی تعلقات کی تنظیم کرنے کا خواہ کوئی بھی طریقہ ہو وہ ہر ایک کے لئے درست نہیں ہو سکتا۔ مختلف مملکتوں میں فرق قانون اور عملداری کے طریقوں کا ہونا چاہئے اور اس تفریق میں انسانی جماعتوں کے امتیازات جھٹکتے ہوں۔ لہذا خود مختاری کے علاوہ اور خاص خاص باتوں کے ارتقار کی بھی حمایت لازم ہے۔ ریل رسیل کی روز افزوں سہولت کی وجہ سے جذب کرنے کی جو عادت ہو گئی ہے اس کی درستی ہو جانا چاہئے۔ سیوم اس معیار کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہر گروہ علیحدہ علیحدہ ہے کیونکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ افراد کے مابین علیحدگی کی حالت میں کسی طبقہ کا صعود بھی نہیں ہو سکتا قومیت کی رد سے مختلف گروہوں کے درمیان قریبی رشتہ ہونا چاہئے لیکن اس کا مطلب نہیں کہ اختلافات کا وجود ہی نہ ہے۔ ایسا قریبی رشتہ جس کو اتحاد کہیں یا اخوت اس لئے قائم ہونا چاہئے کہ وہ اختلافات تہذیب کے ساتھ اور بھی زیادہ ظہور پذیر ہوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر مختلف انسانوں کے درمیان رشتہ دوستی دراصل ایگانیت ہو تو وہ سب اشخاص ایک ہی سانچے

میں ڈھل جائیں کیونکہ یہ دوستی اور یکسانیت اگر سمجھ بوجھ کر کی گئی ہے تو اس سے
 ذہنیت کو نقصان نہیں پہنچ سکتا بلکہ اور اس کی ترقی ہوتی ہے اس میں شک
 نہیں کہ راہ راست دشمنی سے جس قدر موافقت اور یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے
 اتنی دوستی سے نہیں ہوتی۔ انسان اپنے دشمن پر غالب آنے کے لئے اس کے
 اطوار و حرکات کی تقلید کرتا ہے۔ جہذا انسانوں کے بہ نسبت جاہل انسانوں
 میں باہم دیگر ایسا وہ موافقت پائی جاتی ہے اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ
 قومیت کا معیار خواہ مخواہ شہنشاہیت کا مخالف ہو۔ اصل میں دونوں میں مخالفت
 اس وجہ سے ہے کہ لوگوں کو ان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی اندازہ اچھی طرح
 نہیں ہوتا ہے اگر قومیت کا منشا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی نظام حکومت میں متعدد
 نسلوں کے مابین قریبی تعلق ہونا چاہئے تو شہنشاہیت کا بھی یہ اقتضا ہے
 کہ ایک ہی حکومت کے اندر مختلف اغراض کا خیال رکھا جانا چاہئے۔

معیار کی تاریخی ابتداء

بہر حال اگر ہم اس بات پر غور کر لیں کہ قومیت کا آغاز کیونکر ہوا تو اس کا
 مفہوم عجوبہ ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ ایسا کرنے کے لئے ہمیں ایک ایسے عہد
 گذشتہ پر تبصرہ کرنا ہو گا جب انسان آجکل کے بہ مقابلہ جغرافیائی اختلافات
 کے سبب سے زیادہ موثر طور پر منقسم تھے۔ جب کوہستانی سلسلوں کے نیچے
 سرگرم نہیں بنائی گئی تھیں۔ دریاؤں پر پل نہیں تعمیر کئے گئے تھے اور جب

ریلوے اور بحری جہازوں کی وجہ سے لفظ ”فاصلہ“ کے معنی میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا تھا اس زمانے میں لوگوں کو کسی کو ہستانی سلسلے - دریا یا سمندر کے مختلف اطراف میں رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند نسلوں کے بعد یہ نوبت آگئی کہ دونوں میں سے ایک بھی دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ باہمی شادی بیاہ کی وجہ سے یا مختلف حالات سے تعلق رکھنے کے باعث ان کی جسمانی بناوٹ میں فرق پیدا ہو گیا۔

یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارا خیال ہے کہ دنیا میں کسی وقت بھی ایک ایسی یکساں اور تمام باتوں میں مائل کوئی نسل انسانی موجود ہی نہ تھی جس میں علیحدہ بود و باش کے سبب سے اختلاف واقع ہو گیا تھا دو باتیں ہمیشہ ساتھ ساتھ کام کرتی رہی ہیں۔ اول میل جول یعنی جا زبانہ صلاحیت اور دوم علیحدگی یا اختلاف۔ اس میں ہم ایک ایسی تحریک کو دروازہ میں تقسیم کر رہے ہیں جو دراصل ”واحد“ ہے۔ واضح رہے کہ طبقہ انسانی کی ترقی انھیں دونوں مخالف طاقتوں کی کشمکش کے سبب سے ہوتی ہے قبائل کی نقل و حرکت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپس میں شادی بیاہ ہونے لگتے ہیں اور مختلف نسلیں خلط ملط ہو کر ایک ہی میں جذب ہو جاتی ہیں لیکن علیحدگی یا اختلاف اس وقت واقع ہوتا ہے کہ جب کوئی قبیلہ پستہ زراعت اختیار کر لیتا ہے مغربی تہذیب میں نسلوں کی قدرتی تفریق کی تردید سلطنت رومانی کی تھی۔ جذب کرنے کی اس نہایت زبردست طاقت کا پامال ہو جانا

کے بعد بھی اس کا خیال زمانہ وسطیٰ تک لوگوں کے دل میں قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نسلی تفریق کے باوجود یورپ کی مختلف قومیں مذہبی اور سیاسی معاملات میں خود کو ایک ہی قوم میں شمار کرنے لگیں۔ اس وقت تک سلوں نے ارتقاء کے ذریعہ سے قوموں کی شکل نہیں اختیار کی تھی۔

یہ بھی بتایا جاسکتا ہے کہ قومی عداوت و خصائل کا ظہور کیسے ہوا۔ یہ نشاۃِ جدیدہ میں ہوا تھا۔ قدیم دنیا سے روما کا ایک ہزار سال پیشتر ہی خاتمہ ہو چکا تھا لیکن ایسا تھا قائم کرنے کے لئے جو چند صدیوں صدی میں موجود تھا مغربی تہذیب سڑکوں پر کاری زبان اور اہل روم کے اساسی قانون کی دست نگر تھی۔ اسی زمانہ میں جب لوگوں میں نقل وطن کا زمانہ گزر چکا اور کئی کئی نسلوں تک ایک ہی مقام میں رہنے لگے اس وقت لوگوں کو یورپ کی جغرافیائی ساخت کا احساس ہوا سڑکوں کی حالت بچہ خراب تھی سفر میں سہولتیں بہت کم مہیا ہوتی تھیں اور مختلف آب و ہوا یا زمین کی وجہ سے قانون اور زبان میں بھی رد و بدل ہو گیا تھا۔ زمانہ وسطیٰ کے پراگندہ اور منتشر اتحاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ احیاء میں طبعی اختلافات قائم ہو گئے لوگوں کو اس وقت پہلے پہل اس چیز کا احساس ہوا جسے اب "قومیت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ابتداءً اختلافات رونما ہوئے جن کا لوگ مشاہدہ کر چکے تھے اس کے بعد عیاں قومیت کا خیال دل میں پیدا ہوا قدیم مصر اس طرح لکھا کرتے تھے گویا نصب انصاف یعنی آئینہ آزادی ملکوں کا قیام اور ایک فرد کا ذاتی ارتقاء پہلے قائم ہوئے اور اس کے بعد نشاۃِ جدیدہ کی فرما زبانی کا دور آیا۔ لیکن یہ ایک واضح امر ہے کہ واقعات اس ترتیب کے بالکل خلاف ظہور پذیر ہوئے۔ فلسفیوں اور مدبروں کے ایسا کہنے کے

قبل ہی کہ ”اقوام کو آزادی حاصل ہونا چاہئے“ تو میں آزاد ہو چکی تھیں۔ جس زمانہ میں اہل ہنر اور شعرا نے ذاتی ترقی کو ایک حق قرار دیا تھا اس کے قبل ہی افراد نے زمانہ وسطیٰ کے مسلک کی غلامی کا طوق اپنی گردن سے نکال کر پھینک دیا تھا۔ مراد کلام یہ نہیں کہ لوگوں کو جس مقصد کے حاصل کرنے کی خواہش تھی وہ ان کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ بخلاف اس کے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس جو کچھ بھی شے موجود تھی اس کے ذریعہ سے انھیں اسی قسم کی چیز کے مزید حاصل کرنے کے نواید معلوم ہوئے یعنی ان کو یہ محسوس ہوا کہ جو چیز ان کے قبضے میں تھی اس کو بڑے پیمانہ پر حاصل کریں۔ بہر حال قسمت تک معیار میں نقص موجود تھا۔ ہم اس کو دو جدید کی فرمائندگی کا ایک ایسا نتیجہ سمجھے ہیں جو ظاہر نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ قبل اس کے کہ قومیت کے متعلق کوئی واضح تصور قائم ہوا ہو آزادی حکومت حاصل ہو چکی تھی۔ اختلافات تسلیم کرتے ہوئے بھی سبقت میں اپنا اپنا ذاتی مستقبل بنا سکتی تھیں اس زمانہ میں اصولاً بھی کسی بادشاہ یا پاپا کو گستاخانہ یا فرانس کی ارتقا پر نظر رکھنے سے سروکار نہ تھا۔

دور احیاء میں یورپ مختلف مملکتوں کے بجائے مختلف قوموں میں منقسم ہو گیا اس زمانہ کا معیار جماعتی ترقی نہیں بلکہ آزادی حکومت تھا وہ قومی بانہری جسکی طرف سے لوگ غافل تھے۔ ایک جدید معیار کی حیثیت سے اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوئی جب تک انقلاب ظاہر ہو کر ختم نہیں ہو چکا تھا۔

لیکن اس کے علاوہ پھر کس قسم کا معیار لوگوں کے ذہن میں جاگزیں تھا۔ پہلے قومیت سے مراد تھی ہر ایک جداگانہ طبقہ کی آزادانہ ترقی۔ نسلی بول چال نے ایک علمی اور سرکاری زبان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دستوری اختلافات قانون اور

حکومت کے جداگانہ طریقوں میں نقش ہو چکے تھے اور اس زمانے میں کوئی شخص یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ ان سب باتوں کا تعلق تہتم سے ہے جیسا کہ دورِ احیاء میں ہوا تھا۔ قومیت جدید کا دار و مدار باشندوں کے مختلف گروہوں کے عام عادات میں تھا اس کے علاوہ نسلی تفریق کے سبب سے مذہبی رسوم اور عقائد میں اختلاف واقع ہو گیا تھا۔ نو تہذیب کے ظہور کے ایک سو سال قبل شمالی قومیں قرونِ وسطیٰ کے کلیسائی نظام کے ماتحت بہت تنگ آنکھی تھیں لیکن اصل میں اس وقت کلیسم ہی کا اختیار زبردست تھا۔ اور سلطنت اس سے محروم تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی آزادی پہلے حاصل ہوئی اور اس کے بعد مذہبی رستگاری کا دور دورہ ہوا۔

بہر حال آخر میں جذباتی اختلافات اس قدر زبردست ہو گئے کہ مذہبی رویاؤں ان کے متحمل نہیں ہو سکے۔ خدائی قوموں نے ایک قومی مذہب کو راج دینے کے لئے یہاں شروع کر دی بادشاہوں کا زمانہ گزر گیا اور اس کے بعد ملقین انقلابی کا عہد شروع ہوا لیکن مذہبی روایات کے تقسیم کرنے میں دورِ احیاء اور زمانہ اصلاح کا کام نامکثر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قومیت کو مختلف گروہوں میں امتیازی مسالک تیار رہے۔ نشاۃِ جدید کے بعد کئی صدیاں گزریں اور جب تک پولین کا زمانہ نہیں آیا اس وقت تک قومیت کا خیال محض جذبہ ہی کی شکل میں موجود تھا۔ اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔ لیکن یہ جذبہ تھا نہایت زبردست تقسیمِ پولستان کے زمانہ میں جو ۱۸۷۱ء میں واقع ہوئی تھی۔ یہ ایک حقیقی سیاسی واقعہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اہلِ ہسپانیہ کی امنِ جدید کو تقویت پہنچ گئی جو انھوں نے ۱۸۷۱ء سے ۱۹۱۸ء تک فرانسیسی حکومت کے خلاف کی تھی۔ اسی قومیت کے سبب سے ماسکویں پولین کو روئے خشک دیکھنا پڑا۔

اور جرمنی کی از سر نو زندگی ہوئی۔ اس کے علاوہ حالانکہ کانگریس کے مدبروں نے اس کو
 نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ برابر ترقی کرتی رہی حتیٰ کہ تقریباً ۱۸۷۲ء میں اس کو ایک
 قطعی سیاسی معیار ہونے کا فخر حاصل ہو گیا گویا بقول لارڈ رابرٹس "قومیت ایک
 طبعی تحریک تھی اس نے خیال اور افعال سے خلاصہ اصول کی شکل اختیار کی بعد
 یہ نہایت زور دار ملکیت ہو گئی اور اس کا خاتمہ آج عقیدہ کی صورت میں موجود ہے
 خواہ اس عقیدہ کی پیروی کی جائے یا اس سے پہلو تہی کی جائے۔"

نصب العین کی موجودہ کارگزاری

لہذا اب اس معیار کی آخری صورت کی مزید تشریح کرنا ضروری نہیں
 معلوم ہوتا۔ کیونکہ ہم اس کی مخالفت کریں خواہ نیکریا یا حالہ میں معیار ایک نہایت
 زبردست قوت ہے۔

قومیت پہلے پہل انقلاب انگیز تھی کیونکہ اس وقت یورپ میں دو
 اخیار کی بدناما خاندانی تقسیم کے آثار باقی تھے۔ بعض حالتوں میں ایک قوم اپنے دستور
 زبردستی دوسری قوم میں رائج کرنا چاہتی تھی۔ جیسا کہ آسٹریائی اطالیہ میں کیا تھا
 جس شخص سے نجات یورپ کی توقع تھی اس کے ہاتھوں سے خوان آلود ہو کر وہ
 پھر ان بادشاہوں کے شکنجے میں گرفتار ہو گیا جن کے لئے یورپ کے دل میں ذرا بھی
 جگہ نہ تھی۔

نوجوان اطالیہ کی انجمن کا دار و مدار بین ناقابل تقسیم چیزوں پر تھا یعنی

۱۱) خود مختاری ۲۰، اتحاد (۳) حریت جن کا منشا یہ تھا کہ آسٹریا و سنے اطالیہ سے اپنا
یورپا بانڈھ کر ایک بڑی دودو گوش چلے جائیں۔ مختصہ چھوٹی چھوٹی مملکتیں ایک ہی
رشتہ اتحاد سے منسلک ہوں اور ایسی جمہوری حکومتیں قائم کی جائیں جن میں آزادی
پائے حاصل ہو۔

لیکن سب سے پہلے اندر ہی بات یہ تھی کہ اطالیہ آسٹریا کے قبضے سے آزاد
ہو جائے اسی وجہ سے ہر ایک منسلک میں قومیت کا یہ منشا سمجھا گیا کہ ان حکومتوں کا
استیصال ہونا چاہئے جو بعض حالتوں میں اطالیہ کے مانند مکوم باشندہ کی نگاہ
میں غیر ملکی اور جرمنی کی طرح سیاسیات متروک کی پروانہ ہوں۔

لیکن قومیت تعمیر سی بھی تھی۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ ہر ایک قومی جماعت کو
ذاتی و سائبروں کی ترقی اور ذاتی معاملات کا ہندوستان کا نام لیا گیا ہے اور
انھیں یہ دونوں باتیں سائل ہونا چاہئے۔ گویا اس کا ایسا ہی وقت پر دو کام
ہوتے تھے ایک طرف تو اس جبر و استبداد کے خلاف سرکشی کرنا تھا جو حکومت
کام میں لاتی تھی اور دوسری طرف اس سے اندر قومیتوں کے لئے بھی تدا بیر مہیا
ہوتی تھیں اس کے مطابق ہر گروہ کا فخر و غلہ تھا کہ وہ اپنے خاص پسند کا طریقہ
معاہدہ و حکومت رائج کیا ہے اور اس کو برقرار رکھے۔ اس قسم کے تمام قانون
مکومتوں کے تمام اصول ان باتوں سے اندک کے لئے تھے جو زیادہ انقلاب میں عمر
نہایت زیادہ تھیں اور یہ وہ طور پر کہ انہیں ہر ایک قوم کا ایک منسلک قومیت تمام ملکوں میں جمہوری
تھا لیکن اس کا مدعا یہ بھی تھا کہ ان تمام اصولوں کا خاص استعمال ہر گروہ
کو خود اپنے لئے کرنا چاہئے۔ اس کا یہ بھی منشا تھا کہ ایک ہی قومی جماعت کی ضمنی

تقسیمیں ترک کر دی جائیں۔ قومیت دراصل بیداری متحدہ کا نام تھا اس وجہ سے ایک قوم کو کوئی ایسی جداگانہ حکومتوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہئے اس طرح بادشاہیت اطالیہ اور سلطنت جرمنی کی تیاری اس تصور کے ذریعہ سے ہوئی تھی کہ ایک زبان اور یکساں رواجوں والی قوموں کا واحد اور یکساں نظام حکمرانی ہونا چاہئے یہ صحیح ہے کہ اطالیہ اور جرمنی دونوں کے بعض حصوں میں امتیازات موجود تھے جن کا دور کرنا کیوں اور بے شمارک کو ایک نہایت دشوار کام معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جو چیز نظر آ رہی تھی اس میں شکستگی تھی مثلاً اطالیہ میں آسٹریا اور جرمنی میں فرانکس۔ اس کے خلاف قومی جذبات کو ابھارنے کی غرض سے بڑی تدبیریں کی گئیں اور وہ مفید ثابت ہوئیں۔ بعض مرتبہ مسلک قومیت کے بھوری اصولوں کے سبب سے اعلیٰ طبقہ کی جماعتوں کو قومی جذبہ کا احساس کرنے میں دقت ہوئی تھی جب کہ بے شمارک کے طرز عمل سے ثابت ہے کہ جنگِ جدل کے زور و شور سے جدید انقلاب پسندوں کے ہیں اتحاد جرمنی کے متعلق یہ شک پیدا ہو گیا تھا کہ وہ فائدہ مند ہے بھی یا نہیں۔ لیکن جس سیاسی نظام عمل میں یہ معیار شامل تھا اس کے اختلافات کے باوجود قومیت ان قوموں کے عام جذبات ابھارا بھار کر ترقی کرتی رہی جو ظلم پرستوں کی حکومت سے منتشر و منقسم ہو گئے تھے۔ مثلاً جرمنی کا وہی جدید جمہوریت نے یولین اعظم کی شکست کے بعد مستقبل سمجھا جانے لگا جس کی بدولت چھوٹے چھوٹے تاجداروں کے ہاتھوں آخر میں اسے پسپا ہونا پڑا تھا۔ البتہ بڑوں نے اس کی بڑی مخالفت کی تھی۔

جرمن نسل میں بیداری پیدا ہو چکی تھی اس کو اتحاد کی لگن لگی تھی لیکن بادشاہوں اور نوابوں کے باہم رشک و حسد کی وجہ سے وہ اتحاد اس وقت تک

عمل میں نہ آسکا جب تک پرویشیا نے ذاتی اقتدار کے حصول کے لئے وہاں کے باشندوں کے ارمانوں سے باسانی فائدہ نہیں اٹھایا۔ قومیت کا مقصد تو حاصل ہو گیا لیکن اس مقصد کی جو قیمت اس نے ادا کی وہ یہ تھی کہ اس نے اپنے آزادانہ اور جمہوری جذبہ کو قربان کر دیا۔ ہسپارک کو جرمنی کا بنانا والا قرار دینا نہایت لغو بات ہے جس طاقت سے وہ کام لے رہا تھا وہ وحیقت خود اس کی نہ تھی بلکہ باہر کی تھی اور اس کی شہنشاہت کے ذریعہ سے وہ توانائی اپنا کام کر رہی تھی۔ ہسپارک اس طاقت کے ہاتھوں میں ایک آلہ تھا۔ مگر یہ اوزار تھا کہ اسی وجہ سے جرمنی کے مسلک قومیت ترقی نہ حاصل ہوئی لیکن اس سے چھوٹی چھوٹی آزاد مملکتوں کے متروک طریقہ کی بیخ کنی ضرور ہوئی۔

اسی طرح یونان میں بھی بیداری پیدا ہو گئی وہاں ایک نیا خاندان قائم ہو گیا اور غیر ملکی ظلم و استبداد کا خاتمہ کر دیا گیا۔ جس یونان کا سنگ چار دنگ عالم بن گیا ہوا تھا اس وقت سے وہاں کی زبان اور نسل دونوں میں بڑا تغیر واقع ہو گیا تھا لیکن بڑے بڑے کار نمایاں سے غیر ملکی شاعروں میں بھی یہ جوش پیدا ہو گیا کہ یونانی قوم کو اس کی سیاسی آزادی عطا کر دی جائے اور وہ اپنی پسند کے مطابق طریقہ حکومت اختیار کرے۔ نہ انہ حال میں بھی ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ظلم و تعدی یا متروک طریقہ حکومت کا نشان دنیا سے مٹا جانے کے علاوہ اس میں تعمیری قوت کس قدر زبردست ہے کیونکہ اس امر سے قطع نظر کر کے کہ ۱۹۱۹ء میں ترکی سے اس کو شکست ہوئی اور اس کے بعد سے برابر جنگیں یہ منظر ہر تصور ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔ یونان کی اصلی کامیابی اس بات میں ہے کہ اس کی وجہ سے جنوبی یورپ میں مہذب اور اقتصادی نقطہ

خیال کے مطابق ایک اہم اثر قائم ہو گیا ہے۔ صوبہ بلقان میں جو سیاسی پیچیدگیاں واقع ہوئی ہیں ان میں بھی ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ قومیت اپنا کام کر رہی تھی وہاں بھی نسلی بیماری سے جدا جدا جمہوروں کا ایک نیا نظام قائم ہو رہا تھا۔

اس میں جو صلیخ نامہ برلن ہوا تھا اس کی رو سے رومانیہ اور اسٹریا کا شمار بیدار اقوام میں کر لیا گیا۔ لیکن اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ بلغاریہ والوں نے پہلے تو روس کی حمایت سے اور اس کے بعد خود اس کے خلاف صف آرا ہو کر ایک زبردست سیاسی اور جب وطن سے معمور تشریک طبعی کو ترقی دی اور دنیا کو یہ دکھا دیا کہ باوجودیکہ وہاں سلیو زبان رائج ہے اور باشندے گیارہ نسل سے ہیں ایک کاشتکارانہ حکمرانی اپنے ذاتی روایات و چال و چلن پر قابض رہ کر انھیں ترقی دے سکتی ہے۔ ان واقعات کے معنی اس وقت سمجھ میں آ سکتے ہیں جب معلوم ہو جائے گا کہ کیا ضرورت تھی جس کی وجہ سے یہ واقعات پیش آئے اور کس معیار سے وہ ضرورت پوری ہوئی تھی۔ جن خرابیوں کی وجہ سے قومیت ظہور میں آئی وہ یہ تھیں (۱) خاندانی طریقہ حکومت (۲) متردک طریقہ حکومت۔ جس سے اکثر انسخا ص کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جس نظم و نسق میں وہ رہتے ہیں اس کے ذریعہ سے ان کے اغراض نیز عادات و تفصیلات کی ترجمانی نہیں ہوتی ہے۔ جو غیر ملکی قوم حکمراں ہوتی ہے وہ اس خرابی کو قابل احساس بنا دیتی ہے لیکن اس کے علاوہ قومیت اصولاً جمہوری تھی یہی وجہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے ان طریقوں کی درستی بھی ہوتی ہے جو معدودے چند افراد اپنی نسل کی بہبودی کے لئے اختیار کر لیتے ہیں۔ بہت سی حالتوں میں کچھ لوگ خود کو قومی خدائے وطنیت کا ترجمان

کسی نہ کسی طرح کہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ کئی حالتوں میں قومیت آزادانہ نہیں رہی ہے۔

بہر حال غور و فکر سے جو خوبی نظر آتی ہے اور جس کو قومیت ترقی دینا چاہتی ہے وہ قومی سیرت و خصلت کا امتیاز اور قومی روایات کی ترقی ہے گویا اس طرح اتر عجمی طرز عمل کا ایک نیا اصول قائم ہو جاتا ہے جس کا اعتراف بکارتی طور پر ان بیانات میں کیا گیا ہے جو انگریزوں کے اس۔ یہ کہہ رہے ہیں۔
گئے ہیں جو انھوں نے بلجیم کی طرف اختیار کیا تھا۔

ادبیات میں معیار کا تذکرہ

قومیت کے بارے میں زیادہ کتابیں موجود نہیں ہیں کیونکہ ان رسالوں اور قومی۔ وایتوں نیز عادات و خصلت کے ہنگامی تذکروں کا شمار ادبیات میں نہیں کیا جاسکتا حواہ تک شائع ہوئے ہیں۔ قومی چال چلن کی نسبت اول ترین اور واضح تصور ”وانکو“ میں موجود ہے جس میں پختی دیکھا گیا ہے کہ اس تحنیل سے دنیا میں کیا کیا کام مکمل کتا ہے قومیت کا آخری پیمبر عظیم میزمنی تھا اس لئے سیاسی روایتوں کی دنیا میں ہم اس معیار کو اطالیہ کا قرار دے سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کے دیگر ممالک کے بمقارہ اطالیہ کو غیر ملکی قوموں سے بہت زیادہ نقصان پہنچا ہے اور شاید یہ اس خرابی کی انتہا تھی جس کی وجہ سے قومیت کا نہایت نفیس معیار وہاں پیدا

ہوا۔ فسطی کے خطبوں میں قومی خصلت و عادت کے متعلق یہ صاف طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ تاریخ میں ان کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے اور گورنرس کی تصنیف شرمینی اور انقلاب“ میں قومیت کا جمہوری پہلو بھی دکھایا گیا ہے۔ مل کی تصنیف ”نیا تہی حکومت“ میں بھی قومی سیرت و طینت کو بکاہ دی گئی ہے۔ رینین کی تصنیف میں دکھایا گیا ہے کہ جمہوری مطالبہ کے ساتھ دستور و نسا کا بھی بہت خیال رکھنا چاہئے لیکن شرمینی کی تصنیف میں معیار قومیت کے معنی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ وہ ایک بغایت جوشیلا انسان اور قومیت کا نبی تھا اس لئے اپنے ہمعصروں کے بہ مقابلہ اس نے اس معیار کا اندازہ زیادہ وضاحت کے ساتھ کیا تھا لیکن جو نصب العین اس نے ظاہر کیا وہ خانگی نہ تھا۔ اس معیار کے خلاف کہ اتحاد کسی بادشاہ کے ماتحت ہونا چاہئے شرمینی کا خیال تھا کہ اٹالیہ متحدہ کی بنیاد اٹالوی قوم ہی رکھ سکتی ہے شرمینی نے اپنی تصنیف ”فرائض انسانی میں لکھا ہے کہ:-

”ہم طبقہ انسانیت کے لئے تنہا کچھ نہیں کر سکتے ہماری نظر اتحاد پر اس نے اعلان کیا ہے کہ خراب حکومت کی منظوری سے جو جابرانہ تفارلق جوئے ہیں ان کے بجائے قدرتی تقسیمیں قائم ہوں گی۔ بادشاہ یا ان جماعتوں کے منظم کئے ہوئے ممالک کی جگہ پر جن کو خاص خاص حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ قوموں کے بنائے ہوئے ممالک آبا و ہوں کے اور ان ملکوں کے درمیان ایک رشتہ اتحاد و اخوت قائم ہوگا۔

گویا اولاً قانون و حکومت کے ذریعہ سے قومی چال و چلن کا اظہار ہونا

چاہئے اور زمانہ پریشین سے جو مصنوعی یا انسان کی قایم کردہ فرقہ بندی چاہی
ہیں ان کا قطعی سدباب ہو جانا چاہئے۔ ثنائی کسی قوم کا وجود دنیا میں محض
اس کے ذاتی فائدہ کے لئے مقصود نہیں ہوتا ہے اور یہی وہ بات تھی جسے
مینرینی نہایت پیش باب سمجھتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق قومیت محض ذاتی
حقوق حاصل کر لینے ہی تک موقوف نہیں ہے بلکہ تو نہ کاپیتے فرائض ادا کرنا
ہی قومیت میں داخل ہے۔

۱۔ خدا نے طبقہ انسانیت کو جدا گانہ گروہوں میں تقسیم کیا اور اس طرح
قومیت کی بنا ڈالی۔ تمہارا ملک اس مقصد کا ایک مرتع ہے جو خدا نے تمہیں انسان
کے مفاد کی غرض سے پایہ تکمیل پر پہنچانے کے لئے عطا کیا ہے اس لئے کوئی
قوم اپنی حسامت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس مقصد کے مطابق عظیم الشان ہوتی
ہے جس کی تکمیل کے لئے وہ بیڑا اٹھاتی ہے۔ ملک محض ایک قطعہ زمین نہیں ہے
بلکہ اصل میں یہ اس خیال کا دوسرا نام ہے جو اہل ملک کے دل و دماغ سے
پیدا ہوا ہے۔“

لہذا قومیت کا معیار اپنے اعلیٰ ترین صورت میں عمومی تھا اور اس
فرائض جمہوری کا تخیل بھی پیدا ہوا۔ اکثر اشخاص نے نیم آگاہی کی حالت میں
اس کی مدح و ستائش کی تھی لیکن ایک بہتر مستقبل بنانے کے لئے قومیت سے
بہی دو قابل قدر توقعات تھے۔

معیار تنقید

اب میں نصب العین قومیت پر کچھ چٹنی کرنا چاہئے کیونکہ یہ بھی محدود ہے اس کے نقائص کی ذیل میں سب سے پہلے یہ بات نظر آتی ہے کہ اس سے سیاسی مقصد کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔ مقامی ترقی دہی سیاسیات کی شکل میں تبدیل ہونے لگتی ہے اور ایک قوم کی روح کو برقرار رکھنے کے لئے جو کوشش کی جانی ہو اس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ علیحدگی پسند وحشی پن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ محض ایک ایسی بات نہیں ہے جس کے وقوع پذیر ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش ہو۔ دنیا میں اس کا ظہور پہلے ہو چکا ہے کیونکہ جن زبانوں کا یہاں نہ بات بہرہ منو ہا تھا ان میں دوبارہ جان آگئی اور ان میں امتیازی نشانی کو پہیلی نہیں بلکہ ان انسانوں کے باہمی ربط و ضبط میں ہرج ہی واقع ہوا ہے۔

قومیت پرست اشخاص یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اگرچہ مختلف قوموں کے متحد ہو کر ایک حکومت کی شکل اختیار کر لینے سے بعض حالتوں میں نقصان نہ ہو سکتا ہے لیکن بعض صورتوں میں ایسا کرنے سے دوسروں کو خاص فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اور دوسروں کے ساتھ ایک ہی قانون و حکومت کے تحت متحد ہونے سے چھوٹے چھوٹے جمہوروں کو واقعی فائدہ پہونچا بھی رہے۔ نسلی گروہوں کے قائم کرنے میں کوئی بات خاص طور پر پاک و بہتر نہیں ہوتی۔ لیکن کسی گروہ کے لئے ذاتی حکومت کا سیکھنا بعض مرتبہ مفید ثابت ہوتا ہے۔

اور بعض اوقات ایسا کرنے سے اس کے حق میں خرابی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔
سلطنت آسٹریا میں چھوٹے چھوٹے گروہوں کو متحد کر تہذیب محض اسی
سبب سے حاصل ہوئی کہ وہ حکومت خود مختاری سے محروم تھے اور موثر
میں تو ہمیں اس بات کی مثال ملتی ہے کہ وہاں کے باشندوں میں اتفاق ہو کر
ان ہی میں سے ”ایک حکایت“ میں متحد ہو کر رہنے سے اس قدر فائدہ نہیں ہو سکتا
ہے جتنا کہ ان کو اس وقت مختلف جماعتوں میں منقسم ہونے سے حاصل ہے
ایسی سیاسیات کی وجہ سے جو انتہائی قومیت کی تنگ خیالی پر مبنی ہوتی
ہے۔ اکثر گروہوں میں باہمی رشک و حسد ہی نہیں بلکہ دشمنی بھی پیدا ہو گئی ہے
فرانس کی تحریک حب الوطنی کا ایک زمانہ میں یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ وہاں قریب
قریب جرمن قوم کے ہر فرد سے وحشیانہ طور پر نفرت کی جانے لگی۔ ہر ایک
نسل اعداؤ میں بس قدر بڑھتی جاتی ہے اسی حد تک اس میں مقامی حسد
پیدا ہوتا جاتا ہے جو بالآخر ٹیڑھ کر اپریل حکمت عملی کی صورت اختیار کر لیتا،
قومیت پسندی میں بھی اس قدر زور و شور سے جنگ کی حمایت کی جاتی ہے
جس قدر شد و مدت شہنشاہیت پسندی میں یہ باتیں ہوتی ہیں۔ بہر حال ان
قریب آئینہ معنی کے اعتبار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں الفاظ یعنی ”قومیت
اور شہنشاہیت“ اسی نہایت محدود سیاسی حالت کی جانب اشارہ کرتے
ہیں۔ کیونکہ جس چیز کو ایک چھوٹے سے طبقہ میں قومیت کے نام سے موسوم
کیا جاتا ہے وہی اس زمانے میں جب وہ گروہ زور پکڑ جاتا ہے شہنشاہیت
کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو قومیں دوسری قوموں کو اپنا حریف تصور کرتی

ہیں وہ جادہ جنگ آزمائی اور مطلق العنانی میں گامزن ہیں۔ گو یہ ممکن ہے کہ ان کی "تعداد کی کمی اور افلاس" ان دونوں چیزوں کے باعث ان کی قومیت کی اصلی خصوصیت ظاہر نہ ہو سکے۔

اس کے علاوہ قومیت کو عدم مداخلت کے عجیب و غریب اصول کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔ جس کا کسی زمانے میں یہ منشا تھا کہ اگر کبھی جماعت میں بیماری یا جبر و استبداد وغیرہ کا عمل ہو تو دوسرے گروہ کو اس سے کچھ اہٹ نہیں ہے۔ جیسا کہ شہنشاہیت پسندی کے متعلق خیال کیا جاسکتا ہے اس بات کا فیصلہ کرنا واقعی نہایت دشوار ہے کہ ایک قوم کو دوسری قوموں سے کب اور کس طرح سرور کار ہونا چاہئے دوسروں پر ان کے مرضی کے خلاف حکومت کرنا خواہ وہ ان کے فائدے کے لئے کبھی کیوں نہ متصور ہو ایک متروک طریقہ ہے لیکن اس کے برعکس دوسری جماعتوں کے معاشرتی نظام میں جو خرابیاں ہیں انکی طرف سے کوئی مہذب جماعت یا فرقہ لاپرواہ نہیں رہ سکتا۔ کم از کم یہ ممکن ہے ان خرابیوں کا دور دورہ ہو جائے اور محض ذاتی محبت ہی ایسی چیز ہے جو اس گروہ کو مداخلت کرنے کے لئے مجبور کر دے گی۔

بیلن اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے ایک خوددار جماعت کے دل میں یہ مشکل یہ خیال آتا ہے کہ اس کا وجود محض ذاتی مفاد کے لئے ہے کیونکہ کسی قوم کی عظمت کا اندازہ اس کی دولت و طاقت سے نہیں بلکہ جس قسم کی زندگی وہ بسر کرتی ہے اس کے لحاظ سے کیا جاتا ہے اور جو قوم حریت نظام یا تہذیب کے کسی جزو کی بھی حمایت کرتی ہے

اس کی دلچسپی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک دوسری قومیں بھی اس کے ساتھ ان معاملات میں شرکت نہیں کرتیں جن کو وہ مفید تصور کرتی ہے۔

معیار کے فوائد

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان معیار میں کون ایسی بات ہے جس سے زمانہ آئندہ میں فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اگر ہم کسی قوم کو علیحدہ تصور کر کے اس کے فوائد کا ان فوائد سے مقابلہ کریں جو اس کی وجہ سے دوسری قوموں کو پہونچتے ہیں تو مذکورہ بالا سوال کا جواب مل سکتا ہے یعنی پہلے ایک ہی قوم کے افراد کے باہمی تعلقات پر غور کرنا چاہئے اور اس کے بعد اس قوم کے تمام افراد کے ان تعلقات پر نظر تعمق ڈالنا مناسب ہے جو ان کے اور دوسری قوموں کے افراد کے درمیان قائم ہیں۔ ایک قوم کو اپنے دائرہ کے اندر اپنے عادات و فضائل کو ترقی دینا مناسب ہے۔ جس طرح ایک فرد واحد کو دوسروں کے مطالعہ کے ذریعہ سے ہدایات و اختلافات ملنے پر بھی انکی خصوصیت کے مطابق طبیعت و سیرت اختیار کرنا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح ایک قوم کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا ایک جداگانہ شعاع ہوتا ہے جو کسی دوسری قوم کے طرز سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ جو لوگ اس معیار کے قائل ہیں وہ امتیازی یا جداگانہ قومی خصوصیات کی کیوں مخالفت کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایسی باتیں کیا کرتے ہیں جن سے ظاہر

ہوتا ہے کہ ہمیں محض اس حالت میں کام کرنا چاہئے۔ جب ان کاموں سے تمام طبقہ انسانی کو یکساں فائدہ پہنچتا ہو۔

اعلیٰ ذاتی اخلاق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان اس بات کو نظر انداز کرے جو اس میں ایک امتیازی خصوصیت ہے اس لئے ہر گروہ کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی امتیازی اور جداگانہ ترقی پر نظر رکھے۔ انگریزوں کے مابین باہمی تعلقات بالکل وہی نہیں ہونا چاہئے جو فرانسیسیوں اور جرمنوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ جہاں تک قومیت کے معنی ہیں کہ وہ قوم کا کسی دوسری قوم کے ساتھ کچھ تعلق ہو اس حد تک اس کی قدر قومیت اس فائدہ سے یقیناً زیادہ بڑھی چڑھی ہوتی ہے جو ہر شخص کو آزادی سے حاصل ہوتا ہے اور اگر ہر قوم ذاتی خصوصیات کو ترقی دیتی ہے تو اس سے دوسری قوموں کے حق میں ایک مخالف کی حیثیت سے نہیں بلکہ مد مقابل کی حیثیت سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ تمام انسانوں کو مختلف انواع و اقسام کے تحفظ ہی سے فائدہ پہنچتا ہے۔ کیونکہ انسانی ترقی کا آفتاب نصف النہار پر اس وقت نہیں ہوتا ہے جب ہر شخص یا ہر گروہ دوسرے کا مقلد ہوتا ہے۔ بہت ہی ارفع اغراض اور عادات و خصائل کی علیحدگی سے بھی ہوتی ہے اور ان کے باہم دیگر جذب ہو جانے سے بھی ہم اس طرز عمل سے چشم پوشی نہیں کر سکتے جن سے ایسی حالت میں اختلافات کے نشوونما کا احتمال رہتا ہے جس میں رسل و سائل نیز ارزاں قیمت پر تیاری سامان سے آہستہ آہستہ تمام نسلی اختلافات دور ہو جاتے ہیں پس اپنی نمایاں صہندیوں کے باوجود معیار قومیت کا کچھ نہ کچھ جزو قایم ہے یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے ہمارے سیاسی خیالات کو روشنی پہنچ سکتی اور جو

جادہ عمل میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔

بہر حال یہ صاف ظاہر ہے کہ تا وقتیکہ دیہی سیاسیات یعنی تنگ بینی اور جمہوری نیک و حسد کا وجود نہ مٹ جائیگا جو کسی نہ کسی قسم کی قومیت کے ساتھ پیدا ضرور ہو جاتا ہے۔ حقیقی ترقی نہیں ہو سکتی قبل اس کے کہ انسان اس گروہ کے خصوصیات کو پورے طور پر فروغ دے جس سے اس کا تعلق ہے۔ یہ زمین نشین کر لینا کہ اس قسم کے ارتقار کاغشا یہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کسی دوسرے طبقہ کے ساتھ کشمکش ہی پیدا ہو جائے۔ مگر یہ بات سیاسی واقعات پر عقلیت کے ساتھ غور کرنے ہی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس بات کا خیال رہنا چاہئے کہ ایک قوم کے لئے دوسری قوم کو مٹا کر ترقی اور توسیع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خطیج ایک خاندان یا کسی فرد واحد کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ دوسرے خاندان یا افراد کا نقش ہستی مٹا کر جادہ ارتقار میں گامزن ہو حالانکہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس قسم کی کشمکش عالمگیر ہے۔ جیسا کہ آئندہ کسی باب میں دکھایا جائے گا۔ دوسرے مٹا کر اپنی ترقی کرنا اسی حالت میں مناسب ہے جب ترقی کا آرزو مند خود اس نمبر سے محروم ہو جو دوسرے کے پاس موجود ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ سیاستوں کے خیال کے مطابق ہم رسانی ضروریات کی کوئی خاص حد مقرر کر دی جاسکے گی۔ لیکن قدرت سے ادا لینے کے لئے جو ذرائع کام میں لائے جاتے ہیں ان کے موثر یہ بادر کرنے کی شہادت تھی ہے کہ اپنے تئیں بیدار ضروریات سے ہم اس قدر باہر نہیں ہو سکتے جس قدر مہمت کے ساتھ ان ذرائع کی ترقی و اصلاح ہوتا ہے۔ اور اگر اسے باوجود بھی ترقی

فتح و نصرت کے بعد جو مال غنیمت ہاتھ آتا ہے اس کے حصے بچا کر کے لئے باہم
جنگ و جدل کرنے کے بغیر ہی قومی گروہوں کو ان کی ضروریات بخوبی حاصل ہوتی
ہیں۔ معیار پسند انتخاب ملحقین اس میں کریں خواہ مدبر پنچایت جاری رکھیں لیکن
ماتریتیکہ معتدل سیاسی تحیل کے نسبتاً پہلے سے زیادہ تربیت نہ ہوگی ہم قومی
جمہوروں کی دوسری منزل میں نہیں پہنچ سکتے۔ تصور کے قلت کے باعث
لوگوں میں حالات متروک کی پیروی کرنے کا مادہ قائم رہتا ہے اگر وہ خود مختلف
زاویہ نگاہ سے دیکھیں تو ان کی حالت میں فرق واضح ہو جائے۔ جب ہر قوم
کے زیادہ لوگ دوسری قوموں کو مخالف نہیں بلکہ رفیق سمجھنے لگیں گے اس وقت
بہترین قومیت تیار ہو سکیگی۔

اب موجودہ حالت میں جب کہ ”قوم“ کو اپنی حیثیت حاصل ہو چکی ہے
دہی قومیت جو پہلے چھوٹی چھوٹی منظم قوموں کا معیار تھی۔ شہنشاہیت
سے مشابہ ہو گئی ہے۔

اسی اطالیہ نے جس نے سیزینی کی صدا پر لبیک کہا تھا اریٹرا کے مقامی
ترقی کو پامال کرنے کے لئے دست تعدی دراز کیا اسی متم کا جبر و استبداد تنگ
اس کے ہاتھوں سے ترپولی میں ہو رہا ہے۔ لیکن واقعی اگر قومیت کے کچھ معنی
ہیں تو صیرنچا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کو خود اپنی حکومت
کرنے کا حق حاصل ہے اور رفتہ رفتہ یہ ذہن نشین ہونا چاہئے کہ قومیت کا
منشا یہ ہے کہ تمام قومی جمہوروں کو اپنی اپنی خصوصیات کے مطابق صعود کرنا
چاہئے پس قوموں کے متعلق یہ خیال رکھنا چاہئے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ

ایک دوسرے کی مخالف ہی ہوں بلکہ ان کے درمیان دوست نہ تعلقات بھی ہوتے ہیں۔ مگر ایسا کہنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ سامان جنگ کا بالکل سد باب ہی کوہا جائے تاوقتیکہ ایسا کرنے کی ضرورت نہ ہو جائے اس کا سد باب ہرگز نہ ہونا چاہئے اور یہ ضرورت صرف نخل سیاسی کی تہذیب اور تعلیم ہی کے ذریعے سے دور ہو سکتی ہے لیکن جو بڑی واقعات فی الحال ہمارے سامنے موجود ہیں وہیں ایسے دور دراز معیار کا تصور کرنے کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ ہر ایک قوم کے کثیر العدد افراد میں ابھی تک تہذیب نہیں آئی۔ بے اور جن معدودے چند اشخاص کو سیاسی معاملات سے دلچسپی ہے ان میں سے اکثر قدیم اور متروک سیاسی مفروضات کے پیرو ہیں۔ لیکن اگر ایک طرف سامان جنگ میں اور بھی اضافہ کیا جاتا ہے تو دوسری طرف سیاسی تعلیم کی بھی ترقی جاری رکھنا مناسب ہے جس سے لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ تمام مختلف جمہور انسانی کو ہر ارض کے ذریعے کو آپس میں تقسیم کر کے کس طرح اپنے اپنے کام میں لاسکتے ہیں۔

یہ عیاں ہے کہ دوسرے طبقوں کو یہ قیوف بنانے یا آلات جنگ میں اضافہ کر کے ان پر ہیبت طاری کرنے کے لئے جو فہم و فراست کام میں لائی جاتی ہے اگر اس کا استعمال قدرتی ذرائع کی تحقیق و تجسس کے لئے کیا جائے تو تمام قوموں کی ترقی کی انتہائی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ سامان پیدا ہو جائے۔ اگر حکمت عملی اور چال بازی سے کام لینے کی بجائے رفتہ رفتہ سامان اور جائز باتیں اختیار کی جائیں تو ہر قوم کو دوسری قوموں کی ضروریات کا احساس ہونے لگے اور انسان اپنے طبقے کی بڑی بڑی بے بسی کی ترقی کیلئے قدرتی کام لگے گا۔

نواں باب

موجودہ شہنشاہیت

ابتدائی خیالات

(۱۰۰) جس قدر حال کے سیاسی مسائل ہمارے سامنے پیش ہوتے جاتے ہیں، اسی قدر ایک غیر متعصب مباضہ زیادہ دیشوا ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر سب کو دنیا میں وہ اچھوت تک معرعن بحث میں ہیں۔ نیز جن حالتوں میں جماعتوں نے بعض ایسے الفاظ اختیار کر لئے ہیں جن سے ان کے منصوبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ آپس عوز و خجس سے اس قدر کام نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک کہ لوگ عام طور پر مباضہ کے لئے تیار رہتے ہیں۔

حریت ہو خواہ نظام اور خواہ اتحاد ہو جو ان میں سے ایک یا دوسرا ہو

کل جماعتوں کا خیال کیساں ہے اور اگر ان کے بارے میں معمولی طور پر متقول
نکتہ چینی بھی کی جاتی ہے تو یہ باور کیا جاتا ہے کہ یہ چیزیں جماعتی اغراض سے
صلوحہ ہیں۔ کسی مدبر کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہو سکتی کہ وہ تنظیم یا حریت
کا مخالف ہے اگرچہ نظام کے جو معنی خود اس نے سمجھ رکھے ہیں وہ ان کے
سامنے منجالیوں کے عرض کئے ہوئے مطالب کو درست نہیں تسلیم کرے گا
بہر حال ہر شخص مبہم طور پر نظام کے معنی سمجھتا ہے اور کم از کم اس کو اصولاً
ایک قابل قدر شے ضرور قرار دیتا ہے لیکن شہنشاہیت میں ایسا نہیں ہے لوگ
بائعوم یا تو اس کے خلاف شورش برپا کرتے ہیں یا اس کی مدح سرائی کیں اپنی
رطب اللسان فی ختم کر دیتے ہیں مگر ان دونوں قسموں کے انسانوں میں کوئی شخص
یہ نہیں دیکھتا کہ آخر لفظ شہنشاہیت کے معنی کیا ہیں گویا اس سے حجت و
استدلال میں وقت واقع ہو جاتی ہیں لیکن یہاں یہ بحث بہت ضروری ہے
مروجہ سیاسی معیاروں میں اس بحث کی جس قدر حاجت ہوتی ہے اس سے
کہیں زیادہ شہنشاہیت میں روشنی ڈالنے کے لئے اس کی ضرورت ہے۔

شہنشاہیت معیار ان معنوں میں ہے کہ بعض اشخاص ایسا طریقہ
راج کرنا چاہتے ہیں یا سمجھتے ہیں کہ وہ پہلے ہی سے موجود ہے جس کا صعود
تخلف انسانی جمہوروں کے باہمی تعلقات سے ہوا ہو اور اس طرز حکمرانی کو
شہنشاہیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو لوگ اس قسم کا طریقہ پسند کرتے ہیں
انگلستان میں انھوں نے اپنا لقب شہنشاہیت پسند اختیار کر رکھا ہے۔

علاوہ بریں دیگر اشخاص شہنشاہیت ایک ایسے طرز حکومت کو

کہتے ہیں جس کا اگر وجود ہے تو وہ اس کو میت و نابود کرنا چاہتے ہیں اور اگر وجود نہیں ہے تو وہ اس کو دنیا سے ہستی میں آنے سے روکتے ہیں ان کو نیکی نگاہ میں یہ لفظ ایسا ہی ناپاک ہے جیسا کہ اس کے حامی اس کو تبرک اورد مقدس سمجھتے ہیں یہاں اس امر پر بحث کرنا باعث کجی ہو گا کہ یہ دونوں مخالف ارباب خیال ایک ہی طریقہ حکومت کا خیال کرتے ہیں یا نہیں۔ جس چیز کی مخالفت کی جاتی ہے وہ بے دطرہ جو رو قعدی اور جس شے کی حمایت کا دم بھرا جاتا ہے وہ ہے ایک فایزہ بخش حکومت۔

انگلستان کے موجودہ سیاسی واقعات کے لحاظ سے ان دونوں مذاہب کے وفاق و نفاذ اور ہمیشہ ہر چیز کا شاک کی کہا جاتا ہے۔ اول الذکر کالب و لہجہ مشرقی طور کا ہوتا ہے اور وہ وسعت کو بذات خود قابل ستائش سمجھتے ہیں دوسرے طبقے والے اعتدال پسندی کے خیال سے علانیہ واقعات سے خفیہ دشمنی اختیار کرتے ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ یہ تبلا دیا جائے کہ آخر شہنشاہیت کے حامیوں کا خیال اس کی نسبت کیا ہے۔ لیکن شہنشاہیت پسند اخباروں کے افتتاحی مضامین لکھنے والوں کے جذبات نظر انداز کئے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ ہم صرف ایسے اسباب دریافت کرنا چاہتے ہیں جن کے مطابق شہنشاہیت قائم رکھی جاسکتی ہے اس نام سے مراد صرف ایک ایسا واحد طریقہ قانون و حکومت ہے جو مختلف ملکوں اور قوموں میں جاری ہو۔

تقریباً ہر ذی فہم شہنشاہیت پسند لفظ سلطنت کے خطرناک اجزا کو تسلیم کرے گا۔ نپولین کی سلطنت ایک جنگی سپہ سالار کے ارمان فتح و نصرت

کی وجہ سے قائم ہوئی تھی جس نے دیگر اقوام کی ترقی کو زوال پہنچانے کیلئے
فرانس کا جوش قومی اپنی طرف استعمال کیا تھا۔

قرون وسطیٰ کی سلطنت اذیت صفت تھی سلطنت روم اپنے اثر کے
محاذ سے خواہ قابل تعریف ہو مگر اس کا بھی قیام تمام دنیا کو ایک شہر کا
محموم بنائینے سے ہوا تھا۔

سکندر اعظم کی سلطنت ایک مختصر کامیابی کا غیر متعلق نتیجہ تھی۔ وہ
اتفاقاً قائم ہو گئی تھی۔ ان سے جو سلطنتیں قائم ہوئی تھیں ان کا کام صرف
خراج وصول کرنا تھا لیکن زمانہ حال کا طبقہ جس قسم کی سلطنت کا حامی و متبانی
ہے وہ اس کو مذکورہ بالا سلطنتوں کے زمرہ میں داخل نہیں کرنا چاہتا۔

روم اور برطانیہ کی سلطنتوں میں جو فرق ہے مارڈ کر و مرے اس کا خوب
نقشہ کھینچا ہے۔ دونوں کا نو کسی خاص اصول تفوق کے بغیر ہوا تھا۔

حالانکہ ایک جماعت ان کی مخالفت پر کمر بستہ رہا کرتی تھی۔ رومانے تہذیب
کی نشر و اشاعت کو کبھی اپنا مقصد نہیں قرار دیا تھا۔ سلطنت برطانیہ میں
یہ ایک معمول دستور چلا آ رہا ہے کہ حکومت کا قیام محکوم کے فائدے اور بہتری

کے لئے ہونا چاہئے۔ سیاسی اخلاق اب پہلے سے زیادہ ارفع ہو گیا ہے
حکومت میں جو بدعنوانیاں ہو جایا کرتی تھیں ان میں کمی واقع ہو گئی ہے غلامی

اب نام و نشان بھی باقی نہیں۔ طبیعیات کی ترقی کی وجہ سے تعداد اموات میں
تخفیف ہو گئی ہے۔ لہذا اس خیال سے موجودہ شہنشاہیت قدیم ضرور ہے
کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وسیع اور فراخ اقطاع انہیں ایک ہی حکومت کے

ماتحت ہوں لیکن پرانی سلطنتوں اور اس کے مابین اس بات میں فرق ہے کہ اس کے ماتحت آزادانہ مقامی ترقی زیادہ ہو سکتی ہے اس کا انحصار مالک محروم کے خراج پر نہیں ہے اس میں نیابتی عمودی حکومت ہوتی ہے یہ بھی تبادیلا ضروری ہے کہ زمانہ قبل کی سلطنتوں سے ٹھکر لینے والا اور کوئی نہ تھا لیکن موجودہ زمانے میں ایک سلطنت کی کئی سلطنتیں مخالف اور حریف ہوتی ہیں۔ وسیع اور دور دراز ملکوں میں ایک طریقہ قانون و حکومت کے قائم رکھنے کی دشواریاں بھی زمانہ قدیم کے بہ مقابلہ آج کہیں زیادہ ہیں۔ دنیا کی عمر پہلے سے زیادہ گنتی ہے اور جب مثال کے طور پر روم کو مختلف انجیال گزیریشمار قبیلوں اور بے معنی پرستش سے برتنا پڑتا تھا انگلستان کو جداگانہ قومی طبقتوں و نیز مکمل و مخصوص مذہبوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ زبانیں اب زیادہ مستعمل ہو گئی ہیں اور اسی وجہ سے اب نسلوں کو جذب کر لینے میں بہت تاؤ و مشکل درپیش ہوتی ہے حالانکہ روما کو کم دشواریوں کا سامن کرنا پڑتا تھا رقبہ بھی اب زیادہ وسیع ہیں اور آبادی بھی اس زمانے سے نسبتاً بد رجبہ زیادہ ہے۔

اگر ان تمام مشکلوں کا باوجود اکثر اشخاص خلوص دل سے شہنشاہیت کو ایک عہدہ جبر تصور کرتے ہیں تو اتفاقیہ ملک گیری کسی نہ کسی سبب سے ضرور واقع ہوتی ہوگی جس کے ذریعہ سے زمانہ حال کی تمام سلطنتوں کا نمود ہو رہا ہے اور اس کے نمود کا ذکر کئے بغیر ہی عہدہ حالیہ کی شہنشاہیت کے یہ معنی اخذ کئے جاسکتے ہیں کہ اس میں ایک وسیع خطہ زمین یا متعدد نسلیں ایک ایسے حکمران کے ماتحت

و محکوم ہوتی ہیں جو سب پر غالب اور فائق رہا کرتا ہے۔

سلطنتوں کی ابتداء

اصل میں جس طریقہ سے اس قسم کی سلطنتیں قائم ہوئی ہیں یہاں میں اس سے زیادہ سروکار نہیں ہے کیونکہ جو کچھ وقوع پذیر ہو چکا ہے اس کو وہیں نشیمن کرنے کے بجائے اس امر کی تقسیم زیادہ ضروری ہے کہ کون زبان ایسی ہے جس کو زیادہ میں لوگ مناسب سمجھتے تھے۔ اور آجکل سمجھتے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض سلطنتوں کا قیام اتفاقہ ہو گیا ہے۔

الجیریا میں فرانس۔ کانگو میں بلجیم مغربی افریقہ میں جرمنی جزائر انڈیا میں ریاستہائے متحدہ ایشیائے وسطیٰ میں روس اور مصر میں انگلستان کی حکومت سلطنت کے نام ہیں لیکن ان میں سے بعض سلطنتیں اتفاقہ قائم ہوئی گئی ہیں اور بعضوں کی موجودہ صورت قصداً معین کی گئی ہے۔ سلطنت کے بنانے میں برطانیہ جو ہمیں سر کی ہیں وہ واقعات اتفاقہ کا نمونہ ہیں نوآبادیوں میں ہمیں معلوم ہوا کہ ہماری نسل کے کثیر التعداد اشخاص نے بعض دور دراز اور غیر آباد ملکوں میں بود و باش اختیار کی تھی ان کو ابھی تک وہی قانون و حکومت پسند ہے جو ان کے آباد اجداد کو مرغوب تھے۔

کنڈا میں برباز ۱۸۳۵ء لارڈ ڈلہام کے مشن کا نتیجہ نکلا کہ نوآبادیوں کے لئے صاف طور پر حکومت خود اختیاری قائم کر دی گئی۔ اب رہا مالک محکوم کا

معاملہ اس کے سلسلے میں کنہا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں ہمارے کارہائے نمایاں کی تاریخ نہایت عبرت خیز ہے حکومت برطانیہ کے نام کی آڑ میں ایک تجارتی کمپنی کمزور قوموں سے زبردستی خراج وصول کرتی تھی۔ اس کے بعد یہ قرار پایا کہ حکومت مستقل بندوبست ہونا چاہئے اور ایک سلسلہ قوانین کے مطابق جس کا آغاز قانون پیٹ مجریہ ۱۸۵۷ء سے ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں یہ اصول قائم کیا گیا کہ انتظام حکومت اور تجارتی کاروبار ان دونوں باتوں کا ایک ہی جماعت کے ہاتھوں سے انجام پانا مناسب نہیں اس لئے تحفظ سرحد نیز ضرورت سے زیادہ آبادی کے لئے تلاش زمین کی غرض سے ہم نے قانون اور حکومت کے اسی طریقہ کو جو انگلستان میں رائج تھا وہاں سے لیجا کر اس قدر دور دراز ملک میں بھی جاری کیا۔ اس کارروائی کے خلاف سیاسی جدوجہد ہوتی رہی ہے اور ہمارے راستے میں جنگی رکاوٹیں بھی پیدا ہوئی ہیں لیکن ہم آنکھ بند کئے ہوئے آگے ہی قدم بڑھاتے گئے آخر کار جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم کو معلوم ہوا کہ بے خبری کے عالم میں ہم کل کر وہ ارض کے نصف حصے کے مالک مختار ہو گئے ہیں۔

اس قسم کے واقعات مثلاً فلپائن میں ریاستہائے متحدہ کے عمل درآمد کے سلسلے میں بھی ملیں گے۔ لیکن انیسویں صدی میں ایک اور میلان جاری ہو گیا جس سے طاقت اور وسعت کو اور بھی چار چاند لگ گئے۔ کالائیل نے پہلے ہی سے کسی نہ کسی قسم کی شہنشاہیت کے ظہور پذیر ہونے کی خبر دی تھی۔ غیر معمولی مشاہیر اور ان کے منصوبوں کے تذکروں میں بالخصوص اس کے متعلق پیشین گوئی کر دی تھی۔ جس طرح جرمنی کے قیام میں بھارک کے دل پر اس کا اثر پڑا تھا۔ اسی خیال

سے سبیل رہو ڈز کا دل متاثر ہو گیا تھا۔

ارادنا قایم کی ہوی سلطین ایسی ہوتی ہیں جیسی جوہنی کی سلطنت یورپ کے باہر غیر ملکوں میں ہے حکومت کی طرف سے کسی نوآبادی میں تجارتی مرکز حاصل کرنے کے لئے خاص تدبیریں اختیار کی گئی تھیں۔ مثلاً ڈاکٹر پیٹرز خاص ملک افریقہ میں جو زیمبابوئی دوسری جانب واقع ہے ۱۸۸۵ء میں بھیجے گئے تھے۔ صرف سلوہ نقشہ جات معاہدہ ان کے ہمراہ دیدے گئے تھے لیکن باوجود اس کے کہ زیمبابوئی میں دراصل انگریزوں کی نگرانی تھی اور وہاں انگریزوں کے تجارتی اغراض کا سب سے زیادہ زور تھا۔ شاہنشاہ جرمنی نے ۱۸۸۵ء میں دیسی سرداروں کو بھی اپنی فکر و میں شامل کر لیا۔ مغربی افریقہ میں بھی اس قسم کی کارروائی سے کیمبرنس کا وسیع علاقہ جرمنی کے ہاتھ آ گیا جو اضلاع انگریزوں کے خاص تجارتی مرکز تھے۔ جرمنی وہاں قطعی طور پر اپنا علم حکومت نصب کر دیا دیسی تاجداروں نے ۱۸۸۹ء میں مطالبہ کیا تھا کہ ان اضلاع میں انگریزی عملداری ہونا چاہئے جن پر بعدہ ۱۸۸۵ء میں جرمنی نے مدبرانہ حکمت عملیوں سے کام لے کر اپنا قبضہ کر لیا۔

مقابلہ بالکل صاف ہے۔ حکومت انگلشیہ کا قاعدہ ہے کہ وہ چارناچار ہمیشہ سرگرم مستعد تجارت پیشہ انگریزوں کے پیچھے پیچھے چلتی ہے بخلاف اس کے حکومت جرمنی میں عملداری کا دائرہ وسیع کرنے کے بعد بازار تجارت گرم کیا جاتا ہے انگلستان میں علم حکومت تجارت کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور جرمنی میں پہلے حکومت قائم کی جاتی ہے اس کے بعد تجارتی کاروبار کا سلسلہ چھڑا جاتا ہے۔

زمانہ حال کی شہنشاہیت کا قیام جن قوتوں سے ہوا ہے ان کا امتیاز

آسانی سے ہو سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اب آمدورفت میں بڑی سہولت ہو گئی ہے کیونکہ انگلستان سے کن ڈاٹک کا سفر اب ایک معمولی بات ہے جبکہ قرون وسطیٰ میں لندن سے یارک تک کا سفر ایک اہم کام تھا۔ آمدورفت میں سہولت ہو جائیے بول چال رواج اور قانون میں سبھی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پہاڑوں میں سڑکیں بنادی گئی ہیں۔ دیواروں پر ریل بانڈھ دئے گئے ہیں اور سمندر میں بھی برابر آمدورفت ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے پہلے کی طرح کسی مقام کے بھی باشندے علیحدہ نہیں رہ سکتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اگرچہ بزرگوار اشخاص حسب سابق اس وقت تک ایک ہی جگہ آباد ہیں اور انھوں نے وہاں سے کہیں نقل وطن نہیں کیا لیکن ان کا ان لوگوں کے ساتھ تعلق تو ہو گیا ہے جو ان کے ملک میں آتے جاتے رہتے ہیں نیز وہ باشندے خط اور تار تو بھیج سکتے ہیں فحوض اچھیں باتوں کی وجہ سے پرانی قوموں کی طرح اب ایسے قومی گروہ نہیں پیدا ہو سکیں گے جو ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ آسانی آمدورفت سے ذریعہ کا باہمی تبادلہ ہو جاتا ہے ایک زمانہ تھا جب ایک ملک تو دوسرے قحط کا شکار ہو کر پیٹ میں تو ادیتا تھا اور اس کے دوسرے ہمسایہ ملکوں میں غلہ بٹا پڑا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ ایسی ایسی تجارتی دشواریاں سدراہ تھیں جن کے سبب سامان خوراک ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں لیجا یا جاسکتا تھا۔ زمانہ موجودہ میں ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ ہر گروہ سامان خوراک و پوشاک کیلئے دوسرے طبقوں اور مباح اوقات ایسے گروہوں کا دست نگر رہتا ہے جو ہفتا وور دراز ملکوں میں آباد ہوتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ تہذیب یافتہ انسانوں میں کوئی فرقہ ایسا نہیں ہے جس کے اغراض صرف اسی ملک تک محدود ہوں جس میں وہ خود آباد ہوتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ (امریکہ) یا انجمن کے ریلوے چارٹر انگریزی سرمایہ صرف کیا جاتا ہے۔ فرانس کی کفایت شعاری کی بدولت روس اس سے قرض بلجاتا ہے۔ ایشیا نیز افریقہ میں یورپی قوموں نے جس قدر توسیع حکومت کی ہے اس کا صرف یہی ایک سبب ہے کہ مقبوضات جدید میں جو اغراض پیدا ہوئے ہیں ان کے تحفظ کی ضرورت تھی۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ توسیع تجارت اور بڑے بڑے تجارتی مرکروں کے قیام سے سلطنت ضرور قائم ہی ہو جاتی ہے لیکن بظاہر یہی چند باتیں وہ قوتیں ہیں جنکی بدولت شاہنشاہیت کا وجود ہوا تھا۔

پہلے یکساں اغراض والی قوموں کے درمیان تعلق قائم ہوا یا وہ موروثی رشتہ جاری ہوا جو خنک کے سبب سے پیدا ہوا اور تجارت کے ذریعہ سے جاری رہا۔ اس کے بعد اس تصور کی ابتدا ہوئی کہ مختلف ملکوں یا منسلوں میں اس قسم کے تعلقات کا موجود ہونا ایک اچھی بات ہے۔ گویا جب کوئی بات مسلمہ ہو جاتی ہے تو قیاس اس سے بھی آگے بڑھ کر معیار قائم کر دیتا ہے۔ لوگوں کو دو باتیں معلوم ہونے لگتی ہیں اول اغراض کو علیحدہ کر کے ایک مقام پر مرکوز و محدود کر دینا۔ دوم انہیں متحد کر کے قانون و حکومت کو آسان بنانا۔ جو لوگ ان دونوں میں سے نہانی الذکر کو قائم رکھ کر اس کے صعود کے لئے جدوجہد کرتے ہیں

وہ شہنشاہیت پسند کہلاتے ہیں اور باقی ماندہ اشخاص کا شمار حامیان قومیت کے زمرہ میں ہوتا ہے۔ فی الحال ہم ان دونوں نضب العین کا مقابلہ نہیں کرتے بلکہ صرف یہ دکھا رہے ہیں کہ معیار شہنشاہیت کن قوتوں کو سبب سے ناگزیر ہو گیا ہے

شہنشاہیت اور عالمیت

حال میں لوگوں کا روئے خیال اس طرف رہا ہے کہ اغراض مقامی قیود سے مستثنیٰ کر دئے جائیں اس کا صریحاً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیاسی معاملات بھی ایک خاص ملک تک محدود نہ رہا کریں لوگ اب سمجھنے اور محسوس کرنے لگے ہیں کہ کوئی گروہ علیحدہ نہیں رہ سکتا اس کے علاوہ ان کو ان فوائد کا بھی علم ہو گیا ہے جو مختلف طبقوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کرنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ محض خیالی پکوان پکانے اور شاعرانہ طبیعت رکھنے والے جو شیلے آدمی پر اس کا یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ تمام مخلوق سے محبت رکھنے کا دم بھرنے لگتا ہے کیونکہ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اب تمام انسانوں کو اس بات کا احساس ہونے لگا ہے ان کے اغراض عام اور یکساں ہیں۔ نیز تجارت اور دستور ان دونوں چیزوں کو تدبیر اور حکومت پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ ہم حب الوطنی کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن ان فوائد کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتے جو ہمیں ایک غیر زبان بولنے والی

قوم سے حاصل ہو سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو لوگ عالم کے محب ہونے کے قیال ہیں وہ شاہنشاہیت کی مخالفت کرتے ہیں حالانکہ یہ دونوں معارف جدا جدا ایک ہی طاقت کے زیر اثر اپنے اپنے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ لیکن عقل یہ قول کرتی ہے کہ سب سے زیادہ مضرات یہ ہے کہ ایک متضاد نتیجہ کو قائم نہ کئے خود اپنی بھی دلیل کلام میں لائی جائے۔

عمومیت کے پیرو شاہنشاہیت پرستوں سے اس لئے نفرت کرتے ہیں وہ زیادہ وسیع انجیالی سے کام نہیں لیتے۔ اس کے برعکس حامیان شاہنشاہیت کو اول الذکر سے اس لئے نفرت ہوتی ہے کہ وہ حد سے زیادہ تجاوز کر جاتے ہیں۔ جب عالمی کہئے یا بہبودی خلائق انسانوں کی مجلس اعلیٰ کے لئے یا تمام دنیا کے انسانوں میں اخوت باہمی کا قیام کچھ بھی نام رکھتے بہر حال یہ معارفی احوال غیر موثر ہے اس لئے اس پر سخت کرنا لا حاصل ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں اس کی طاقت بڑھ جائے مگر سر دست اس کا شمار زبردست قوتوں میں نہیں ہے۔ قومی یا مقامی اغراض کا ذرا سا بھی اشتراک اس طرح درہم برہم کر دینے کے لئے کافی ہے گویا یہ ایسا دھواں تھا جو جذبہ حقیقی کی ہوائ کے ٹھونکوں سے منتشر ہو گیا۔ یہ نصب العین ابھی تک اس قدر غیر معین ہے کہ کثیر التعداد اشخاص اس کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔

شاہنشاہیت ایسا مکان ہے جو راستے میں انصف فاصلہ پر واقع ہو اس کا یہ منشا ہے کہ اغراض ایک مقام میں مقید نہ رہیں اور اس کی وجہ سے زمانہ حال کی سیاسی معاملہ فہمی کا دائرہ وسیع ہو گیا

لیکن اس معیار کا اثر زیادہ دور تک نہیں پہنچتا ہے۔ اس کا انفعالی
 نقشبے محدود ہے۔ جیسا کہ تمام سیاست دان حضرات تسلیم کریں گے
 ان وجوہ سے نہ تو اس کے موثر ہونے اور نہ اس کے مفید و کارآمد ہونے
 میں کسی قسم کا نقص واقع ہوتا ہے۔ اوسط درجہ کے انسانی تخیل کی نمود
 رفتہ رفتہ ہوتی ہے وہ سیاسیات مقامی کی منزل سے ایک دم جب عالمی
 کی منزل میں نہیں پہنچ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے اغراض اس کے
 مقام توطن تک محدود نہیں ہیں لیکن اس کو یہ خیال ضرور ہے کہ اس کی
 دلچسپی اور دوسرے انسانوں کے مفادات یکساں نہیں ہو سکتے۔ معیار سازوں کا
 خواہ کچھ بھی خیال ہو۔ ایک معنی کر کے اس شخص کا خیال درست بھی ہے ان
 لوگوں کے درمیان ایک حقیقی رشتہ ہوتا ہے جو مختلف ملکوں میں آباد ہوتے
 ہیں۔ مگر جن کی زبان قانون اور دستور یہ سب چیزیں یکساں ہوتی ہیں۔ یہ
 رشتہ ان لوگوں میں نہیں ہوتا جنہیں ایک دوسرے سے محض تجارتی لگاؤ
 ہوتا ہے جو ایک ہی نسل کے ہوں یا یکساں طریقہ حکومت کے پابند ہوتے
 ہیں ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا ان میں سے کسی ایک کا تعلق دوسرے
 سے صرف اتنا ہی ہوتا ہے جتنا اور تمام انسانوں سے ہوتا ہے۔ اگر
 قومی خصوصیات کا امتیاز کرنا ہے تو ہمیں لازم ہے کہ ان باتوں کا خیال
 کریں جو کسی طرح کم وقعت نہیں ہیں اور جو فوق الاقوامی بھی جاسکتی ہیں

شہنشاہیت ملک پرستی کا علاج ہے

ہر ایک معیار کسی نہ کسی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لئے ہمیں یہ دریافت کرنا چاہئے کہ آخر میں وہ کون سی شے ہے جس کے تدارک کیلئے لوگ شہنشاہیت کی حمایت کرتے ہیں اس کا جواب انگلستان کے اچھے باشندہ کے کلمہ سے صاف ظاہر ہے جو زبان زد عام ہے۔ جو لوگ اس نام سے موسوم کئے جاتے ہیں وہ انگلستان کی سرگرمیوں کو مقامی اغراض کے نہایت تنگ دائرے میں محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ سیاسی طعنوں کی بھی اسی طرح کوئی وقت نہیں ہوتی جس طرح دیگر اہانت آمیز کلموں کی کوئی تو قیر نہیں کی جاتی۔ لیکن کم از کم ان طعن و طعنہ کا ذکر اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے آوازے کستے ہیں ان کو سیاست دیہی سے مبہم نفرت ہوتی ہے۔ انگلستان میں جو لوگ اپنے ملک کی طاقت کے زعم میں کسی کو نظر میں نہیں لاتے اور غیر ملک والوں کو ٹھنڈے دل سے نہیں دیکھ سکتے اور جن پر ایک زبردست بحری طاقت کا جنون سوار رہتا ہے وہ اس قسم کی غیر پختہ عقل کو پسند آتے ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے اغراض کو قریب ترین نواح تک محدود نہ رکھے حالانکہ اس تکبر آمیز وطن پرستی کو ایک سمجھ کا پھر سمجھ کر ہم اس کی چھان بین نہیں کرتے جس سے روشن خیال موجدوں کو بڑی چسپی حاصل ہوتی ہے۔

لیکن ہم کو جاننا پڑے گا کہ قریہ کی سیاسیات کی طرف مائل ہونا عین اقتضائے
 فطرت ہے۔ ایک معاشرتی حیثیت کی طرف توجہ کرنے سے بھی انسان تنگ نظری کا
 شکار ہو جاتا ہے۔ فوری ضروریات نیز مقامی مصائب کی طرف اپنی تمام توجہ مرکوز
 کر دینے سے ان تکالیف کا مقابلہ اور ضروریات کے مہیا کرنے کی طاقت بھی مفید
 ہو جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وسیع نظریہ ناقابل عمل ہی ہوا اور معاشرے
 کی اصلاح کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس تمدنی اصلاح کے علاوہ او
 کوئی کام نہیں ہوتا ایک تنگ دلی ایسی ہوتی ہے جو آزاد خیالی کے ساتھ کجباتی ہو
 اور ہم کو ان اغراض کے دیکھنے سے باز رکھتی ہے جو ہماری نظر کی اصلی حد سے دور
 ہو گئے ہیں آزادی کے بہانے سے حکومتیہ تنبیہ کی جاتی ہے کہ ہر ایک ایسے کشاد
 اور وسیع جذبہ کو بے اعتباری کی نگاہ سے دیکھیں جس سے یہ احتمال ہو کہ ہم دور دراز
 قوموں کے معاملات میں حصہ لینے لگیں گے۔ بار بار اپنے سامنے کے منظر کو کج نگاہی
 دیکھنے سے ہمارے قیاسات دب جاتے ہیں اور اغراض پیچیدہ ہو جاتے ہیں
 اس تنگ خیالی کا وجود محض ان اخباروں کے اقتضائی مضامین ہی سے نہیں
 دکھایا جاسکتا ہے جو شہنشاہیت کے مخالف ہوتے ہیں بلکہ خود شہنشاہیت کا دم
 بھرنے والے جدید خیالات سے بھی اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ کے انقلاب
 کے مقابلہ ٹونگ کے قتل کی خبر کے لئے زیادہ جگہ اخبارات میں دی جاسے گی۔
 قصر بنگلہم کے دربار کی پوشاکوں کا اگر ذکر درج کرنا ہوگا تو آسٹریلیا کے انتخابوں کا
 حال نہ شائع کیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ محض انگلستانی اخبار ہی مقامی
 اغراض اور مقامی رجحانوں میں اپنا دائرہ محدود رکھنے کے غامدی نہیں ہیں۔ ریاستہائے

متحدہ میں بروزانہ اخبارات شخصیات کے زیر عنوان مضحکہ خیز تفصیلات سے بھر جاتے ہیں جن میں ان اشخاص کے متعلق خبریں درج ہوتی ہیں۔ جن کو دنیا میں شہہ بھر بھی اہمیت حاصل نہیں۔ فرانس۔ جرمنی اور اطالیہ کے تمام اخباروں میں بھی اس قسم کی تنگ نظری کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ممکن ہے کہ شاید ان اخباروں کا یہی خاص مقصد ہو یعنی مقامی لغویات کا تذکرہ جس پر عوام چہ میگوئیاں کریں لیکن سوال صرف یہ ہے کہ دیہی سیاسیات میں حصہ لینے کی عادت ہم میں موجود ہے اور نہ بنشابت کسی کسی طریقے سے اس کی درستی کر سکتی ہے۔ مگر یہ درستی اور اصلاح اقتدا حسبہ مضمونوں کے مبہم جذبات سے نہیں ہو سکتی یہ اسی حالت میں ممکن ہے جب ہم کو دو دراز ملکوں اور مختلف اقواموں کے بارے میں واقفیت حاصل ہو کیونکہ اگر ہمارے دماغ میں محض ملک پرستی کی ہوا سمائی ہے تو امپیریل نقطہ خیال سے کسی بات کا احساس کرنا بیکار ہے۔ جب ہمیں اپنے گھر کے علاوہ اور کسی جگہ کے واقعات کا علم ہی نہ ہوگا تو ہم بڑے بڑے مسئلوں پر غور کس طرح کر سکتے ہیں۔ مشہور و معروف مورخ سیلی کے مساعی جمیلہ کا مدعا ایسے خیالات کو ترقی دینا تھا جو ملک پرستی کے مخالف ہوں۔ کیا جرمنی اور کیا فرانس ہر جگہ یہی خیال ہے کہ افریقہ کے وسیع اور لائق ترقی خطوں کے ایک ہی قانون و حکومت کے ماتحت ہونے کی خواہ کوئی بھی وجہ ہو کسی سیاسی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ان کے وجود کو ایک بنیادی واقعہ تصور کرنا چاہئے۔ بالفرض یہ خیال بھی کر لیا جائے کہ ایک روز ایسا آئے گا کہ جب انگلستان کو ہندوستان کی سرزمین سے اپنا قدم اٹھالینا پڑے گا تو انگریزوں

محض ہندوستان کو خالی کر دینے سے یا استہائے متحدہ امریکہ کے لئے صورت
حالات میں ایک عظیم الشان فرق واقع ہو جائے گا۔ اس سے بھی زیادہ نظر اٹھا
دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر روس امدیا استہائے متحدہ امریکہ آپس میں متحد
ہو جائیں تو یورپی حکومتوں مثلاً فرانس اور جرمنی کی ان کے سامنے کچھ وقعت
نہ رہے گی اور انگلستان سے مراد صرف حکومت متحدہ ہے تو وہ بھی ان کے
مقابلہ میں ذرا سارہ جائے گا۔

اصول شہنشاہیت کی حمایت

اب ہم اس قطعی دلیل پر غور کریں گے جس سے زمانہ حال کی شہنشاہیت کے
معیار کو تقویت پہنچتی ہے۔ اس بحث پر غور کرنے کے لئے تین باتیں ہیں مد نظر
رکھنا پڑیں گی یعنی (۱) انسانوں کے ایسے بڑے گروہ موجود ہیں جو دور دراز ملکوں
میں رہتے اور یکساں طریقہ قانون و حکومت کے پابند ہوتے ہیں۔ (۲) جن قوتوں
یہ صورت حالات قائم ہوئی ہے وہ قدرتی ہے اور اس کی ارتقائے آسانی سے
ہو سکتی ہے (۳) ملک پرستی کے خلاف جو خیالات ترقی پذیر ہو رہے ہیں ان کی
مخالفت ضروری ہے ان تینوں باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے سوال پیدا ہوتا ہے
لوگ جو کیفیت قائم کرنا چاہتے ہیں وہ لفظ شہنشاہیت میں مخفی ہے شہنشاہیت
کے لئے جو حد درجہ کی حمایت کی جاتی ہے پہلے اس کا ذکر کیا جائے گا۔ کیونکہ
اس کو معیار تسلیم کرنے کا مطلب یہی ہے کہ یہ جاہد ترقی میں سراسر زحمت انداز

نہیں جوتی۔ بعدہ شہنشاہیت کے بارے میں نکتہ چینی کی جاتے گی۔ عام طور پر اس بات سے سب کو اتفاق ہو گا کہ جب سب چیزیں مساوی ہیں تو جقدر وہ خطہ زمین سرسبز ہو گا جہاں یکساں قانون جاری ہے۔ اسی قدر زیادہ بہتر کی صورتیں وہاں کے باشندوں کے لئے پیدا ہو جائیں گی۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ متعدد ممالک میں ایک ہی طرز کا قانون رائج ہونا غالباً وہاں کے مقامی ضروریات کے لحاظ سے موزوں ہو بھی لیکن اس کے بارے میں آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ بہر حال یہ صاف عیان ہے کہ جو قوانین وسیع پیمانہ پر جاری تسلیم کئے جاتے ہیں ان سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ گویا انگلستان آسٹریلیا نیز کنڈا میں یکساں قانون معاہدہ ہونے سے تجارتی معاملات کو بڑا نفع پہنچ سکتا ہے بعض تجارت پیشہ اصحاب کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر فرانس اور اطالیہ میں بھی وہی قانون رائج ہو جائے تو بہت اسی فہمیتیں دور اور مصارف کم ہو سکتے ہیں لیکن اس قسم کے حالات کا واقع ہو جانا ایک ایسا خواب بھی ہو سکتا ہے جو کبھی پورا نہ ہو۔ بہر حال جن مقامات میں ایک ہی قانون پہلے سے موجود ہے وہاں اس کو قائم رکھ کر اس کا ارتقا کرنا ہر طرح جائز اور معقول ہے مگر یہ سہا ہے متحدہ میں اس وجہ سے نہایت غیر ضروری پریشانی پیدا ہو جاتی ہے کہ مصدقہ ادویہ کے متعلق مختلف ریاستوں میں مختلف قوانین رائج ہیں۔ اگر کوئی مصدقہ دوا کی بول فروخت کے لئے کسی ریاستوں میں بھیجنا ہو تو اس کی تصدیق کیلئے کئی مختلف ریاستوں کی مہر لگانا پڑتی ہے۔ تجارت میں ان رکاوٹوں کی یہ ایک ادنیٰ سی مثال ہے جو ملک کی خود سہانہ تقسیم حکومت سے پیدا ہو سکتی ہیں۔

مگویا کسی نہ کسی قسم کے قومی معیار کے خلاف ممکن ہے کہ ایک جماعت کو اور دوسرے
 گروہوں کے ساتھ متحد دھو جانے میں فائدہ پہنچ جائے جو ایک رنگ کے قانون
 حکومت کے ماتحت ہو خواہ نوعیت اور سابقہ روایت کے لحاظ سے وہ دوسرے
 طبقہ اس ایک گروہ سے جداگانہ بھی کیوں نہ ہو جدا جدا قوموں کے مابین بھی عام
 اغراض ہوتے ہیں جن کو مقامی ضروریات پر فوقیت حاصل ہونا چاہئے۔ ایسی
 مقامی ضروریات کا دفعیہ بسا اوقات ان کو ایک قومی حکومت کے ماتحت کر دینے
 سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ یہ شخص واقعہ ہی نہیں ہے کہ اگر وہ قوانین وسیع طبقات
 ارضی کے لئے بھی جائز قرار دے جائیں جو ایک ملک میں رائج ہیں۔ تو اس ملک
 باشندوں کو روپیہ پیسہ زیادہ حاصل ہونے لگے گا۔ زندگی کی عام باتوں پر ایک
 طرز کے قانون کا جو اثر پڑتا ہے وہ اس اثر سے زیادہ اہم ہوتا ہے جو محض مالی
 حالت پر پڑتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے دور دراز ملکوں کے باشندوں کے ساتھ
 ان کے تعلقات زیادہ آسان اور سادہ ہو جاتے ہیں ایک ملک کے باشندے
 دوسرے ملکوں کے کثیر التعداد باشندوں کے ساتھ سلسلہ رسل و رسائل قائم
 کر سکتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی میں اور بھی قسم قسم کی یکجہاں
 پیدا ہو جاتی ہیں۔ اساسی قوانین کو مسئلہ قرار دینے سے دیگر مسائل پر غور کرنے
 کے لئے ہمارے دماغ آزاد ہو جاتے ہیں۔ اگر کشتی شخص کو یہی نہیں معلوم ہے کہ
 کون ایسی عام بنیاد ہے جس کے مطابق وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ پیش رفت
 تو ان ابتدائی باتوں ہی پر غور کرنے میں بہت کچھ دقت اور خیال کی بربادی
 ہو جاتی ہے جو انسانی ربط و ضبط کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ

ہم متعدد مختلف قوموں یا کم از کم مختلف ملکوں میں اپنی قوم کے متعلق تمام امور پر غور اور عمل کر سکتے ہیں یہ ایک پیش قدمی ہے جس کو تہذیب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک جہذب اور جاہل انسان میں صرف یہی ذوق پیدا ہوتا ہے کہ اولاً لڑکے میں اپنی ذات کو تمام عالم میں وسعت دینے اور دائرہ زندگی سے باہر قدم کھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہماری مراد کلام یہ نہیں ہے کہ اس سے مزید اغراض اور مشاغل پیدا ہو جائیں گے جن سے انسانوں کی ایک تعداد کثیر کو ذاتی فائدہ پہنچنے کے لئے زیادہ موقع مل سکتا ہے۔ درست یہ بھی ہے لیکن اس میں بے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت ہر انسان میں زیادہ کشادہ دلی کی عادت پیدا ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ صحیح ہے کہ جو لوگ شہنشاہیت کے مخالف ہیں اس شخص کے ظاہری تلون کو بے اعتباری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو ایک لمحہ کے لئے بھی اس افلاس اور بیماری کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے جو خود اس ملک میں نازل ہونے والی ہیں لیکن اگر ایک بڑی حکومت کے باشندے فخر و ناز نہیں بلکہ ان ذرائع کی نوعیت کا احساس کرنے کے لئے جن سے معاشی اصلاح ہو سکتی ہے ان عظیم الشان طاقتوں پر پُر اثر طریقہ سے غور کریں جو ان کے طریقہ قانون و حکومت میں واقعی موجود ہیں تو تمدنی اصلاح کو بہت فائدہ ہوگا۔ اس میں ایک ایسے قیاس کی جھلک پائی جاتی ہے جو انگریزی حکومت کے خیال کسی طرح بھی ناقابل عمل نہیں ہے۔

ابھی تک تحریک شہنشاہیت کے صرف عہدہ پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے ہم نے معیار یعنی ایک ایسی نفیس شے کی آرزو کا ذکر کیا ہے جس کا عام طور پر

اعتراف کیا جاتا ہے۔ اگر لفظ سلطنت نہ بھی استعمال کیا جائے تو کسی نہ کسی قسم کی غیر قومی یا فوق الاقوامی حکومت کو قائم رکھنے کے لئے ان لہجوں کو جائز تصور کرنا چاہئے جو شہنشاہیت کے حق میں پیش کی جاتی ہیں۔

اعراضات

ہر ایک معیار ایک ایسی شکل میں بنامول ہے جو بگڑ جایا کرنی ہے اور جس کو اس کے نصب العین کے پامال ہو جانے کا بھی اندیشہ رہتا ہے قدیم معیاروں کی طرح زمانہ حال کے معیار بھی اس قانون سے کسی طرح مستثنیٰ نہیں ہیں۔ حریت کا وجود ہوا ہے ناجائز آزادی عمل پر ردہ ڈالنے کیلئے اور نظام کا وجود خود سری کو ناجائز ثابت کرنے کے لئے اسی طرح شہنشاہیت بھی ایک تسلیم کی ملک پرستی کی مٹان ہے جو اس وجہ سے اور بھی مضر ہوتی ہے کہ اس کو کوئی تسلیم نہیں کرتا۔

اب ہم کو لفظ شہنشاہیت کے ناجائز استعمال کے بارے میں اظہار خیال کرنا پڑے گا یا اگر یہ کہا جائے کہ اس کا خراب استعمال ہی واجب استعمال ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شہنشاہیت ایک ضرر رساں شے ہے جو انسانی ترقی میں سد راہ اور سیاسیات معقول کے حق میں سم قاتل ہے لیکن ہم یہ نہیں مان سکتے کہ لفظ شہنشاہیت محض کینہ اور سفلی خواہشات ہی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اسی لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب ہمیں اس لفظ کے ناجائز استعمال پر روشنی

ڈالنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مرتبہ فہرشت بیت سے یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ ایک سلطنت کے باشندے دوسری سلطنتوں کے باشندوں کے مقابلہ زیادہ مہذب ہیں یا یہ کہ ان کی تہذیب چھوٹی چھوٹی قوموں کی شائستگی کے بمقابلہ زیادہ پیش بہا ہے۔ اسی خیال سے ایک انگریز یا جرمن ڈنمارک یا سوئٹزرلینڈ (سوئٹزرستان) کو محی نگاہ سے دیکھتا ہے اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اول الذکر کو زیادہ شہولتیں حاصل ہیں مگر یہ کہنا کہ زیادہ شہولتیں حاصل ہو جائیسے وہ فائق اور برتر ہیں۔ اس خیال کے برابر ہے کہ جس شخص کے پاس بود و باش کے لئے ایک بڑا مکان ہے وہ اس شخص کے مقابلہ زیادہ اچھا ہے جو ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ آسائشات زندگی کی افراط سے خواہ مخواہ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس شخص کو نعمتیں حاصل ہیں اس کی زندگی زیادہ اچھی ہے کیننگ کی نمایاں گستاخی کا اثر ناخموں پر پڑ سکتا ہے جس کی نسی میں محض زبانی جمع و خرچ سے کام لیا جاتا ہے اور بظاہر سلطنت پرستی کی حمایت کی جاتی ہے وہ ان لوگوں کو بڑی بڑی امیدیں دلا سکتی ہیں جنکو ابھی تک یہی نہیں معلوم کہ تہذیب دراصل کیا چیز ہے اور اس کا مدعا کیا ہے جن کے اغراض صرف لہو لعب تک محدود ہیں اور جنکو صرف ڈھول نوازی سے جوش دلا یا جاسکتا ہے۔ لندی یا برلن کے غیر مہذب باشندوں کے سر میں یہ ہوا سما جاتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کو اپنی طرح جامہ تہذیب سے مزین کرنے کے لئے خدا کی طرف سے مقرر کئے گئے ہیں۔ اور جس قدر اس کو انگلستان

یا جرمنی کی تنہید باتیں کم دکھائی دیتی ہیں۔ اسی حد تک اس کو اپنے مذکورہ بالا خیال میں زیادہ اعتماد ہوتا ہے کیونکہ ایک جہذب ملک میں ہمیشہ زیادہ تعداد ایسے اشخاص کی ہوتی ہے جو تعلیم سے بے بہرہ یا تہذیب سے محروم ہوتے ہیں مگر دوسروں کے مقابلہ ان لوگوں کے دل میں غیر ملک والوں کے ساتھ التفات کرنے کا زیادہ شوق ہوتا ہے۔

ایک نہایت فیشن دار کلب میں خوب پاؤں پھیلا کر سونے اور پیٹ بھر کھانے والے اشخاص خود کو ہندوستان یا چین کے صناعتوں کے بہ مقابلہ زیادہ فائز و برتر تصور کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ اگر وہ کلب کہیں لندن میں ہو تو شہنشاہیت کے زور میں جرمنی کے علمائے کو وحشی قرار دیدیتے ہیں اگر کلب برلن میں ہو تو وہ ایک انگریز مجسٹریٹ (قاضی) کو قدیم زمانے کا خود مہر سمجھتے ہیں اگر اسی کا نام شہنشاہیت ہے تو پھر اس میں اور یہی سیاسیات میں کیا فرق رہا۔ اس کا نام شہنشاہیت نہیں ہے۔ ہاں۔ یہ شہنشاہیت صرف انہیں معنوں میں ہو سکتی ہے کہ اس کی گستاخی عالمگیر ہے۔

مغربی تہذیب میں لوگوں کو اس بات پر بڑا ناز ہے کہ ہم مشرق کو بہت کچھ فیض پہنچا سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون چیز ہے جو مشرق کو ان سے حاصل ہو سکتی ہے اور مغرب نہایت فخر و مباہات کے ساتھ اول الذکر کو عطا کر سکتا ہے ہمارے پاس جسم و دماغ کی آزادی کے لئے ڈھونڈنا اور پانچویں اپنی نسل کی بخوبی تفہیم کرنے کے لئے ماسٹن اور گین کے کارنامے موجود ہیں ان کے علاوہ صد ہا شاہروں۔ صناعتوں اور مطربوں کے تصانیف بھر

پڑے ہیں جن سے امکانات زندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ہم عام طور پر عالم تاریکی میں گرفتار بہت پرستوں کو وفاقی انجمن برقی روشنی اور ایک ہونے کوشت کی نعمتیں بہم پہنچاتے ہیں ممکن ہے کہ کبھی خیال آجائے کہ ہم شراب کی ہرند اور جبریہ بھرتی کی حد بندی بھی کر دیں۔

جو نقاد صحیح المدماغ ہیں وہ ہمیشہ ایک تاجر کو مغربی تہذیب کا نمائندہ سمجھنے کی غلطی نہ کریں گے اور نہ وہ گاہے گاہے پیدا ہو جانے والے شعر کو مشرق کی اوسط پیداوار قرار دیں گے۔ نہایت غور و احتیاط کے ساتھ انتخاب کئے ہوئے برگزیدہ اشخاص کا مقابلہ کر کے مشرقی عقل کو دانائی و فہم ترجیح دیدینا اسی طرح آسان ہے جیسے لندن کا حقیر سے حقیر باشندہ خود کو محض اس لئے آسانی سے مہذب تصور کرتا ہے کہ وہ اسی ملک کا باشندہ ہو جہاں ڈارون پیدا ہوا تھا۔

غیر جانب دارانہ تنقید میں یہ ناممکن ہے کہ ایک طرز عمل کی حمایت کی جائے اور دوسرے کو مذموم قرار دیدیا جائے۔ اپنے قدرتی تعصبات اور ناگزیر نقد ان معلومات کا اقرار کرتے پر بھی شاید ہم کو اپنی تہذیب غیر ملکوں کی تہذیب کے بہ مقابلہ زیادہ فائز و برتر معلوم ہوتی ہے لیکن فرض کر لیں کہ یہ فائق ہے بھی تو اس کی فوقیت کا دعویٰ اس وقت درست ثابت ہو سکتا ہے جب اسکی قدر و قیمت کا اندازہ لوگ کریں جنکو اس سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔

گر یہ دعویٰ اس وقت بالکل فسخ ہو جاتا ہے جب دوسروں کو اپنی تہذیب کے لئے زبردستی مجبور کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری تہذیب کے

بیرہ ہماری تہذیب کے محاسن سے ناواقف ہوں لیکن ان کی آنکھوں پر زور سے
بٹھی باندھ دیتے سے تو ان کو ہماری تہذیب کی خوبیوں کا مشاہدہ کرنے میں
اور بھی مشکل پیش ہو جائے گی حالانکہ اس قسم کے دباؤ سے وہ ہماری تہذیب
پر نگاہ ڈالنے کا یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ ہم یہ مشاہدہ اس لئے کرتے ہیں کہ آئندہ
ان کی روک تھام ہو سکے۔

بعض حالتوں میں شہنشاہیت سے یہ مراد ہوتی ہے کہ جن دستوروں کے
مطابق زندگی بسر کرنے میں ہمیں سہولت ہوتی ہے وہ اس قدر عمدہ ہیں کہ انہیں
ان غیر ملک والوں کے مابین زبردستی رائج کرنا چاہئے جو ان کو قبول کرنے کے
لئے راضی نہیں اور جو اس بات کا اندازہ کہ مغربی قومیں کس قدر اعلیٰ ہیں اس
خوبی کے ساتھ نہیں کر سکتے جیسا ہم کر سکتے ہیں شہنشاہیت ابھی تک ملکیت
کے خلاف تھی مگر اب اس میں حد سے زیادہ ملک پرستی کی جاتی ہے گویا یہ ایک
اعلیٰ پیمانہ کی مقامی سیاست ہے۔

اب ذرا غور کرنا چاہئے کہ روسے زمین پر کوئی ایسی شہنشاہی حکومت
یا قانون ایسا نہیں ہے جو تمام مشمولہ جمہوروں کے قانون یا حکومت کے اعلیٰ
تیس اجزاء پر غور کرنے کے بعد قائم ہوا ہو۔ ممکن ہے کہ یہ مدعا معیار میں شامل ہو
لیکن عملی طور پر شہنشاہی حکومت اور شہنشاہی قانون ہمیشہ اسی نظام کو کہتے
ہیں جو مشمولہ جماعتوں میں ایک جمہور کے لئے قدرتی ہو اور دوسرے اجزاء میں
نافذ کیا جائے۔ اگر اپنا طریقہ قانون و حکومت نافذ کرنے والا گروہ نیک نہیں ہے
اور اس کو حتی الامکان بہتر سمجھ کر دوسروں میں رائج کرے تو اس سے کچھ

فرق نہیں واقع ہو جاتا۔

حامیان شہنشاہیت کی نیت ملک پرستی کا تو ذکر ہو چکا اس کے علاوہ عام طور پر لوگ یہودی سلطنت کے خیال سے مقامی تفرقات کی ترقی ہونے نہیں دیکھتے۔ یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اس قسم کی مقامی تفریق سے مختلف مقامی گروہوں کی ترقی میں ہرج و مرج واقع ہو جانے کا احتمال ہو سکتا ہے اور جو لوگ دور دراز رہتے ہیں ان کا طریقہ حکمرانی و عدالت اس بنا پر جذب ہو سکتا ہے لیکن یہاں ہم یہ دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے اضلاع میں تجارت یا غیر منجستہ قیود کے خلاف جو اعتراض واجب طور پر کیا جاتا ہے لوگ اس کا استعمال نامناسب طریقہ سے ان تفرقات کو دبائے کے لئے کرتے ہیں جو متعارف قوموں اور تمام دنیا دونوں کے حق میں مفید ہوتے ہیں۔ معقولات کا اقتضار ہے کہ قوم کی اہم جمیدہ ناہمواریوں کو اس غرض سے دور کرنے کے لئے کہ اتحاد قائم ہو جائے سی سیاسی معیار و خانی انجن کی طرح استعمال نہیں کیا جاسکتا اور وہ اتحاد بھی کیا بھدا اور غیر معنی خیز مگر ایسا واقعی کیا گیا ہے۔ بارہا شہنشاہیت نے ایک قوم کے تمام اختلافات دور کر کے اس کو ایک قالب بے روح بنا دیا ہے اسکی حیثیت صرف اس لحاظ سے ترقی کن سمجھی جاتی ہے کہ اس میں اب نہ شاعر کا چرچا رہا نہ بڑی بڑی ہنگامیں دل میں باقی ہیں اور صرف ٹرام گاڑی چلائی جانے لگی ہے یا کوئلہ کانوں سے نکالا جانے لگا ہے۔ اگر کسی حالت میں مقامی اغراض بڑے بڑے مسئلوں کو جگہ دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں تو

ایک دوسری کیفیت ایسی بھی ہے جس میں کسی مسئلہ کو بھی مقامی اغراض پر تفوق نہیں ہونا چاہئے خواہ وہ مسئلہ اہم سے اہم اور حتی الامکان وسیع تر بھی ہو۔ کوئی گروہ گننا ہی حقیر اور قلیل التعداد کیوں نہ ہو مگر اس میں اس کی خاص روح ہوتی ہے اگر انسان سے کہا جائے کہ حکومت کی ضروریات اس کے ارمان حصول دولت پر فوقیت رکھتی ہیں اس لئے اس کو محصول ادا کرنا چاہئے تو وہ انسان اس مطالبہ سے اس بنا پر راجحاً نہیں کر سکتا کہ اس کی ذاتی ضروریات حکومت کی ضروریات پر فائق ہیں۔ وہ اپنے ضروریات پر زیادہ زور نہیں دے سکتا لیکن اگر اس شخص سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ ”حکومت چاہتی ہے کہ شکم پر پی اور تن پوشی کے سامان کے علاوہ تہا سے پاس اور کچھ مال و متاع نہ ہونا چاہئے۔ نہ تم اکتساب ہنر کرو نہ کسی سامان آسائش کے حصہ دار بنو تم کو اور کوئی خواہش رکھنے کا اختیار نہیں ہے تو اس قسم کے مطالبات صرف اسی حالت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب دنیا میں کوئی حکومت قائم ہی نہ ہو۔ اسی لئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جس چھوٹے سے گروہ یا قوم پر یہ زور دیا جاتا ہے کہ شہنشاہیت کے خاطر وہ اپنے دستور۔ اپنی زبان۔ اپنے قانون اور اپنی تمام قسم کی حکومتوں کو خیر باد کہہ دے تو اس کے جواب میں یہ غدر کیا جاسکتا ہے کہ اس قسم کا مطالبہ کرنے والی سلطنت کا وجود دوسرے غیر مطلوب اور باعث تحقیر ہے جس سلطنت کو مہذب اور معقول پسند اشخاص تسلیم کرتے ہیں اس کو اپنے اندر دینی مقامی اختلافات کا ضروری لحاظ رکھنا چاہئے۔

اب رہا اس قسم کا سوال جس کا اثر کسی سلطنت میں سب پر غالب ہوتا ہے اس میں شہنشاہیت کی ضروریات کثیر التعداد لوگوں کے مفاد میں رخنہ انداز ہو جایا

کرتی ہیں۔ اس کا دار و مدار جنگی قوت زبردست سرکاری فرقہ یا خفیہ مطلق الامنان حکومت پر ہو سکتا ہے ان تینوں باتوں کے بابت سب جانتے ہیں کہ ان سے آزادی عمومی حکومتوں کی ترقی میں بڑا ہرج واقع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شہنشاہت پسندی کے رویہ کا مالی فائدہ چند اشخاص تک محدود رہتا ہے۔

منفعت عامہ کی آڑ میں ذاتی مفاد کی ترکیبیں بڑی آسانی سے تراشی جاسکتی ہیں۔ اس قسم کے اغراض شہنشاہیت کے خلاف پیش کئے جاتے ہیں یا زیادہ محتاط الفاظ میں یوں کہنا مناسب ہے کہ یہ وہ قیود یا خطرات ہیں جن کا ایک صحیح الدماغ شہنشاہی حکومت کو مقابلہ کرنا چاہئے۔ عذر کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہی وہ دھچپی یا خطرے ہیں جن سے برستم کی قومیت کو اس قدر جلد نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ رہتا ہے جس قدر جلد کوئی گروہ اپنے ہمسایوں کے بہ مقابلہ زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ یہ اعتراضات و خطرات سلطنتوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں اگر کوئی بڑی بھاری حکومت جس کے اندر ایک ہی قسم کا طریقہ قانون و عملدار کا مختلف ممالک اور متعدد قوموں میں جاری ہو تہذیب کے حق میں مضرت رساں نہیں بلکہ فائدہ بخش ثابت ہونا چاہتی ہے تو اس کو خود اپنی عظمت سے دو ہاتھ کرنا پڑیں گے۔

وفاق

اب اس چیز کے متعلق بحث کی جائے گی جس کو افلاطون لفظ ”وفاق“ کہا کرتا تھا وہ وفاق ہے۔

گزشتہ چند سال تک اکثر انگریز یہ خیال کرتے تھے کہ اس لفظ کا کوئی مادی تعلق سیاسیات سے نہیں ہے لیکن جب سے اسٹرکاتنازعہ چھڑا ہے اسوقت سے وفاق کے ذریعہ حل مسائل کے لئے بہت کچھ خامہ فرسائی کی جا چکی ہے ہمیں فی الحال فوری عملی مسئلوں سے سروکار نہیں اور لفظ وفاق کا جس صورت سے استعمال ہو گا وہ اس لئے بالکل نظر انداز کئے دیتے ہیں کہ انگلستان کی سیاسی عمارت اس کو جس طرح چاہیں مستعمل کریں ہم کو تو صرف اس قسم کی شہنشاہی سے شرکاء ہے جس کا مدد و مدار سلطنت کے کسی ایک گروہ کے زیر اہتمام نہیں بلکہ مشای اللہ جہا قوموں کے باہمی اتحاد پر ہوتا ہے۔

ہمیں یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ فلاں لفظ کا استعمال واجب ہے یا نہیں۔ غالباً وفاقی سلطنت متضاد اصطلاحوں کا مجموعہ ہے۔ بخلاف اس کے وفاق ایک ڈھیلے ڈھالے بند و بست کا نام ہے اور وہ اتحاد خالص نہیں بلکہ اتفاق پر مبنی ہوتا ہے لیکن اس موقع پر اس لفظ کا استعمال محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا ہے کہ اب یہ ہرگز نہیں خیال جاسکتا کہ جو کثیر التعداد انسان مثلاً آسٹریلیا۔ کناڈا۔ انگلستان۔ ایرستان (جس میں مصر اور ہندوستان کا ذکر شامل نہیں) میں آباد ہیں۔ وہ ایسے گروہوں میں متحد ہیں جن میں سے ایک طبقہ باقی تمام گروہوں پر غالب رہتا ہے ایسا کہنے سے تنہا عزت ہوگی ملک پرستی کا پہلو پیدا ہو جائے گا اور مقامی طاقت زندگی دب جائے گی اس لئے کل وسیع گروہ کو ایک جماعت سمجھنے کا صرف امکانی طریقہ ہے کہ یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر ایک گروہ وفاق میں دوسروں کے ساتھ مساوی

حیثیت سے منسلک میں بشمولہ حلقوں کا مساوی ہونا پہلی شرط ہے اس کا
 یہ مطلب نہیں ہے کہ سب مساوی طور پر دولت مند ہوں یا سب کے قبضہ میں برابر
 رقبہ کے ملک ہوں اس کا یہ بھی منشا نہیں کہ ہر ایک جماعت کا بندوبست اسکی
 عادت اور خصائل یا اس کی جنگی طاقت یہ سب باتیں یکساں اور مساوی
 ہوں۔ افراد کے سیاسی مساوات سے ہمارا منشا یہ نہیں کہ ہر شخص دیگر اشخاص
 کی طرح صاحب مال و منال ہے اور ان سب میں برابر برابر عقل موجود ہے
 اسی طرح ایک ایسی سلطنت کے مشمولہ گردہوں کی سیاسی مساوات کا ذکر کرنا
 جو سلطنت و قافیہ پر مبنی ہو ہرگز معقولیات سے بعید نہیں ہے۔ اس فقرہ
 کے استعمال کرنے سے ہمارا منشا صرف یہ ہے کہ ہر فرقہ کو خود اس بات سے
 بخوبی واقفیت ہونا چاہئے کہ اس کے لئے کون چیز نہایت فائدہ مند ہے
 ان گردہوں میں سے کوئی بھی دوسرے گردہ کو سیاسی طور پر ناقابل نہ سمجھے
 اور ہر طبقہ اپنی جماعتوں کے ذریعہ سے اپنی ذاتی اغراض کے واسطے میں
 اپنے تخیل کا اظہار کرے اس کے ثبوت کے لئے سلطنت برطانیہ کی مثال زیادہ
 مستحکم ہے اس لئے ہم اولاً خود اختیاری نیز دوسری قسم کی نوآبادیوں اور
 دویم خود مختار قوموں کے مساوات کے خلاف جو وقتیں تصور کی جاتی ہیں ان کا
 حوالہ دے سکتے ہیں اولاً یہ برابر فرض کیا جاتا ہے کہ انگلستان نوآبادیوں کو
 اولاد کے مانند تصور کر سکتا ہے لیکن میں استفادہ کی پیروی نہیں کرنا چاہئے
 اگرچہ ملک انگلستان کو ماں کا درجہ بھی دیا جائے لیکن اس سے یہ خیال ظہور
 نہیں ہوتا کہ وہ کبھی اپنے اغراض کی تمیز کھو ہی نہیں سکتا اب ہم نہ تو بداند

اور نہ مادہ نہ حکومت میں بستے ہیں ہاں۔ واقعی خیال پیدا ہوتا ہے کہ اولاد کو بھی اپنی جان کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں والدین بھی ناقابل ہو کر تے ہیں مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ کناڈا کو انگلستان کی مرضی کے خلاف اس کی بہتری کے لئے اس کی سر زمین پر حکومت کرنا پڑے گی لیکن اگر کناڈا ایسا کرے تو اسی طرح بیجا ہوگا جس طرح بخلاف اس کے انگلستان والے اہل کناڈا کی مرضی کے خلاف بھی کناڈا کے اصلی اغراض کی نگہداشت کرتے ہیں۔ جو کانفرنسیں ۱۸۸۷ء اور ۱۹۰۳ء میں منعقد ہوئی تھیں ان سے صاف طور پر اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ بڑی بڑی نوآبادیوں کو بھی جو خود اختیاری حکومت کی نعمت سے مالا مال ہیں انگلستان کے ساتھ اپنی سیاسی ہم پائی کا احساس ہونے لگا ہے لارڈ رائٹس نے واقعیت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ نوآبادیوں کے دل میں ایک شک پیدا ہو گیا ہے کہ انگلستان والے خود کو ان کا مربی تصور کرتے ہیں لیکن یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض نوآبادیاں اولاد کے مانند تصور کی جاسکتی ہیں وہ نئی نئی نوآباد ہوئی ہیں اور اگر عہدہ انتظام حکومت کے لئے نہیں تو ضروریات کی بھر سانی کے لئے قدیم ملک کی محتاج ہیں اس میں شک نہیں کہ ہر ایک جمہور جو یکایک پیدا ہو گیا فوراً ہی سیاسی طور پر قدیم یورپ کے مساوی سمجھ لیا جائے اگر ایسا ہو تو تارکان وطن کا ہر ایک گروہ جو وقتاً فوقتاً قائم ہو جائے بہت جلد ایسی سیاسی طاقت حاصل کر سکتا ہے جو انہیں سے کسی ایک کو بھی وطن میں رہ کر نصیب نہیں ہو سکتی تھی جس جماعت کو ہم نوآبادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ ایسی ہے جو سالہا سال سے ایک ہی جاہلیت

پذیر ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ کتنی مدت تک مستقل قیام کرنے کے بعد ایک فرقہ جدا گنا ہو سکتا ہے اس کا فیصلہ ارباب حل و عقد کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے کوئی عام قاعدہ نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ یہ سوال صرف زور و طاقت اور ایسی تمہینات کا ہے جو آزمائش اور ارتکاب غلطی کے ذریعہ سے کی گئی ہو اور اگر گروہ مستقل رہا ہے تو اس میں اور بھی امتیازی خصوصیات کی موجودگی لازمی ہے مثلاً خود کو اس بات کا احساس ہونا کہ وہ ایک جمہور ہے اور جداگانہ پیچیدہ اور متحدہ اخراجات رکھتا ہے۔ مثلاً نیا جن قوموں کو ہم تابع کہتے ہیں وہ تاریخی واقعات اور عام طور پر جنگ و جدل کے ذریعہ سے قائم ہوئی ہیں۔ جنگ و جدل سے کسی طرح نزاعی گروہوں کی سیاسی و اقتصادی کبھی نہیں ثابت ہوتی ہے لیکن اس صورت حالات کی خواہ کچھ بھی ابتدا میں بددلتان یا مصر ایسے ممالک یا جرمنی کے محکوم ملک کیمرول اور فرانس کے محکوم ملک البجیریا میں ہوئی ہو مگر یہ کیفیت ایک ایسا سیاسی واقعہ ہے جس پر غور کرنے سے ہم پہلوتی نہیں کر سکتے ہم اس کے متعلق کیا کہنے کے لئے تیار ہیں۔

اس معاملہ میں بھی وفاق یعنی گروہوں کے سیاسی مساوات میں کوئی امر مانع نہیں ہوتا بشرطیکہ صاف طور پر مستقل اور خود آگاہ ہوں اور خاص دلچسپی رکھتے ہوں۔

مندرجہ بالا خیال انتہائی انگریزی طرز کی شہنشاہیت سے صاف طور پر غلط ہے جیسا کہ لارڈ کرورن نے تسلیم کیا ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ”ایک انگریز ہمیشہ دو معیاروں کی تحصیل کے لئے جدوجہد کرتا ہے یہ معیار ایک، دوسرے کو پامال کرتے ہیں ایک نصب العین تو عمدہ حکومت کا ہے جس کا

مطلب یہ ہے کہ اپنے عظمت اور اقتدار کا ہمیشہ جاری رہنا اور دوسرا معیار ہے حکومت خود اختیاری جس کا منشا یہ کہ اپنی اعلیٰ ترین منزلت سے جزوی طور پر کنارہ کشی ہونا۔ موصوف کو معلوم ہے کہ اس کا دار و مدار دو چیزوں پر ہونا چاہئے ایک عظیم سپاہ نہ قوت دوسرے اصول قومیت بہت کم انگریز ایسے ہیں جو ایسی سلطنت قائم کرنے کے لئے راضی ہوں گے جس کا احصار سرسبز جنگی طاقت پر ہو اس لئے یہاں خواہ مخواہ مقامی حکومت خود اختیاری کو صعود دینا ہو گا جس کا بالآخر مدعا یہ ہے کہ سیاسی طور پر مساوی جماعتوں کا ایک وفاق قائم ہو گیا جن جن ملکوں میں ابھی ایسے نظام کے ارکان موجود نہیں ہیں جو وفاق پر قائم ہے۔ وہاں اس کے متعلق تصفیہ کرنے میں بری دشوری پیش آئے گی مثال کے طور پر ہم ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کا ذکر کیاں نہیں کر سکتے یعنی یہ کہ ہندوستان بھی ایک ایسا قطعہ ہو سکتا ہے جس کو انگلستان کے ساتھ ایک تعلق محض ہے۔ اگر یورپ ایک واحد بر اعظم ہے تو ہندوستان بھی ہے ہندوستان میں ایک عام جذبہ کو ترقی ہو رہی ہے۔ مگر ایک ایسی حکومت خود اختیاری کا وجود بالکل ناممکن ہے جس کا دار و مدار ایک بر اعظم کے تمام باشندوں کے اغراض کے مطابقت پر ہو مگر اس میں شک نہیں کہ مقصد مجوزہ یہ ہو گا کہ ہندوستان کے مختلف حصص میں حکومت خود اختیاری قائم ہو حالانکہ اس کی تکمیل کے لئے ایک مدت مدید درکار ہے اور اس کا منشا یہ ہو گا کہ انگلستان کے ساتھ اتفاق قائم رکھنے کے متعلق تصفیہ کرنے میں مساوی حقوق حاصل ہوں۔ وفاق کے متعلق اس قدر انتہائی تخیل کی قدرتا وہ لوگ مخالفت کرتے ہیں جو لارڈ کرمر کی

طرح ابھی تک نحر و ناز سے ”ہمارے ہندوستانی مقبوضات“ کا فقرہ زباں پر لاتے رہے ہیں حالانکہ شہنشاہیت کی حد میں زیادتجاوز کرنے والے استعصاں کے بیانات میں یہ صاف طور پر ظاہر نہیں ہے کہ ”ہم“ کون چیز ہے اور ہم کس طرح ”سلطنت“ کے قبضہ دار ہو سکتے ہیں۔ سبلی کا خیال ہے کہ اس کی تہ میں ایک ایسی حکومت کا خیال مضمر ہے جو ہمارے فالمدے کے لئے قائم کی جائے اور وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تصور جہالت آمیز اور بعید از اخلاق ہے۔ تا قابلانہ اور خلاف منطق خیال آرائی کے لئے مصالحت ہمیشہ ایک عذر سیاسی رہیگا لیکن اس میں وقت سے بچنے کا کوئی ایسا طریقہ نہیں جس کا نہ تو یہ نشانہ ہو کہ انگلستان اور ان محکوم قوموں کے باہمی تعلقات کامل طور پر متحرک ہو جائیں اور نہ جس سے یہ مراد ہو کہ جو قومیں موجودہ سلطنت میں شامل ہیں ان کو جلد یا بدیر سیاسی مساوات کے حلقہ میں داخل کر لیا جائے۔

لیکن ایسی حالت میں ہم کیا کہیں گے۔ جب جماعتیں نہ تو مستقل ہوں نہ خود آگاہ اور نہ جن کے اغراض جدا گانہ ہوں۔ جنوبی افریقہ کی زولو قوم کے متعلق یہ ہرگز نہیں تصور کیا جاسکتا کہ ان میں سیاسی بیداری یا قطعی اور جدا گانہ سیاسی ارمان موجود ہیں ایسا فرض کر لینا زولو قوم کی حالت کا غلط اندازہ کرنے کے برابر ہے کیونکہ ان کی حالت کا انجمنہ کرنا ایک مشکل کام ہے ان کا ذکر محض تمغیلاً کر دیا گیا ہے اور اگر وہ حیثیت ایک گروہ کے خلاف قیاس زیادہ سدا میں تو ناظرین کو خود ہی کوئی اور غیر تربیت یافتہ قوم تلاش کرنا چاہئے۔ زولو قوم والوں کے متعلق یہ فرض کرنا واجب معلوم ہوتا ہے کہ

وہ خود اپنی مرضی سے اطاعت قبول کریں گے بشرطیکہ واقعی ان میں ان باتوں کی کمی ہے جو ان سیاسی جھڑپوں کے لئے لازمی تصور کیجاتی ہیں جو کسی سلطنت رفاقیہ میں شامل ہوتی ہیں۔ بہر حال ان کا محکوم ہونا خود ان کے حق میں مفید سمجھنا چاہئے اس موضوع کی انتہا ہی نہیں اور اس میں انگلستان، فرانس، جرمنی اور ریاستہائے متحدہ کے فوری نتائج بھی شامل ہیں۔ یہ مرکب سلطنتیں موجود ہیں اور ہم دیکھا سکتے ہیں کہ اگر خطرات محولہ بالا کو دور کرنے کی صورت پیدا کی جائے تو وہ ترقی کے حق میں سراسر ضرر رسان نہیں ہیں۔ اگر شہنشاہیت کا ارتقاء منسلک ہے تو اس کے ادبیت کے مابین موافقت ہو جانا چاہئے اور اس ملا بقت کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ دفاق ہے ورنہ یہ ایک ناممکن شے ہے۔

دسوان باب

انفرادیت

موجودہ معاشرتی مسئلہ



جماعتوں کا باہمی تعلق جس پر ابھی ہم نے ”قومیت اور شہنشاہیت کے زیر عنوان بحث کی ہے۔ سیاسیات موجودہ کے دو نہایت ضروری مسکوں میں سے ایک ہم سے بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ جن افراد سے مل کر یہ بنے ہوئے ہیں ان کے تعلقات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ضمنی طور پر یہ دکھایا جاسکتا ہے کہ بین الاقوامی حکمت عملی یا ملکی نظم و نسق کا کام نہایت آسان ہو سکتا ہے بشرطیکہ تمام افراد کے باہمی روابط سرسبز یا خوشگوار ہوں۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ہمارا

یہ نشانہاں کہ ہم ان تعلقات کو سراسر ناقص سمجھتے ہیں اور نہ ہم ان نقائص کی تفصیل
 درج کرنا چاہتے ہیں جو فی الواقع ان میں موجود ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی معیار کی ابتدائی
 ضرورت کا احساس کے بغیر اس کا اعتراف نہیں کیا جاسکتا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو
 شخص اپنی یا اپنے ساتھیوں کی زندگی سے بالکل مطمئن ہے اس کے ذہن میں وہ بات جو وہ
 ہی نہیں ہے جس سے معاشرتی بد امنی واقع ہو رہی ہے لیکن مطمئن اشخاص کو سمجھنا نا اہل
 از حد مشکل کام ہے کیونکہ اگر انھوں نے راونٹری کی تصنیف (افلاس) اور مسٹر
 گیلیسوی کے نامک نہیں پڑے ہیں یا خود اپنی آنکھوں سے نقائص پر نظر نہیں ڈالی ہے
 تو وہ قدیم تاریخ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اگر وہ واقعات دیکھنے اور سننے کے بعد بھی دم جمی
 رکھتے ہیں تو سب سے عقل کی ان تک رسائی نہیں ہو سکتی وہ ایسے لوگ ہیں جن کو اہل
 یونان مجبوط العقل کہتے ہیں جن کو صرف ذاتی عیش و آرام یا مصائب سے شرکار
 رہتا ہے۔ جن نقائص کی وجہ سے انفرادیت یا اشتراکیت کا ظہور ہوتا ہے انکا
 مذکورہ نام لگن ہے۔ یہ کافی طور پر سب کو معلوم ہے کہ مہذب اقوام میں نصف افراد بھی
 آرام سے زندگی نہیں بسر کر سکتے۔ تمام انسانی طاقتوں کے ارتقار کا تو ذکر ہی کیا ہے
 موجودہ وسیلے اور عظیم اشران نظام حکومت سے نصف آبادی کو ایسے ضروری ضروری
 فوائد بھی نہیں نصیب ہوتے جن کے بغیر انسان کا کام نہیں چل سکتا اس کا صریح نتیجہ
 یہ ہے کہ انفرادیت کے حامی یہ مطالبہ کریں گے کہ افراد کو مساوی مواقع حاصل
 ہونا چاہئیں اور اشتراکیت کے حامی کہیں گے کہ حکومت کو اپنے نظام کی اس طرح
 توسیع کرنا چاہئے جس سے مہتمل جماعت کے علاوہ دیگر اشخاص کو بھی فائدہ پہنچو
 واقعات انفرادیت اور اشتراکیت دونوں چیزوں کے حامیوں کیلئے

یکساں ہیں اور ان دونوں میں سے ہر ایک کا معیار بیان کرنے کے قبل ہم ان کے متعلق کچھ تفصلاً ذکر کریں گے۔

بالفاظ اقتصادیات ہر ایک یورپی قوم کی نصف آمدنی کل آبادی کے ہر حصے کے کام میں لائی جاتی ہے یہ صحیح ہے کہ تفصیلی معلومات کے بغیر اس قسم کے بیان دیدنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن ان کی شہادت کسی دوسرے مقام پر مل جائے گی۔ انگلستان کے معاملہ میں جو اعداد شمار یہ سٹر چیورامنی کی تصنیف دولت و اخلاص میں درج ہیں مخالفین نے ان کے متعلق کوئی اہم اعتراض نہیں کیا ہے بہر حال یہ کتاب اس لحاظ سے نہیں مکدودہ مستند ہے بلکہ اس خیال سے قائل قدر ہے کہ اس سے وہ پہلو نمایاں ہوتا ہے جس میں لوگ آجکل حوائج سیاسی کی نوبت دریافت کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انگلستان میں نقشہ جات آمدنی کے مطابق ۵۵ لاکھ آدمی نوے کروڑ نو لاکھ اور باقی تین کروڑ نوے لاکھ آدمی ۳ کروڑ چار لاکھ نوڈ پاتے ہیں۔ اس کا منشا یہ ہے کہ آمدنی اس قدر بے تکلف پن سے تقسیم ہے کہ تقریباً نصف آبادی کو نصف قومی آمدنی مل جاتی ہے اور اس بے ڈھنگی تقسیم سے جماعت کے موجودہ نظام میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر اعداد مذکورہ مبالغہ آلود بھی ہوں اور ہر ملک میں باشندوں کی تعداد کثیر کو حالت موجودہ سے جذبات زندگی بسر کرنے کا کافی موقع حاصل بھی ہو تو معاشی صورت حالات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ انیسویں صدی کے قبل اور کبھی اس پر غور نہیں کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بحث نہیں کی جاتی کہ ہر شخص کو یکساں حصہ آمدنی ملنا چاہئے اور نہ یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ

آمدنی میں یہ تصرفات نقصان دہ ہیں لیکن اگر یہ اس قدر خراب تقسیم روز بروز بڑھتی جاتی ہے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ایسے نقائص سے ہے جو اصولی ہیں۔ آمدنی کی قلت ہے ماسندوں کی پرورش اچھی نہیں ہوتی اور اس کا اثر آئندہ نسل پر پڑتا ہے۔

مسٹر رائٹ نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایک مزدور مفلس ہے (ایسے افلاس کا نام افلاس نمانوی رکھا گیا ہے جس میں جسمانی طاقت کے برقرار رکھنے کیلئے آمدنی ناکافی ہوتی ہو اگر اس کا کچھ حصہ دیگر مصارف میں خرچ ہو جائے) اس لئے وہ اولاً عالم طفولیت میں ہے جبکہ اس کا ڈھانچہ تیار ہو رہا ہے۔ دوسرے درمیان زندگی کی ابتدا اور سویم اضعیف العمر کی اچھی طرح کھانے کو نہیں ملتا۔ عورتیں اس زمانہ کے زیادہ حصہ میں نادر رہتی ہیں جب ان کی اولاد پیدا ہوتی ہے کمزوری اور بے پن سے جو موتیں ہوتی ہیں ان کا اور قبل از وقت معینہ پیدائش کا خاص سبب زمانہ حمل میں ماں کی ناقص پرورش ہوتی ہے اور وہ عام طور پر رات دن ناقص حالات میں سرگردان رہتی ہے گھمان غالب ہے کہ ہر سال بارہ لاکھ بچوں کی پیدائش میں تین لاکھ بچے مفلس خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں اس لئے ہم اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ہر سال یہ تین لاکھ بچے اپنی پیدائش کے قبل اور بعد دونوں حالتوں میں فاقہ کا شکار ہوں۔ ان اقتصادی واقعات کے باوجود جو اثر براہ راست پڑتے ہیں ان کے متعلق بہت کچھ کہا جاسکتا ہے اور اب تک کہا جا چکا ہے۔ یہاں یہ بھی کہہ دینا چاہئے کہ یونان کی بت تراشی۔ روم کے قانون اور قرون وسطیٰ کے فن تعمیر یا دورا حیار کے علم و ادب کے بالمقابل اپنی ایجادوں کے نقائص پر فوس

کرنا محض ایک لغو بات ہے جب کہ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے یہ دیکھ رہے ہیں کہ
 ہمارے راستے میں ہماری ناقابلیت ایک بہت بڑی دیوار ہے جو نہ تو پیدا ہوتی ہے
 اور نہ دماغی طاقت یا خوبیوں کی کمی کے سبب سے ہے بلکہ جس کی وجہ محض جزوی
 فاقہ کشی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم مادی ضروریات کے دباؤ میں غرق ہیں
 اور لطیف اغراض طاق نسیان پر رکھ دیں بلکہ ہمیں وہاں سے چلنا چاہئے جہاں
 نقطہ آغاز ہے جب تک ہماری قوم کے زیادہ حصے کو انسانی زندگی کے خاص
 خاص ضروریات مہیا نہ ہوں گے اس وقت تک ہم کو ایک زیادہ ارفع اور اعلیٰ
 تہذیب کی توقع نہیں ہو سکتی۔

انفرادیت کا نصب العین اور غیر معمولی قابلیت

ہمارے سامنے دو عظیم الشان معیار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی
 زندگی کس طرح بسر ہونا چاہئے اور اس کے متعلق ہمارے تصورات کیا ہیں ان میں
 ایک انفرادیت ہے۔ بہتر ہے کہ ہم شروع میں اس نصب العین کے مدعا پر روشنی
 ڈالیں۔ اشتراکیت سے انفرادیت کا مسلک ان معنوں میں متفرق و مختلف ہے
 کہ نہ مافی الذکر میں بطور خاص ہر فرد کے کامل ارتقار پر علحدہ علحدہ بحث ہوتی ہے
 اس کے علاوہ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ انفرادیت کے بارے میں پہلے کونسے
 واضح بیانات دیئے گئے ہیں بعدہ ان باتوں پر نکتہ چینی کی جائے گی جو اس معیار
 کی خامیاں معلوم ہوتی ہیں دنیا میں کوئی شخص بھی جس میں زراستی سوچنے کی صلاحیت ہو ایسا نہیں

جو یہ نہ مانتا ہو کہ قابلیت کی مکمل ترقی کے مواقع کثیر تعداد اشخاص کے حق میں بہت محدود ہوتے ہیں لیکن ہر شخص یا تو سٹرک بنانے یا شاعری کرنے کی کچھ نہ کچھ قابلیت پختہ ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ شاید بہت تھوڑے آدمی ایسے ہیں جو اس کو ترقی دے سکتے ہیں ممکن ہے یہ امر صحیح نہ ہو مگر کم از کم ایسا معلوم ہوتا ہے اسی وجہ سے ایسے اشخاص کی کثرت پر جن کو ترقی کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ لگا ہے ماہے جو ذہانت پیدا ہو جاتی ہے اس کے ساتھ نیک اطوار کی طاقت کے لحاظ سے غریب انسان وہ کام کرنے لگے گا جس کو وہ سمجھتا ہے کہ میں بہت اچھی طرح انجام دے سکتا ہوں لیکن خوراک اور پوشش کی ناگزیر ضروریات کی وجہ سے ایک کثیر تعداد محض ایک خیالی اور سلاخ کے بے زبان آدمی کی تقلید کرنے لگتی ہے اس طرح جس قدر ہم آگے بڑھتے ہیں اسی قدر فردیت کی عمومیت کم ہو جاتی ہے انفرادیت پسندوں کو اس وقت ترقی کے وجود میں شک ہو سکتا ہے جب سب خود ہی مفقود الوجود ہوتے جاتے ہیں۔ ہر حال یہاں سوال اپنے ہمسایوں کے محدود حالات کے ہمدردانہ احساس کا نہیں ہے کیونکہ ہر شخص یہ دلیل پیش کر سکتا ہے کہ معاشرت کی موجودہ صورت میں بہت کم ایسے اشخاص ہیں جو اپنی قابلیت کو ترقی دے سکتے ہیں۔

پہلے پہل نظر ڈالنے سے یہ ایک مبالغہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ متعدد اشخاص ایسے ہیں جن کے پاس دولت اور آزادی کی نعمتیں موجود ہیں اور جنہیں تقدیر آزمائی کا موقع بھی حاصل ہے۔ البتہ اس امر پر زور دیا جاسکتا ہے کہ کم از کم یہ لوگ اپنی لیاقت کو مدد جہ اتم فروغ دے سکتے ہیں۔

۲۔ جمل شخص کم سے کم عمومیت کا زبانی طور پر مداح ضرور ہے اس لئے

میں معاشرتی نظام کے تقاضوں کی وجہ سے اس بنا پر ثابت کرنا ایک خطرناک کام ہے کہ اس تنظیم کے بدولت کسی نہ کسی صورت سے چند آدمی ضرور ذہنی ترقی کر سکتے ہیں ٹیٹشے کے پیروؤں نے بھی اس کا تجربہ کیا ہے ان کثیر العدد اشخاص کی ہستی جن میں میرے خیال کے مطابق اپنے اوقات میں ترقی نہ ہونے والے تمام ایسے اشخاص شامل ہیں محض خوش درد سبک ہوا دریلے جسم کے چوبالوں کیلئے ہوتی ہیں جو فوق الانسان ہیں۔ اگر ٹیٹشے کے معیار کا صرف یہ مطلب ہے کہ جس قسم کے انسان کو ہم آج بہتر سمجھتے ہیں اس کی حالت زیادہ بہتر ہونا چاہئے اور غالباً وہ بہتر ہو بھی جائے گی علاوہ بریں اگر اس کا نشانہ یہ ہے کہ ترقی کی ابتداء کبھی تمام طبقہ انسانی میں نہیں بلکہ ایک چھوٹے سے گروہ میں ہوتی ہے تو مبالغہ آرائی کے باوجود اس کو مناسب قسم کی انفرادیت تصور کرنے میں نہیں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ انسان ایک صراط کے مانند ہے وہ خود متزلز مقصود نہیں زمانہ آئندہ میں ممکن ہے کہ کوئی ایسی نسل پیدا ہو جائے جو ہم سے اسی حد تک فائق ہو جس طرح ہم اپنے خیال کے مطابق ان لنگوروں سے ہزار درجہ افضل و برتر ہیں جن کی نسل انسانوں سے ملتی جلتی ہے یہ صحیح بھی ہے کہ پہلے ترقی ہمیشہ وہی قلیل گروہ کرتا ہے جو جماعت میں پہلے ابھرتا ہے۔

علم طبیعیات۔ دشکاری اور روزانہ زندگی کے سامان کے استعمال میں چند آدمی کچھ تحقیقات کرتے ہیں اور ان چیزوں کو کام میں لاتے ہیں جو بعد تمام کی ملکیت بن جاتی ہیں۔

اس لئے انفرادیت اس بات میں اصرار کرنے میں بالکل حق بجانب ہے کہ

غیر معمولی قابلیت کو بھی اپنے اظہار کا موقع ملنا چاہئے محض اس بات پر خیر ہو
 آگے نہ بڑھنے دینا کہ زیادہ آدمی ان کی ہمدردی نہیں کر سکتے ایک ایسا طرز عمل
 ہے جس سے زیادہ آدمیوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے اس بات کا امکان
 خیالی یا غیر حقیقی نہیں ہے کیونکہ مثلاً ایک ایوان تجارت میں ایک قابل اور
 لائق شخص کو محض اس بنا پر ترقی کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا کہ اس کے پیار
 کی استعداد نہ رکھنے والے انتخاب کاروباری جدوجہد کے میدان سے نکال دے
 جائیں گے ہمیں یہاں اس سے سروکار نہیں کہ انتخاب کی کثیر تعداد کو ان
 باتوں پر غور کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے یا نہیں جن سے ان کو فائدہ پہنچتا
 یہ تو بعد کا سوال ہے بہر حال یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر ایسے انتخاب جنہیں
 کوئی خاص لیاقت ہے اور جن کو خدا تعالیٰ نے ایسے صفات عطا فرمائے
 ہیں جو شخص کے حصے میں نہیں آتے ہمیشہ اوسط کے لوگوں کی صف میں گرا کر
 رکھے جائیں گے تو کوئی معاشرہ ہرگز جادہ ترقی میں قدمزن نہیں ہو سکتا تینا
 نا قابلیت کی وبا اس قدر عالمگیر ہو گئی ہے کہ ہم کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ
 پختہ غیر معمولی اصحاب کے ارتقاء کے کمال سے تمام جماعت کو جو فائدہ پہنچ
 سکتا ہے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ اظہار خیالات ضرور ہونا چاہئے یہ کوئی
 نہیں کہتا کہ جو افراد کمزور ہیں وہ غیر محفوظ رہیں یہ امر جدا ہے مگر استعداد کا
 خون کر کے نا اہلیت کی دیدہ و دانستہ حمایت کرنا دوسری بات ہے جن لوگوں میں
 دماغی قوت کافی نہیں ہوتی ان کے لئے تو ترقی کی خاص گنجائش نہیں ہوتی مگر
 جن کو فضل الہی سے غیر معمولی قابلیت حاصل ہے ان کے واسطے بہت کم سہولتیں

جیسا میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ اپنی دیکھ بھال خود کر سکتے ہیں شاید انفرادیت انتہائی اس بات کی بھی دعوے دار ہو کہ ان لوگوں میں خبرداری کی صلاحیت موجود ہوتی ہو لیکن بد قسمتی سے ان کو ذاتی خبرگیری کا موقع نہیں دیا جاتا۔ حالات ان کو ذمہ داری میں کرسی توڑنے یا کانوں میں کوئلہ کھودنے پر مجبور کر دیتے ہیں حالانکہ ان کی ذات سے طبیعیات اور ہنر کو ترقی ہو سکتی تھی۔ یہ بھی سبب نہیں ہے کہ ایک بچے کو وسیع پیمانہ پر تنظیم یافتہ معاشرے میں ڈال دیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ بچہ اس قدر آزاد ہے کہ وہ اپنی بہترین صفتوں کو تصرف میں لاسکتا ہے۔ اس طرح پر انفرادیت ایک نصب العین ہے اس میں معاشرت کی موجودہ بناوٹ کا محض خوش کن خیال ہی نہیں رکھا جاتا ہے بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہونا چاہئے جس سے ہر شہری کو اپنے ارتقاء کے کامل کا زیادہ موقع حاصل ہو۔ اول تو اس میں اس امر کی حمایت کی جاتی ہے تمام قوم کی بہبود کو مد نظر رکھ کر غیر معمولی قابلیت رکھنے والے اشخاص کا خاص طور پر خیال کیا جانا چاہئے یہ بات زمانہ موجود کے اس رجحان طبع کے مخالف ہے کہ ہر شخص کو اوسط درجہ میں شامل اور جڑ کر لیا جائے یہ خیال زور پکڑ رہا ہے کہ ایک ہی قسم کی پوشاک کا زیب تن کیا جانا اس بات کی علامت ہے کہ ہم اب ایک ہی طریقہ سے سوچنے اور کام کرنے لگے ہیں۔ اگر جمہوریت امارت خاندانی یا امارت اہل دولت کی ضد بھی ہے پھر بھی اس اشتراکیہ کے مخالف نہیں ہے جس میں ذہنی استعداد کو تفوق دیا جاتا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ پوری قوم کی ترقی واقعی اس کے غیر معمولی
 اشخاص کے ارتقار میں مضمر ہوتی ہے گویا چند آدمیوں کی حد تک بھی جماعت
 کی موجودہ ساخت اس بات کی متقاضی معلوم ہوتی ہے کہ افراد کا جداگانہ طور
 پر نشو و نما ہو سکے۔ دولت یا پیدائش کے بدولت جو چند اشخاص اپنا ارتقار
 خود کر سکتے ہیں وہ ان لوگوں کا ایک خفیف ہی جزو ہیں جو پیدائشی طور پر غیر معمولی
 دل و دماغ سے معمور ہوا کرتے ہیں۔

انفرادیت اور زبردست خلاف کمزور مطالبہ

اگر زیادہ وسیع النظری سے کام لیا جائے تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ
 جس معاشرے میں زیادہ اشخاص اپنی حقیقی قابلیتوں کا ارتقار نہیں کر سکتے ہیں
 زیادہ پر اثر طریقہ سے کسی شخص کا ذاتی صعود نہیں ہو سکتا۔ ایک حقیقت بعد اللہ
 عقل ہی نہیں ہے کیونکہ جن لوگوں کی نسبت بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے
 لئے بہ لحاظ دولت و ثروت ذاتی ترقی کا ہر طرح موقع موجود ہے دراصل انھیں کو
 رکاوٹیں درپیش ہوتی ہیں جن لوگوں کو اس قسم کے یا تو کم ذرائع نصیب ہیں
 بالکل ہی نہیں۔ ان کے ساتھ قریبی تعلق ہونے کی وجہ سے دولت مند اور بہت
 اشخاص کے ترقی کے راستے میں روڑے اٹھتے ہیں اگر یہ تعلقات منقطع کر دیے
 جائیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی ترقی کے نصف مواقع سے بھی ہاتھ دھو
 رہے ہیں۔ ایک انسان کی تربیت کے لئے دوسروں کے ساتھ معاشرتی تعلقات

کا قیام رکھنا ہی اصل بنیاد ہے۔ ایک شخص کی ترقی کا انحصار ان تمام دیگر اشخاص کی ترقی سے وابستہ ہے جن کے ساتھ اس کی نشست و برخاست رہتی ہے لہذا اس معاشرے کو جماعت کہنا جیسے تھوڑے اشخاص ترقی یافتہ ہوں بالکل متضاد خیال ہوگا محض معدودے چند اشخاص کی تھوڑی سی ترقی پورے گروہ میں سرایت کر جائے گی اور اس سے تمام دیگر افراد کے ارتقار میں ہرج واقع ہوگا ایک گروہ کے قلیل استعداد سے دوسری جماعت متاثر ہوگی۔ اس طرح ایک ذرا سے نقص کے بدولت تمام شمل کو خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ تاویک ای نظمیں حوالہ قلم نہ کی جائیں۔ ہمارا یہ بیان اکثر اشخاص کو تو ہم خیر معلوم ہو گا۔

ہمیں دیکھنا چاہئے کہ مہذب انسانوں کی فیصد ہی ایک بڑی تعداد کی خورش اور پوشش کی کفالت سے محروم رہنے کا کیا اثر پڑتا ہے انھیں آئے دن کوئی نہ کوئی بیماری ستاتی رہتی ہے یا قبل از وقت داعی اجل کو لبیک کہنا پڑتا ہے ان کے بچوں کی اور بھی درگت ہوتی ہے۔ ویشوکی غیر مہذبانہ ضروریات تو ان کے پاس پیشتر سے موجود ہوتی ہیں اور ایسی چیزیں فراہم کرنے کے لئے نہ ان کو وقت اور نہ موقع ملتا ہے جنہیں ہم مہذبانہ اغراض قرار دیتے ہیں۔ جسمانی کمزوری کے سبب سے ان کا کام فائدہ بخش اور عمدہ نہیں ہوتا خراب کام ہونی سے اس کو رہتی پر جس کی بسراوقات کے لئے نہایت افراط سے سامان خوراک و یونٹاک موجود ہے اور اس صنایع پر بھی اثر پڑتا ہے جو دنیا سے کنارہ کش ہو کر شب روز اپنی دہن میں مست

رہتا ہے اس طریقہ سے ان تھوڑے اشخاص کے ذرائع بھی محدود ہو جاتے ہیں جن کو ہر قسم کی آسائشیں حاصل ہوتی ہیں نیز غیر ترقی یافتہ لوگوں کے ساتھ متواتر نشست و برخاست کے تعلقات ہونے سے ذہن اور دانش مند اصحاب کے لئے یہ بھی ناگزیر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ارفع و بلند حیثیت چھوڑ کر نیچے آئیں کہ لوگ ان کے افعال و اقوال کو کچھ تو سمجھ سکیں۔ جب کچھ انسانوں کے گرد ہوں اور دوسرے غیر گرد ہوں کے درمیان مقابلہ کا سوال پیش ہوتا ہے اور ان میں ادنیٰ ترقی ساری و طاری ہوتی ہے تو ان کی ذہنی تربیت و حیثیوں سے زیادہ افضل نہیں ہونے پاتی۔ مراد کلام یہ ہے کہ جس مقابلہ کا وہ خیال کرتے ہیں وہ دشنام و طاقت یا ایسے سفلی غامض فریب کا ہوتا ہے جس سے ہمسایوں کو احمق بنانے نیز جھکے مینے کے لئے کام لیا جاتا ہے۔

اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ ترقی میں کئی روز بروز بڑھتی جاتی ہے تو معلوم ہو گا کہ یہاں ہمدردی کا کوئی سوال نہیں۔ ہم کو ایک زیادہ فطری یا حقیقی غم کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس کے علاج نہیں بلکہ اسناد کے لئے تدابیر اختیار کرنا چاہئے کیونکہ جو مرض نیکو کاری سے دور ہو سکتا ہے اس کے باعث پہلے ہی سے ہزاروں نئے نئے امراض پیدا ہو گئے ہیں۔ ان امراض میں نقص تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے کہ تمدنی زخموں کا اندمال ناممکن ہو گیا ہے لہذا جب تک ہم کو اس ادنیٰ ترقی کے اسناد کا ذریعہ دستیاب نہیں ہوتا اس وقت تک ہمارے موجودہ معاشرے کا ڈھانچہ جسم کے مانند موت کے نذر ہوتے ہوئے روز بروز برباد ہوتا رہے گا۔

انفرادیت کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ عموماً کے ہر رکن کو مکمل ترقی کے لئے کامل آزادی دستیاب ہو اس میں ہمارے زمانہ کا بہترین خیال موجود ہے۔ ممکن ہے کہ بظاہر یہ اشتراکیت کے خلاف معلوم ہوتا ہو مگر دونوں کا جو معیار ہے وہ ان معنوں میں یکساں ہے کہ دونوں تمام انسانوں کے مکمل ترین ارتقار کے طلب گار ہیں اپنے موجودہ وجود کے مطابق یہ ہے عام نصب العین انفرادیت کے سلسلے میں جس کا اشتراکیت سے مقابلہ کیا جاتا ہے اس کا منشار یہ ہے کہ ہماری رہبری کرنے والا تصور یہ ہونا چاہئے کہ زیادہ قابل آزاد اور مکمل طریق پر تعلیم یافتہ افراد بدائے جائیں۔ علاوہ بریں انفرادیت کا منشا حال کے محدود ترین اقسام میں بھی یہ ہے کہ ہر بالغ انسان خواہ وہ مرد ہو اور خواہ عورت اپنے اغراض کا فیصلہ کرنے والا خود ہی ہے۔ اگر وہ سمجھ بوجھ کر اپنی اپنی دلچسپیوں کی تکمیل کرے تو بطریق احسن سب کی فلاح و بہبود حاصل ہو سکتی ہے۔

انفرادیت کی تاریخ

دوسرے معیاروں کے بہ مقابلہ اس معیار کی تاریخ کسی قدر مختصر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حالانکہ ایک معنی میں اتھنز قدیم اور دور احیار کی تلقین ارتقا ذاتی میں یہ نصب العین شامل ہے مگر اس کو اپنی موجودہ صورت میں انیسویں صدی کے آغاز سے حاصل ہوئی ہے باوجودیکہ انقلاب فرانس کے قبل کی تمام

حکومتیں ناقابلِ ثبات ہو چکی تھیں مگر یہ پروردِ عقیدہ اس کے بعد بھی قائم رہا کہ دنیا کا مکمل حکمرانی قائم ہو سکتی ہے اس اعتقاد کی بنیاد ”حقوق انسانی“ پر رکھی گئی تھی جو عینیت ہی اس کے لئے مجسمہ ہے لیکن فلسفیوں کے توقعات کے برعکس صنعتی انقلاب ظہور پذیر ہو گیا جس کے سببے ازمنہ وسطی کی قومی تنظیم کے آخری آثار بھی پامال ہو گئے ایک طرف ریل و رسایل میں سہولت ہو گئی اور دوسری طرف اس کے اثر سے تجارتی مرکز وسعت پذیر ہونے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ کارخانے کے رواج کی بنیاد پڑ گئی جن میں بیشمار مرد و عورتیں اور بچے کھوں پر کام کرتے تھے اور جس کے سرمایہ کے وہ خود مالک نہ تھے

ہم اس تغیر زندگی کے مفصل حالات درج کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے جو جدید صنعتی دور کے بدولت واقع ہو گیا تھا۔ یہ کافی طور پر بظاہر ہے کہ نئی نئی ضرورتوں کا احساس ہوا تھا کیونکہ کثیر التعداد آدمیوں کی حالت میں ایک نئی صورت پیدا ہو گئی تھی اور ہر ایک ضرورت کی مخالفت ایک خود سر حکومتی روایت کے دباؤ سے ہوتی تھی۔

جماعت کی گہری ضرورتیں اس وقت تک واضح نہ تھیں۔ ترجیحی گروہوں کا ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو ہر انسان کی مکمل آزادی کو ہی ایک نئی بھاری ضرورت تصور کرتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان ماہران اقتصادیات کے لفظ ”فرز یا ایک انسان“ سے مراد مالک کارخانہ تھا جس کا یہ خیال تھا کہ قدیم روایات کا وہ حصہ بھی جو اس وقت باقی رہ گیا تھا اس کے لئے سہ راہ کا کام کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدم مداخلت کا اصول تسلیم ہو گیا جس میں

گزشتہ مملکت کی مسئلہ ناقابلیت ان قیود کا باعث قرار دی گئی تھی جو ساری حکومت کے لئے عاید کی گئی تھیں۔

مگر جس تصور کے زیر اثر عدم مداخلت کا اصول قائم ہوا تھا وہ کس طرح معقولیات سے بعید نہ تھا کسی کا کبھی یہ خیال نہ تھا کہ ہر شے کے ضابطہ سے اجتناب کیا جائے گا۔ یہ فرض کرنا یہ جانے ہو گا کہ قوم کا اصلی مفاد ایسی حالت میں حاصل ہو سکتا ہے جب ہر شخص اپنی یہودی کے لئے نہایت دانشمندی کے ساتھ جدوجہد کرے گا کم از کم یہ فرض کرنا اسی طرح بجا ہے جس طرح یہ خیال واجبات سے ہے کہ ہر شخص کے ذاتی منفعت کی تکمیل اس طرح بخوبی ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کے کاروبار کی رہنمائی کرے۔

مگر انتہا درجہ کے راسخ انجیل ماہران اقتصادیات نے قدرت پر بھروسہ کرنے کے اصول کو حد سے زیادہ بڑھا دیا۔ عموماً لوگ اس طفلانہ عقیدہ کو ماننے لگے تھے کہ دنیا میں وہی شخص زندہ رہ سکتا ہے جو قابل تر ہے یا جس کو قدرت نے منتخب کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ قدرتی امور کی پریشانی کو نہ لگے یہ اعتقاد اسی قدر طفلانہ تھا جس قدر زمانہ قدیم کا یہ عقیدہ تھا کہ ”خدا پر بھروسہ رکھو انسانوں سے کہا گیا کہ وہ معاملات قدرت میں دخل نہ دیں ان کو جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ جو نصب العین بننا ہر اس غیر قدرتی اور حیوانی جبلت کے سب سے اختیار کے لئے تھے وہ ایسے نہ تھے جنہیں کوئی مہذب انسان قبول کر سکتا تھا طبیعیات کے حکما کو بھی یہ تحقیق ہو گیا کہ قدرت دنیا میں جتنی چیزیں پیدا کرتی ہے وہ سب اخلاقی نقطہ خیال سے عمدہ نہ ہوں کاروبار فطرت اور

حیوانی طاقت یا حکمتِ ادنیٰ کے مسلک کی پیروی کے خلاف جو عموماً مخالفانہ کارروائی کی گئی وہ کسی قدر اس مشاہدہ کا نتیجہ اور کسی قدر اس کا سبب بھی تھی کہ جدید نظامِ صنعتی کی ہر بات احسن و عمدہ نہیں ہے اس میں نقص بھی موجود ہیں۔ لیکن ایسے جذبات پرستوں نے ممکن ہے کہ معاشرتی خرابیوں کے بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہو لیکن اس بات کی کافی شہادت موجود تھی کہ ”عدم مداخلت“ کے اصول سے تہذیب کو جلد ہی بہرِ رسانی سامانِ خوراک کی غرض سے وحشیانہ جدوجہد کی طرف جبت کرنا پڑے گی۔

قدرتِ خواہ اس شخص کو جو فہم و فراست کی دولت سے مالا مال ہے اس خیال سے ردی سمجھ کر اس سے کام نہ لے کہ وہ جسمانی طاقت کے لحاظ سے کمزور ہے لیکن کوئی انسان ایسے شخص کی بربادی کو خاموشی سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ تھی ان باتوں کی انتہائی صورت جو انیسویں صدی کے وسط میں واقع ہو رہی تھیں۔ اسی وجہ سے انفرادی افعال میں عدم مداخلت کے اصول پر ہر طرف سے مشتبہ نگاہیں پڑنے لگیں۔ مصلحانِ وقت بھی صنعت کی تنظیم کا مطالبہ کرنے لگے لیکن جب بعدہ انتہا درجہ کی عدم مداخلت کا مذہب مسترد بھی کر دیا گیا اور یہ معلوم ہو گیا تھا کہ تیار سی مال کے طریقوں کے لئے حکومت کی جانب سے کچھ قیود ضرور نافذ ہونا چاہئے پھر بھی سرکاری دستِ اندازی کو لوگ برابر مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے گویا بالفاظِ انفرادیت حکومتِ دیرہ اختیار کے مقابلہ میں اس کے حدود پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور بتلایا جاتا ہے کہ حکومتِ محکوموں کو ترقی کا موقع نہیں دیتی بلکہ ان کو اس سے

باز رکھتی ہے اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ حکومت کی عدم توجہ سے اس قدر زیادہ خطرہ نہیں ہے جتنا اس کی مداخلت سے ہوتا ہے۔ ایک انسان کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس کے فرائض کا ذکر کم کرتے ہیں مگر اس کے حقوق کے لئے زیادہ شور و غوغا مچاتے ہیں۔ زیادہ تر اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب افراد میں کسی قدر انقلاب فرائض کے تصورات موجود ہیں اس میں شک نہیں کہ اس معیار کا وجود اس وقت ہوا تھا جب جمہوری فطرت یا معاشرتی نفسیات کے درس کا شوق صفحہ ہستی پر نمودار نہیں ہوا تھا۔ انفرادیت میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے اس کے سبب سے لوگوں کے دل میں اس کے خلاف تقصبات پیدا ہونے لگے ہیں بل یاسیجک کی کتابوں میں اس کے متعلق جو مستند بیان درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر حالتوں میں متروک ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی اور معاشرتی مسائل پر اظہار خیالات کرنے والوں نے اکثر افراد کے مذہب کو خود ہی متروک قرار دیا ہے لیکن ہم یہ مان سکتے ہیں کہ ابدائی حایوں نے اس کے بارے میں جو بیانات شائع کئے ہیں ان میں بہت کچھ نقائص موجود تھے۔

تنقید کو فی الحال بالائے طاق رکھ کر ہم انفرادیت کے اس تصور کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جو ابھی تک با اثر ہے۔

یہاں آنا کہہ دینا غالباً بے محل نہ ہو گا کہ جو لوگ ہم سے پیشتر گزر چکے ہیں ان کی مخالفت سے زمانہ حال کے مصنفوں میں یہ عادت ہو گئی ہے کہ سیاسی افعال و خیالات میں انفرادی ہستی کی قدر و قیمت کو وہ خود بھی گھٹا کر

بیان کرتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ کسی فرد کا وجود ایک جزو لا یتجزا نہیں ہے
یعنی کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اپنے ہجسوں سے بالکل علیحدہ ہو اور نہ ”فرد
مطلق“ کی ہستی تجریدی ہے لیکن خود مل کو یہ معلوم تھا برخلاف اس کے کہنا
ایک خطرناک بات ہے کہ ایک فرد انسان کا مقابلہ اگر مجمع یا مملکت یا جماعت
کی روح سے کیا جائے تو اول الذکر کی ہستی برعکس میں باطل اور بے اثر ثابت
ہوتی ہے ایک منفرد کی اتنی ایک اصولی حقیقت ہے جو کچھ معنوں میں دوسرے
انسانوں سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے حکومت افراد کی ایک جماعت ہے جس کا
وجود افراد کی طرح اصلی تو ضرور ہے لیکن کسی طرح پر اس سے زیادہ حقیقی نہیں ہے
شروع شروع میں یہ سب باتیں بتا دینے کے بعد اب ہم انفرادیت کے
ادبیات پر غور کریں گے اگر ہم یہ تصور کریں کہ اس کی خاص نظریں انگریزی
زبان میں پائی جائیں گی تو اس سے یہ نہ اخذ کرنا چاہئے کہ ہم ملک پرستی سے
کام لیتے ہیں جس طرح انقلابی علم و ادب فرانسیسی قومیت کا مذہب اطالوی
اور اشتراکی مسلک جرمانی اختراع ہے اسی طرح انگریزی زبان میں سب سے
پہلے انفرادیت کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اسپنسر، مل اور
سیجک ان تینوں میں سے ہر ایک نے مغربی تہذیب کے سیاسی معیاروں
میں کوئی نہ کوئی نئے ایسی ضرورت پیش کی ہے جس کو عالمگیر اہمیت حاصل

ادبیات انفرادیت

ہربرٹ اسپنسر

انفرادیت پر اسپنسر نے اپنے خیالات کا نہایت زبردست اظہار

ایک مضمون بعنوان ”مخصوص نظم و نسق“ میں کیا ہے جو ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا تھا یہ مضمون پہلے کے ایک اعتراض کا جواب ہے کہ اگر تمام سمات جسمانی اپنے اپنے مفاد کی تکمیل کے لئے علیحدہ علیحدہ آزاد کر دیئے جائیں تو جسم کی سادہ ساخت خاک میں مل جائے گی۔ اسپنسر نے جواب دیا ہے کہ میں طوائف اہلوی کا حامی نہیں ہوں بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ حکومت کا فعل اپنے خاص حدود کے اندر جائز ہی نہیں ہے بلکہ ہر طرح ضروری ہے۔ جو منادات باہم دیگر مخالف واقع ہوئے ہیں، مملکت کا فرض ہے کہ ان میں تغلب کی روک تھام کرے تو ان کا یوم کرے کہلے نے جو استعارہ استعمال کیا ہے اس میں یہ نہیں دکھایا گیا ہے کہ جداگانہ مسائل کا مفاد کسی طرح تمام مسائل کے عام مفاد کے خلاف ہوتا ہے بلکہ اس میں اس کے برعکس حالت بتلائی گئی ہے۔ تاریخی مثالوں سے یہ ظاہر ہے کہ جو ضوابط مملکت کی طرف مراجع ہوئے ہیں ان کی وجہ سے جنگوں اور صنعتی کاروبار کو ترقی نہیں ہوئی، اسپنسر کا یہ کہنا درست ہے کہ انفرادیت کے مخالفوں نے اس کے قدرتی اثرات یعنی باہمی ہمدردی یا اس خیال کی تعریف نہیں کی ہے کہ جو بات جماعت میں ایک شخص کے لئے مفید ہے اس سے سب کو یکساں طور پر فائدہ پہنچ سکتا ہے اس سے بھی دول کی مداخلت کے بغیر ہی خود غرضی کا دائرہ فطرتاً محدود ہو جاتا مگر حکومت کی ضرورت اس لئے ناگزیر رہتی ہے کہ وہ ایسے منفی فوائد رائج کرے جس سے ان لوگوں کی رہنمائی ہو سکے جو اصول کی پابندی نہیں کرتے ہیں۔

لہذا انفرادیت کا نصب العین ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں لوگوں کو فرداً فرداً اپنی قدرتی عقل اور جذبات کے مطابق کام کرنے کی حتی الامکان آزادی

حاصل ہو جس کے ساتھ یہ لازمی ہے کہ وہ لوگ بھی ان تمام جماعتوں کے عام اغراض کو ترقی دیں جس میں ہر فرد مہذب صحیح الدماغ اور بالغ ہو لیکن اسپنسر نے اپنے اخلاقی فیصلے سے انفرادیت کو زیادہ ترقی نہیں دی بلکہ اپنی اصولی رائے سے اس کی حمایت کی۔ موصوف کا قول تھا کہ تاریخ سے یہ ظاہر ہے کہ زمانہ قدیم میں حکومت جنگی طاقت کے ذریعہ سے دخل در مقولات کیا کرتی تھی مگر رفتہ رفتہ یہ بات جاتی رہی ہے۔ اب مملکت جماعت کے صنعتی تنظیم کے ذریعہ سے اس کے معاملات میں مداخلت کرتی ہے۔ اگر انتہائی اقسام اشتراکیت کی طرح افراد بروئے ضوابط مقابلہ کرنے سے روکے اور اشتراکیت کرنے کے لئے مجبور کئے جاتے ہیں تو ایسی حالت میں صنعتی نظام کا قیام ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ کی طرح ابھی جنگی دباؤ ڈالنے کا طریقہ اپنا کام کر رہا ہے لیکن حال کا بدرجہ اتم ترقی یافتہ معاشرہ وہ ہے جس میں ایک طرف تو سرکاری عضویت تنگ اور دوسری جانب خانگی عضویتوں کو وسعت ہوتی ہے جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ معاملات میں لہجہ اور معاشی خود اختیاری حاصل ہو جاتی ہے۔ مرتبہ حیثیت کے بجائے باہمی معاہدہ قائم ہو جاتا ہے اور اگر پہلے جنگ ہوتی تھی تو اب امن دہشتی سے کام لیا جاتا ہے۔ انفرادی ضمیر کے ہوتے ہیں اور تقابص کے باوجود اس جدید تنظیم سے جو وسطی درجہ میں قیود وسطی کی جنگی تنظیم کی جگہ پر قائم ہو گئی ہے واقعی ایسے نتائج برآمد بھی ہوتے ہیں نذر انص حکومت کا محدود ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان نذر انص کو خصوصیت دیدی جاتی ہے اور یہ بات تمام جماعت کے عضوی اور عضویت سے بالاتر ارتقاء کے ساتھ ساتھ واقع ہوتی ہے۔ گویا جیسا کہ مارکس نے محض نہیں دکھایا

تھا کہ اشتراکیت کا وجود ایک مناسب شئی ہے بلکہ یہ ثابت کیا تھا کہ صفحہ ہستی پر یہ ضرور نمودار ہو کر رہے گی۔ انفرادیت کے اجزا کی خالی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ صعود کے قدرتی دور میں اس کا قیام ہو کر رہے گا۔ ارباب فہم کی ہرجاغت نے اپنے تصور ترقی اور اپنے نصب العین کی تائید میں تاریخی واقعات کا حوالہ دیا ہے ہیکل کے ”اصول نطق“ کو اشتراکیت کی رہماداری کرنے پر مجبور کیا گیا اور ڈارون کے اصول تسمیع کو انفرادیت کے قیام کا سہرا نصیب ہوا۔

انفرادیت کا لیبر سحر۔ جان اسٹورٹل

غالباً اس معیار کے متعلق نہایت شاندار بیان مل کی تصنیف ”حسرت“ میں ملے گا اس میں بتلایا گیا ہے کہ جن افعال کا براہ راست اثر دوسروں پر نہیں پڑتا ہے ان میں ایک فرد انسان کو ان باتوں کی ضرورت ہے۔ (۱) آزادی خیال و تقریر (۲) آزادی مشاغل و آزادی پسندیدگی (۳) آزادی گفت و سنی آزادی آزادی کہی جاسکتی ہے جس میں اپنے اغراض اس حد تک ذاتی خواہش کے مطابق اور خود پسندیدہ طریقہ سے حاصل ہوتے ہیں جب تک ہم دوسروں کو ان مفاد سے محروم نہیں کرتے اور نہ ان فوائد کی تکمیل کے لئے ان کی جدوجہد میں مایوس ہوتے ہیں۔

انسانوں کو اس سے زیادہ فائدہ حاصل نہیں کہ وہ ہر شخص کو اس طرح سے زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کریں جو اس کے علاوہ اور تمام انسانوں کو اچھا

معلوم ہو بلکہ ان کو فائدہ کثیر اس بات سے نصیب ہوتا ہے کہ وہ شخص کو اس طریقے
بسر اوقات کرنے دیں جو اُس کو خود اچھا معلوم ہوتا ہو اس قسم کی آزادی کا واقعی
مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کی قابلیت کی پوری ترتی ہو۔ لیکن لوگ یہ دلیل پیش کر سکتے
ہیں کہ ممکن ہے کہ کسی انسان کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کے حق میں کون چیز مفید ہے۔
لیٰ اس کا جواب اس استفسار سے دیتا ہے کہ کیا انسان کو کسی
شخص کے بارے میں خود اس سے زیادہ واقفیت ہو سکتی ہے اگر کسی شخص کو نہیں
معلوم ہے کہ کون کون باتیں اس کے لئے سودمند ہو سکتی ہیں تو جو جماعت اس کے
زمانہ میں موجود ہوگی اس کو یہ بات اد بھی نہ معلوم ہوگی لیٰ کا قول ہے کہ جب انسان
کو ایسا جو تہ تلاش کرنے میں وقت ہوتی ہے جس میں اس شخص کا پاؤں سما جائے
جس کے لئے پا پوش در کا ہے تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایسی حکومت کا
دیانت کون کس قدر دشوار کام ہو گا جو افراد متعلقہ کے لئے ہر طرح سے موزوں
مناسب ہو۔ اس کے علاوہ ایک شخص کو اپنے معاملات میں جہاں تک وقوف ہو سکتا ہے
اس قدر اندوں کو نہیں ہو سکتا۔ لہذا وہ خود ہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کن باتوں سے
اُس کو فائدہ پہنچ سکتا ہے یا کون امور اس کے لئے کار آمد ہیں لیکن اس اصول سے
کہ ایک آدمی کی بہتری کی باتوں کا علم کسی دوسرے شخص کو ہوتا ہے۔ بالآخر
بڑی بری طرح سے وہ نوعیت اور جدت مٹ ہی جاتی ہے جس پر حکومت
کی ہستی کا دار و مدار ہوتا ہے جس میں جدت نہیں ہوتی اس کے مفید ہونے کے
متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مل کا خیال ہے کہ۔
د اگر جماعت ہی کو اس بات کا علم ہو سکتا ہے کہ جدت اس کے لئے

کہاں تک منفعت بخش ہے تو وہ جدت نہیں ہو سکتی۔

اب ذرا یہ خیال کرنا چاہئے کہ اگر ایک انسان کو اپنے تقدیر کا فیصلہ کرنا اختیار دیدینے سے کچھ نقصان ہو بچنے کا اندیشہ ہے تو اس اختیار کے نہ دینے میں کیا خطرہ لگا رہتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہمیں ترقی حاصل ہو جائے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ترقی کی خود بوجہ ہمیشہ وہی ہو جو آزادی کی ہوتی ہے۔ کیونکہ امکان یہ ہے کہ ایک ایسی قوم کو خواہ مخواہ قدم بڑھانے پر مجبور کیا جائے جو اس کے لئے رضا مند ہو۔ ترقی کا صرف ایک ایسا پیرستہ جو کبھی ختم نہیں ہوتا اور جس کا وجود مستقل ہوتا ہے حریت ہی ہے۔ کیونکہ جس قدر تعداد افراد کی ہوتی ہے ترقی کے اسی قدر آزاد مرکز ہوتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر اس حمایت اور بردش میں اضافہ کیا جائے گا جو حکومت کی طرف سے افراد کے لئے ہوتی ہے تو سب کمزور و نالیاقت ہو جائیں گے اگر کسی آدمی کو ناکار سمجھو گے تو وہ واقعی کسی کام کا نہ ہے گا۔ بالفرض اس کو یہ نہیں معلوم کہ اس کے حق میں کوئی چیز صنعت بخش ہو سکتی ہے اگر اس کو آزادی نہیں حاصل ہے تو اس کا منشا یہ ہے کہ آپ اس کے لئے ان باتوں کا دریافت کرنا ہمیشہ کیلئے ایک امر ناممکن تھا۔ دیتے ہیں جن سے اس کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پھر معاشرہ کو رہنمائی افراد کا کوئی اختیار ہی نہیں ہے؟ مل اس کے جواب میں رقمطراز ہے کہ واقعی جماعت کو ایسے شخص کی رہبری کا حق حاصل ہے جو صحیح الذہان اور بالغ ہو۔ معاشرے کا فرض ہے کہ وہ افراد کو زیر تعلیم سے آگاہ کرے محض سامان تعلیم کا جیسا کرنا

کافی نہیں ہے بلکہ تعلیم جبریہ دی جانا چاہئے۔ اگر جماعت خواہش مند ہے کہ اس کے ارکان کی تعداد کثیر دنیا میں سود و زیان سے نا آشنا رہ کر محض اس لئے بیٹھے بیٹھے مالی سفید کیا کرے کہ وہ بچوں کے مانند عقل سے کام لے کر غور کرنے کے قابل ہو جائے تو اس کے جو نتائج برآمد ہوں گے ان کے لئے سماج خود ذمہ دار ہو گا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ شخص بالغ اور صحیح العقل ہے وہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون بات ایسی ہیں جو اس کے حق میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اب یہ مہری کرنے والا تصور مکمل صاف ہے یہ مفروضہ اس کے خلاف ہے کہ تمام انسانوں کی حالت یکساں بنا دی جائے لیکن آج کل یہ نہایت شد و مد کے ساتھ کیا جا رہا ہے مگر اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہر شخص سے جدت کا مادہ عطا ہوتا جاتا ہے اور حکومت ناقابل انتہا کی حمایت اور پرورش کرتی ہے انفرادیت پسندوں کے عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس قدر خراب نہیں ہوتے جیسا کہ بتایا جاتا ہے اور نہ کوئی ضرورت ہی ہے ٹھیک کام کرنے یا دوسروں کو مدد دینے کیلئے ہمیشہ پریشان کئے جائیں۔

دائرہ حکومت کے وسیع کرنے کا خیال مستعد اور ذی حوصلہ اشخاص کو اپنا غلام بنا لینا ہے وہ تمام لوگوں کو کثیر اختیارات سے محروم کر کے ان کو ابھرنے نہیں دیتا حکومت کے لئے مناسب ہے کہ وہ ہمیشہ اقتدار کو ایک مقام پر مرکوز نہ نہ رکھ کر اس کی نشر پر ہمیشہ نظر رکھے۔ ایک مرکزی دارالعلوم کا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ مقامی حکام پر حکومت کرنے کے بجائے ان کو تعلیم و تربیت دیکر صرف فاسی جگہ پر ان کے اختیارات محدود نہ ہونے سے جہاں وہ مامود ہوں۔ گویا مل افراد کے ایسے انتہائی معیاس سے متاثر ہے جس میں ہر شخص کو حکومت کرنے کا اختیار مل

اور اپنے زمانہ کا بخوبی حال معلوم ہو۔ کل کا خیال ہے کہ اقتدار میں سب لوگ اسی وقت حصہ لے سکتے ہیں کہ جب ان کو ایک جگہ مرکوز نہ رکھ کر ہر طرف پھیلا دیا جائے گا اور علم ہر شخص کو اسی حالت میں حاصل ہو سکتا ہے جب وہ ایک مقام پر محدود اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس جماعت کے تمام افراد کی جملہ طاقتیں مکمل ترین ارتقاء کر سکیں گی۔

ادبیات انفرادیت۔ سبک کے خیالات

انفرادیت کے بارے میں اور بھی زیادہ مکمل تشریح سبک کی تصنیف ”اجزائے سیاسیات“ میں کی گئی ہے اس نے اس کا کتاب اس بات سے کیا کہ افراد کو معاملات حکومت میں کم سے کم دخل دینے کا حق ضرور حاصل ہونا چاہئے یا اس کے خیال کے مطابق ہر ایک صحیح الدماغ اور بالغ شخص کو (۱) ذاتی حق (۲) ذاتی ملکیت (۳) مکمل معاہدات ان تینوں باتوں کے لئے کاروبار ملکیت میں دخل دینے کا حق حاصل ہے۔

اس کے بعد مصنف نے جو باتیں درج کی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں کیونکہ ان میں ان اعتراضوں پر غور کیا گیا ہے جو انفرادیت کے متعلق عائد کئے جاتے ہیں۔ کتاب میں اس تخیل کا بھی ذکر آیا ہے جو کسی مہذب حکومت کے افراد کے ارتقاء ذاتی کی تہ میں کام کرتا رہتا ہے۔ سبک نے جو خیال انفرادیت کے بارے میں قائم کیا ہے وہ ایک معنی میں محدود ہے لیکن یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ

زمانہ حال میں اس قدیم اصول کی عملی صورت وہی ہے جو سچکے کا قیام کی ہے جو
 کی ایک مثال اس جگہ پائی جاتی ہے جہاں موصوف نے جائیداد کے مسئلے پر بحث
 کی ہے حالانکہ جائیداد ذاتی شکل اراضی (یعنی ایسی زمین جس کے استعمال کا خاص
 اور دوامی حق انسان کو حاصل ہو) کا انفرادیت سے بہت قریبی تعلق ہے لیکن زمین کے
 قومی ملکیت بنائے جانے کے اصول کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا۔ یہ
 ماننا پڑے گا کہ زمین کے کسی شخص کی ذاتی ملکیت ہونے سے بڑا بھاری نقصان
 یہ ہوتا ہے کہ اس سے بہت زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو
 جن لوگوں کے پاس اراضی نہیں ہے وہ اس تمام زمین سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں
 جو فی الحال بعض لوگوں کی ذاتی جائیداد ہے۔ اس کے علاوہ کم سے کم کچھ عرصہ
 کے لئے زمین کے تصرف کی ضرورت خود غرضاً نہ انفرادیت کے حسب اصول
 اس لئے ہے کہ اس میں مستعدی اور ہوشیاری سے کام لے کر خوب کاشتکاری
 کی جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مذکورہ بالا حالات میں زمین کے
 متعلق انفرادیت پسندوں کے اصول کا اطلاق اس طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ
 اس کے تصرف کا اختیار اس طرح دیدیا جائے کہ اس کا کافی معاوضہ ملے
 بعد ازاں سچکے قمرطراز ہے کہ اگر جماعت کو زمین کے گرایہ پراٹھا دینے اور
 فروخت نہ کرنے سے فائدہ ہو سکتا ہے تو انفرادیت اس کے گرایہ پراٹھا دینے
 جانے کے حق میں تائید کرے گی۔ انفرادیت کی اس نوعیت سے تشریح کر دینے
 کے بعد ہم کو اس قسم کے افراد سے سروکار نہیں رہتا جن کو بہت تھوڑے حقوق حاصل
 ہوتے ہیں گویا ہر فرد کی معاشرتی دلچسپیوں کا نہایت کشادہ دلی سے اعتراف

ہو جاتا ہے۔

سیجک نے جو تصور باندھا ہے اس کی تفصیلات پر یہاں بحث نہیں کیجا سکتی کیونکہ ہمارا مقصد صرف معیار پیش نظر کی تحقیقات کرنا ہے مگر یہ بھی انفرادیت پسندانہ ہی رہتا ہے حالانکہ سیجک نے اشتراکی دخل و معقولات کی ضرورت جتائی ہے۔ بہر حال یہ امر کہ افراد کے اپنی ذاتی اغراض کو ہمواری کے ساتھ ترقی دینے سے بہبودی عام بھی بخوبی ہو سکتی ہے۔ بہت بڑی حد تک درست ہی ثابت ہوتا ہے اسی وجہ سے انفرادیت کے علاوہ کسی چیز کی بنیاد پر معاشرتی نظام کی از سر نو ترتیب کے لئے جتنی تدبیریں پیش کی جاتی ہیں سیجک نے ان سب کو مسترد کر دیا ہے مداخلت اشتراکیہ یعنی بہبود جماعت کے لئے افراد پر جبر کرنے سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ آمد و رفت کے ذرائع یعنی ریلوے اور ڈاکخانہ وغیرہ اور دوسری کارآمد چیزوں یعنی پانی زمین وغیرہ کا قبضہ اور انٹرفریمس کے ہاتھ میں آجائے گا اس طرح صرف چند اشخاص کو فراہمی دولت کا حق حاصل نہ ہوگا۔ مملکت کو عمدہ اور جلد کام کرنے والے مزدور فراہم کرنے یا سب کو نشاستگی سے کچھ استفادہ حاصل کرنے کے لئے غریب طباعتوں پر براہ راست روپیہ صرف کرنا چاہئے۔ جس حد تک گرانبار محصول لگائے بغیر ایسا کیا جاسکتا ہے جس سے صنعتی ترقی میں واقعی نقصان پہنچ جاتا ہے اور جس شخص پر محصول عائد کیا جاتا ہے وہ کچھ اپنے پاس پس انداز نہیں کر سکتا اس حد تک عوام الناس کے روپیہ کا تصرف اس لئے قابل تائید ہے کہ اس سے بڑھکر اور کوئی طریقہ انفرادیت

پسندانہ نصب العین انصاف تک رسائی حاصل کرنے کا نہیں ہے خواہ اس خراج کے نسبت بجا طور پر لوگ یہ بھی کہیں کہ اس میں اشتراکیت کی جھلک نظر آجاتی ہے۔

فرانسیسی اور روسی عدم حکومت

لیکن ارتقاء اشتراکیت اور اس کی قدم صورت کے خلاف جو جائز اعتراض کئے جاتے ہیں ان کے باوجود زیادہ انتہائی شکل میں مذہب انفرادیت ابھی تک بحیثیت نصب العین رائج ہے یہی وجہ ہے کہ یہ ایک ایسے آزاد اور مکمل طور پر ترقی یافتہ انسانوں کی جماعت کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے تیار کرتا ہے جن کو بیرونی انتظام کی اسی قدر کم ضرورت ہوتی ہے جس قدر ہونشیاری کے ساتھ ہر انسان اپنا طرز عمل اختیار کرتا ہے اور اس کا مدعا ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے کہ جس میں بیرونی مداخلت کی ذرا بھی ضرورت درپیش نہ ہو بعض مصنفوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ جس حد تک نیراج کا تصور تقریباً انتہائی درجہ کی انفرادیت کے تخیل سے ملتا جلتا ہے۔ اس کو ایک سیاسی عنصر سمجھکر اس پر غور کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بے اثر محض اس وجہ سے ہے کہ سماج کی موجودہ صورت حالات کی بہت سی باتوں کا اس میں خیال نہیں کیا جاتا۔

عدم حکومت ایک قسم کی قیاسی انفرادیت ہے بحیثیت معیار یہ

کوئی نامناسب تھے نہیں بشرطیکہ ہم تسلیم کر لیں کہ نصب العین بذات خود مقصد نہیں ہوتا بلکہ اس سے کسی مقصد کی تکمیل میں رہنمائی ہوتی ہے کیونکہ ہم بخوبی خیال کر سکتے ہیں کہ انسانوں میں جس قدر تہذیب بڑھتی جائے گی اسی قدر بیرونی حکومت کی ضرورت نہ پڑے گی اور معیار کے مطابق تہذیب صرف وہی شخص ہے جو اپنی عقل سے کام لے کر اپنی خواہشات کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ اس میں اپنے افعال کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرنیکی صلاحیت پیدا ہو جائے

ریٹیلے کے ”تہلہ کی خانقاہ“ کا یہ مقولہ تھا کہ جو آزاد ہوتے ہیں ان کو اسی بات کی طلب رہتی ہے جو ٹھیک ہوتی ہے اور اگر یہی آزادی ہر شخص کو حاصل ہو سکے تو وہ عدم حکومت ہو جائے گی اس معیار کی تہذیب عجیب و غریب ترجہانی کیلگی ہے اور وہ بفرض مباحثہ یہ ہے کہ اگر عدم حکومت کا حامی کوئی فلسفی ہے تو وہ درہم برہم کرنے والا ہوتا ہے۔ سراج کا دراصل یہ تصور ہے کہ اگر انسان کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو ہر شخص دوسروں کے جاؤ عمل میں دخل انداز ہو کر اپنی راہ اختیار کرتا ہے۔

پروڈہن نے سب سے پہلے حکومت کے موجودہ خیال پر حملہ کیا تھا اس کا بیان یہ تھا کہ حکمرانی کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس قابل بنائے کہ وہ حکومت کے بغیر دنیا میں اپنا اپنا کام کر سکیں جس شخص کو اپنی ذات پر کامل قابو حاصل ہے اس کے لئے خارجی دباؤ کی ذرا بھی ضرورت نہیں۔ وہ آزاد مطلق ہوگا۔

بیکونین نے مزاج کے بنیادی اصول کی یوں تشریح کی ہے کہ اگر ہر شخص سرشت انسانی اور قانون قدرت سے بہرہ اندوز ہو اور اسی کے مطابق زندگی بھی بسر کرے تو سب باتیں خود بخود ٹھیک ہو جائیں۔ اس نے جو ذریعہ بتایا ہے اس سے حامیان عدم حکومت کے خیالات پر اور بھی رنگ آمیزی ہو گئی کیونکہ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر ایک زبردست حملہ کر کے موجودہ حکومت کو پاش پاش کر دیا جائے تو قدرت کے مطابق اور اندرونی بندوبست کے بغیر تمام لوگوں کا ایک آزاد نظام قائم ہو سکتا ہے۔

تہذیب آج کل جس طرف قدم بڑھائے چلی جا رہی ہے شہزادہ کرپاکن نے اس کا ایک فیاضانہ (گودہ خیالی ہو) قیاس قائم کر کے اسی اصول کو ترقی دی ہے۔ ڈارون کے ہر دلعزیز تصور کا منشا یہ ہے کہ تمام افراد میں ہمیشہ ایک قسم کی مخالفت جاری رہتی ہے لیکن کرپاکن نے اپنی تصنیف (امداد باہمی) میں دکھایا ہے کہ لوگوں کا رجحان طبع ہمیشہ اتحاد و یگانگی کی طرف رہتا ہے گویا خصلت انسانی میں حامیان مزاج کی عقیدت نہایت زبردست ہوتی ہے شاید دوسرے عقیدوں کے برعکاس اس خیال کو معقول ثابت کر دینا زیادہ دشوار نہیں ہے۔ غور کریے معلوم ہوگا کہ حالانکہ انفرادیت کا مذہب بحیثیت معیار زیادہ تر انگریزی اختراع ہے لیکن اس کی قیاسی صورت فرانس اور روس میں قائم کی گئی تھی۔ علم سرشت حیوانی کی رو سے یہ باسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اہل روس کی نگاہ میں اہرتم کی حکومت بہت ناک ہوتی ہے اور فرانسیسوں نے اشرافی حکومت اور اختیار

کو ایک جگہ مرکوز رکھنے کی عادت کے خلاف نہایت زبردست صدائے مخالف بلند کی جیسا کہ وہ سونے کیا تھا۔ بہر حال میں عدم حکومت پر فیصلی نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی ایسا معیار نہیں ہے جو سیاسی خیالات سے فی الحال زیادہ با اثر ہو۔ باب فہم کی ایک کثیر التعداد جماعت اس کو نہایت ناقابل عمل تصور کرتی ہے۔ لہذا ہم انفرادیت کے ان اقسام کے تقایص پر روشنی ڈال سکتے ہیں جو قابل عمل ہو۔

حامیان انفرادیت کے معیار پر نکتہ چینی

انفرادیت کے تمام رجحان طبع کی نکتہ چینی میں بعض اشخاص اس بات پر بہت زیادہ زور دے سکتے ہیں۔ حیثیت معیار انفرادیت میں معاشرتی معاملات اور افعال کے نتائج سے پہلو تہی کی جاتی ہے ان باتوں کا ذکر آئندہ باب میں کیا جائیگا کیونکہ اس نقض کو کچھ حد تک دور کرنے کے لئے اشتراکیت کا نصب العین قائم کیا گیا ہے انسان میں یہ ایک قدرتی خاصہ ہے کہ اس کو ہمیشہ اپنے مفاد کی باتوں کا زیادہ خیال رہتا ہے اگرچہ جذبات پرستی میں مبالغہ سے کام لے کر ان فرائض کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو ہم کو اپنے ہمسایہ کے ساتھ ردا کرنا چاہئے لیکن ایک معیار میں جو تکمیل طلبے ان اثرات پر زیادہ غور کرنے اور اصرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو ہمارے افعال سے ہماری ذات پر پڑتے ہیں بلکہ ضرورت ان اثرات پر زیادہ زور دینے کی ہے جو ہمارے افعال سے جماعت پر پڑتے ہیں۔

لہذا اگر کسی معیار سے کسی ناقص میلان کی درستی ہو سکتی ہے اور موجود
 عادت یہ ہے کہ لوگ زیادہ تر خود غرض اور بے جا حالت خیر انانیت پسند ہوتے ہیں
 تو انفرادیت کی مخالفت اس لئے کرنا چاہئے کہ اس سے خود اسی عیب کو تقویت
 پہنچتی ہے جس کے دور کرنے کی سخت ضرورت ہے اس میں شک نہیں کہ مل اور
 سیکک ایسے انفرادیت پسند مصنف واقعی یہ سمجھے ہی نہیں کہ اوسط درجہ کے
 انسان کی انانیت کسے کہتے ہیں مگر ان کی انانیت خود اس قدر روشن خیالی
 پر مبنی ہوتی ہے اور ان کے اعمال اس قدر عقلندی سے صادر ہوتے ہیں کہ وہ
 درحقیقت ان باتوں کی پیروی کر کے معاشرے کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں جن کو وہ
 اپنے پسند ترین اغراض قرار دیتے ہیں لیکن جیسا کہ سقراط کے معاملہ میں ہوا ہے
 ایک شخص کی ذاتی صفت عام اصول اخلاق میں شمار نہیں کی جاسکتی۔ سقراط
 جس بات کو عمدہ سمجھتا تھا اس کے کرنے میں اس کو پس و پیش نہ ہوتا تھا بجز
 یہی حال ایک اعلیٰ درجہ کے انفرادیت پسند کا بھی ہے یعنی یہ کہ اس کو اپنی
 ذاتی دلچسپیوں کا خیال رہتا ہے تو اس کا یہ نشانہ نہیں ہے کہ اس کو دوسروں
 کے فائدے سے کچھ سروکار نہیں ہوتا وہ ان کو لینے دارے سے خارج نہیں
 کرتا لیکن زیادہ تر لوگ اس قدر وسیع النظر اور اعلیٰ خیال نہیں ہوتے۔ ہم انکو
 تجربہ تلخ سے (اور عام طور پر دوسروں کے تلخ تجربہ سے) اس تحقیقات پر
 نہیں پرہیز کرنے دیں گے کہ دوسروں کے مقاصد حاصل کرنے سے ان کا مفاد بخوبی
 حاصل ہو سکتا ہے۔ انفرادیت کے خلاف اس اعتراض سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ
 نصب العین غلط ہے بلکہ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ایک نیم مہذب ملک

کے موجودہ ضروریات کو دیکھتے ہوئے ”مذہب انفرادیت“ بہ حیثیت معیار انسانی
 اس کے علاوہ انفرادیت کو انیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ کے فلسفہ
 جزویت سے بھی بہت نقصان پہنچتا ہے۔ انسان کوئی ایسی جداگانہ ہستی نہیں
 جو چاروں طرف حقوق کی دیوار سے محصور ہو۔ بات یہ ہے کہ افراد کے تمام حقوق
 کا دلو مدار اس کے فرائض پر ہوتا ہے۔ انقلاب فرانس میں جو مبالغہ آمیزیاں
 حقوق انسان کے تعلق کی گئی ہیں وہ ہم کو گمراہ کرتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آجکل
 کوئی بھی حامی انفرادیت ہر انسان کے تمدنی تعلقات سے ہرگز یہ ہلو تھی نہیں
 کرے گا بلکہ اس کی ضرورت کا اقرار کرے گا لیکن اس کے باوجود انفرادیت
 کو اس ابتلا سے ضرور ضرب پہنچی ہے کہ افراد ذراؤں کے مانند جدا جدا ہیں
 اس حالت میں بھی جب واضح طور پر اس کا اظہار بھی نہیں کیا جاتا ہے۔ اکثر
 اصحاب خیال کرتے ہیں کہ حکومت محض افراد کا مجموعہ ہوتی ہے۔
 ہائز کی تصنیف لیویاتھن کے آغاز میں جو مینیل دی کہی گئی ہے وہ اپنی
 آپ نظر ہے کیونکہ اس میں ایک عظیم انسان حکومت کے بارے میں لکھا ہے کہ
 وہ چھوٹے چھوٹے شہریوں کا مجموعہ ہوتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ
 انسان کی انفرادی ہستی مٹ ہی جاتی ہے بلکہ مراد کلام یہ ہے کہ مملکت یا
 جماعت کو رضا مند افراد کا زبردستی سے یکجا ہو جانا نہیں بلکہ ایک عضوی
 نکل تصور کرنا چاہئے۔

افراد رضا مند ہوں خواہ نہ ہوں اپنے خاندان کے تہرے سے ان کا
 تعلق (ایک قدرتی جماعت کے ساتھ ہو جاتا ہے جس کو وہ اپنی قوم کے

لقب سے موسوم کرتے ہیں گویا ان میں ایسے شعار ہوتے ہیں جن کے معنے اور عقیدت کا اندازہ ان روایات کے لحاظ سے ہوتا ہے جن میں ان افراد کی پیدائش ہوئی ہے اگرچہ ان روایات کی طاعت سے وہ انحراف بھی کر جائیں اور دوسرے روایات اختیار کر لیں مگر ان کا خون نہیں بدل سکتا ایسے جزوی افراد کا خیال جن کی نہ کوئی قوم ہوتی ہے نہ روایات اور نہ جن کا کسی سے تعلق ہوتا ہے اتھارہویں صدی میں پیدا ہوا تھا مگر اب متروک ہے۔ انیسویں صدی تک یہ محض بند و بست بزرگانہ کے انتہائی خوف کی وجہ سے جاری رہا لیکن انفرادیت کے اس نقص پر جو نکتہ چینی کیجا سکتی ہے وہ ان دلائل میں خود بخود ہو جائے گی جن پر ہم اشتراکیت کے سلسلے میں غور کریں اس لئے باب ہذا میں اس مسئلہ پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

انفرادیت کے خلاف دوسرا اعتراض یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ایسا آنا و مقابلہ جس میں آزاد شرکت کی گنجائش رہتی ہے بالآخر اپنے ضد اقتصادی معنی اجاڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حامیان اشتراکیت کا یہ اعتراض بے بنیاد نہیں ہے کہ انفرادیت کا براہ راست یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اوقاف اور بڑے بڑے کاروبار قائم ہو گئے ہیں اور یہ کہ جس دستور سے یہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ لا علاج ہے اس کا فوراً سد باب ہو جانا چاہئے۔ عام طور پر جو مخالفت کی جاتی تھی اس میں بہت سی باتیں بڑھا کر بھی کہی جاتی ہیں یہ ممکن ہے کہ مسلک انفرادیت غلطی پر مبنی ہو یا یہ کہ اس سے صرف ایسے خیال کی حمایت ہوتی ہے جس سے ان آزاد اور کامل طور پر ترقی یافتہ افراد کا وجود واقعی کٹم عدم میں مستور ہو جاتا ہے جسکو حامیان انفرادیت خود نظیر قرار دیتے ہیں اس میں شک نہیں کہ آزاد مقابلہ کے

متعلق ہو۔ ان افرادیت نے اپنا تجنیس قائم کر نہیں ضرور غلطی سے کام لیا ہے۔

نتائج

اب صرف یہ کہنا باقی ہے کہ بحیثیت معیار افرادیت کا مذہب نہایت مستقل چیز ہے جو غلطیاں اور قیدیں اس میں پستتر تھیں وہ ظاہر ہیں ان کے باوجود یہ معیار ابھی تک قائم ہے افرادیت پسند ماہرین اقتصادیات اور خود غرض فلسفہ دان جنہوں نے آزاد سعادہ اور غیر مقید مقابلہ کی تائید کی تھی وہ اصل میں ایک ایسا دستور قائم کر رہے تھے جس میں فردیت کا نام نشان بھی نہیں باقی رہتا تھا۔ یہ واقعی ایک پر لطف تاریخی مذاق ہے۔ حامیان اُردیت اسی معیار کی تکمیل کو قطعی ناممکن بنانے کے لئے سر توڑ جدوجہد کر رہے تھے جس کے وہ خود علمبردار تھے۔ افرادیت کو آج تک اس کے ان گمراہ اور بد قسمت پیروں کے سبب سے نقصان پہنچ رہا ہے جو انیسویں صدی کی ابتداء میں پیدا ہوئے تھے محض ان ذرائع کی وجہ سے جن کے ساتھ اس معیار کا تعلق حماقت سے قائم کیا گیا تھا افرادیت کی بحیثیت معیار تعریف نہیں کیجا سکتی قانون اور حکومت سے اس کا خوف کھانا سیاسی انعامات کے ایک غلط اصول کا نتیجہ تھا پابندی قانون کے علاوہ اور بھی کئی دوسرے قیود ہیں اگر قانونی سختیاں دور کر دی جائیں تو جماعت کی ساخت میں جو تغیر پیدا ہو جاتا ان کو بہت زیادہ

تفہیت پہنچ جاتی ہے۔ جب تک حامیان اشتراکیت یہ دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ قانون خود قدرتی قیدوں کے ہٹانے کا نام ہے اس سے ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا کیونکہ جو شخص ایسی حالت میں پیدا ہوا ہے جس کو خوراک بھوک سے کم میسر ہوتی رہے تن پوشی کا سامان بہت کم نصیب ہے اور جس کے پاس ذرا بھی بریاء نہیں ہے اس کے مواقع بہت زیادہ محدود ہیں اس کے لئے آزاد مقابلہ اور آزاد معاہدہ کی درحقیقت کوئی گنجائش نہیں اس شخص کو کس قسم کی آزادی حاصل ہو سکتی ہے جس کو یا تو معاہدہ کرنا یا فاقہ کشی کا شکار ہو کر راہی عدم ہو جانا پڑے گا۔ اس لئے انفرادیت پر پوری بحث کرنے کے لئے ہمیں اس کی روح کو اُسی وقتی قالب سے ضرور جدا کرنا پڑے گا جس میں پیشتر اس کا نزول ہوا تھا۔ میں اپنے خواب آئندہ یعنی مہذب ملکیت میں بیشک ایسے افراد کا مجموعہ نظر آجائے گا جو ہمارے زمانہ کے بہترین افراد کے بہ مقابلہ اسی طرح بدرجہ اتم بہتر ہوں گے جس طرح آخر الذکر ہمارے اہل پیشین یعنی زمانہ ابتدائی کے غیر مہذب باشندوں کے مقابلہ میں اس وقت زیادہ بہتر ہیں۔ ملکیت کی قدر و قیمت کچھ عرصہ میں وہی ہو جاتی ہے جو ان افراد کی ہوتی ہے جن سے ملکہ حکومت بنتی ہے۔ جس حکومت میں ان افراد کی دماغی اور انتظامی قابلیت کی ترقی کا کام ملتی کر دیا جائے یعنی جو ملکیت اپنے افراد کو ترقی کرنے سے اس لئے باز رکھتی ہے کہ مفید اور کارآمد باتوں کے لئے بھی وہ ان کو مقصد براری کا وسیلہ بنا کر اپنے قبضے میں رکھے اس کو ایک روز معلوم ہو جائے گا کہ چھوٹے آدمیوں سے بڑے کام ہرگز نہیں ہو سکتے۔

گیارہواں باب

اشتراکیت

ابتدائی خیالات

یہ ایک ایسا معیار ہے جس پر ضرور غور کرنا چاہئے ہمارا موجودہ موضوع یہ نہیں ہے کہ ہم ان باتوں پر گفتگو کریں جو اشتراک کی جماعت کو ناجائز ہے بلکہ فی الحال ہم ان تصورات پر نگاہ تعمق ڈالنا چاہتے ہیں جو اس قسم کی باتوں کی تہ میں واقع ہیں جس طرح مذہب اسلام اور دین عیسوی کے تفصیلات پر بحث کئے بغیر ہم ان دونوں کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں اسی طرح ان باتوں کو مکمل طور پر بیان کئے بغیر جو اشتراکیت پسند کرنا چاہتے ہیں ان کی دماغی کیفیت پر بحث کی جاسکتی ہے۔

انسانوں میں جس قسم کی زندگی قابل حصول سمجھی جاتی ہے اس پر کوئی بحث نہیں کیجا سکتی ہے تاوقتیکہ ان طریقوں کا ذکر نہ کیا جائے جن کے ذریعے وہ اس قسم کی زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کا مشایہ نہیں ہے کہ محض انہیں طریقوں پر غور نہ کیا جائے اس وقت بحث کی ہی نہیں جاسکتی۔ لہذا ہمیں مقصد یا منہشا یعنی اس صورت حالات پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو لوگ حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے ذریعے حصول پر بحث کرنا منطوق نہیں ہے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ معیار اشتراکیت کس طرز سے زمانہ حال کی چیزوں کے دلوں کو ابھار رہا ہے اور اس کے بعد اگر ممکن ہو تو ہم یہ بتائیں گے کہ اسکی ابتدا کس طرح ہوئی۔

لیکن اشتراکیت میں گروہوں کے تعلقات کا عموماً کوئی ذکر نہیں ہوا جیسا کہ آگے چل کر ہمیں معلوم ہوگا۔ واقعی اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں ایک دوسرے سے مختلف جماعتوں کے افراد باہم دیگر اس قدر متاثر اور یکساں سمجھے جاتے ہیں جس قدر اصل میں وہ ہوتے نہیں۔ ایک اگر زراہ کسی دوسری قوم کے ایک فرد کے باہمی تعلقات کے بارے میں جو بحث کی جاتی ہے وہ اس مباحثہ کے برابر سمجھی جاتی ہے جو ایک فرانسیسی اور کسی دوسری قوم کے کسی فرد کے باہمی روابط کے سلسلے میں کیا جاتا ہے گویا گروہوں یعنی حکومتوں یا قوموں کے شعائر نظر انداز کرتے جاتے ہیں۔ بہر کیف یہ صحیح ہے کہ خاص باتوں میں اس پہلو کو نظر انداز کر دینا جائز ہے ایسی باتوں میں ہم اس سے بھی قطع نظر کر سکتے ہیں کہ فلاں شخص اگر زیر ہے بلکہ اس کے بجائے ہم محض اس کو ایک انسان

سمجھ کر غور و غوص کر سکتے ہیں۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کل قوموں کے تمام افراد میں ایک عام بات ہوتی ہے فی الحال مقصد باری کے لئے ہم اسی بات پر بحث کریں گے گویا اشتراکیت میں انسان کا ذکر پہلے اس تعلق کے اعتبار سے کیا جاتا ہے جو خود اس کے اور دوسرے بھمنوں کے مابین واقع ہوتا ہے مذکورہ بالا خیالات سے یہ پہلو پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو ان تعلقات پر بحث نہیں کرنا ہے جو ایک جماعت اور دوسرے کسی گروہ کے درمیان ہوتے ہیں بلکہ صرف ایک انسان کے جو تعلقات دوسرے لوگوں کے ساتھ ہیں ان پر خیال آرائی کرنا ہے۔

یہاں ایک بہت باریک فرق واقع ہے جس پر نہایت احتیاط سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

”ایک فرد انسان کے تعلقات دوسرے انسان کے ساتھ“ اور ”ایک گروہ کے افراد کے تعلقات دوسری جماعتوں کے افراد کے ساتھ“ ان دونوں میں فرق ہے۔ اس لئے ”ایک انسان کے تعلقات دوسرے انسانوں کے ساتھ“ کہنا مناسب نہ ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ امور قومیت سے ہم خلاصہ کر لیتے ہیں مگر ہمیں یہ فراموش نہیں کر دینا چاہئے کہ جماعتوں کا وجود بھی دنیا میں ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو محض ”انسان“ ہو اور انگریز۔ فریسی یا کسی اور قوم کا فرد نہ ہو۔

اگر خلاصہ باخبری کے ساتھ نہیں کیا گیا ہے تو اس سے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ خلاصہ سے کام لینا چاہئے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں

یہ بھی باخبری کے ساتھ خیال رکھنا چاہئے کہ یہ خلاصہ ہی ہے اس شرط سے ہم انسانوں کے تعلقات باہمی کے بارے میں معیار اشتراکیت پر غور کر سکتے اور ان اعتراضوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں جو جمہوروں کی اہمیت عظیم کا حوالہ دے بغیر اقتصادی یا معاشرتی فرقے کے تعلقات کا ذکر کرنے پر عائد کئے جاسکتے ہیں خواہ وہ گروہ قومی ہوں خواہ ارضی یا محض خانگی ہوں۔

نصب العین اور اس کے عام پہلو

گویا یہی ایک رجحان طبع موجودہ دنیا کے سیاسیات میں ایسا ہو گیا ہے جسے ہم اشتراک کی کہہ سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ معاشرتی معاملات میں ہماری ترقی کم ہوتی ہے اور ہمارے افعال کے جو نتائج ہماری ذات پر اثر انداز ہوتے ہیں ہم ان کا زیادہ خیال کرتے ہیں اور جن نتائج کا اثر جماعت پر پڑتا ہے ان کے بارے میں ذرا بھی نہیں سوچتے۔ لیکن یہ خیال کرنا محض جذبات پرستوں ہی کا کام ہے کہ دوسرے اشخاص ہماری ذات سے زیادہ ضروری اور اہم ہیں اور یہ کہ ہمیں اپنے ذاتی انفرادی معاملات کے متعلق یہ خیال بھی نہ کرنا چاہئے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جو خود پرستی اصل معنوں میں خود پرستی ہوتی ہے اس میں اور اس خیال واقعی میں کہ کوئی بات ہر شخص کے لئے فائدہ مند ہے اور ہمیں سب کے فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا چاہئے دراصل کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ بعض افعال کا اپنی ذات پر اثر پڑتا ہے اور بعض کا دوسروں پر پڑتا ہے

مگر ان دونوں قسم کے افعال کے درمیان کسی قسم کی تفریق کوئی وقت نہیں بچتی
ساتھ ہی ساتھ ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر لوگ اس بات کا خیال نہ کریں کہ ان کے
کام کا اگر وہ پر کیا اثر پڑتا ہے تو فی الحال اس سے کوئی شدید نقصان نہیں
پہنچتا۔

یہ ظاہر ہے کہ جس قسم کی صورت حالات حامیان اشتراکیت پسند
کرنا چاہتے ہیں وہ ایسی ہے جس میں یہ طرز عمل عام ہو گیا ہے جس میں جماعت
کا ہر فرد خود کو ایک کل کا جزو محض اس لئے نہیں سمجھتا ہے کہ اس کو
اپنے ملک کے غرباء کے ساتھ خاص بہرہ دی ہے بلکہ قدرتی طور پر مہولی حالت
میں وہ ایسا خیال کرتا ہے۔ ہم لوگ اکثر اپنے اہل ملک کے کارہائے نمایاں
پر فخر و ناز کیا کرتے یا اپنے ہمسایوں کے مصائب سے پریشان و ہراسان
ہو جاتے ہیں لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ محکو محض ذاتی تکلیف یا رنج
کا خیال رہتا ہے لیکن یقیناً یہ امید کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ یکجہتی
کے خیال کی ترقی ہونا چاہئے خواہ حامیان اشتراکیت کی طرح ہم اس گرو
کو جس کے ساتھ ہمارا تعلق ہے تمام جماعت انسانی تصور کریں یا اس کو
کوئی ایسا چھوٹا گروہ خیال کریں جس کا علم اوسط درجے کے انسان ہو سکتا ہو
جس معاشرے میں یہ معاشرتی نقطہ خیال زیادہ ترقی پا گیا ہو گا وہ ذاتی اپنی
تنظیم نیز کثرت افراد کی ہزادی کے معاملے میں ہماری جماعت سے بہت
زیادہ مختلف ہو گا اس لئے اشتراکیت کے انتہائی معیار کا پتہ کسی ایسے
نظام سے نہیں جو اس خیال کا نتیجہ ہو بلکہ ایسے معاشرتی نقطہ میں چلے گا

جو بہت زیادہ بڑھا چڑھا ہوا ہو۔

بعض اصحاب کو یہ بات عجیب معلوم ہو گئی کہ ہم کو معیار اشتراکیت کا وجود ایک ایسے جذبہ میں نظر آتا ہے جو بظاہر اکثر ایسے اشخاص میں موجود ہوتا ہے جن کا مسلک اشتراکیت نہیں ہوتا اور کسی اشتراکیت جماعت کے پیش نامی اس کا پتہ نہیں لگتا لیکن اول ہم کو اس معیار کے اس عام ترین اثر سے مطلع ہو جو سیاسیات موجودہ پر پڑ رہا ہے۔ بعدہ ہم معیار انتہائی کا مقابلہ ان وسائل سے کریں گے جو اس معیار کو حاصل کرنے کی غرض سے استعمال کئے جاتے ہیں یہ درست ہے کہ عموماً لوگ معیار اشتراکیت کو ایک ایسا ہوائی قلعہ یا خواب سمجھے ہیں جس میں حکومت کے ہاتھ اس کی روح کو فروخت کر دینے کے عوض انگوٹھی کا نشان لگا کر شخص کا نام رجسٹر میں درج کر لیا جاتا اور اس کے نام کے ساتھ ایک عدد شمار یہ شامل کر دیا جاتا ہے لیکن جدید دنیا میں بھی قدیم کیفیت کے لحاظ کے یہ مقابلہ ابھی بہت ناقص ہے اصلی روح رواں یعنی معیار ایک ایسے معاشرہ کا وجود ہے جس میں معاشرتی خیال حقیقی متحول قوت خیر اور ہدایت یافتہ ہو گا۔

بہت سے اشخاص اشتراکیت کی تائید نہیں کرتے وہ اس قسم کا معیار مبہم طور پر پسند کریں گے لیکن اس کو جو طاقت زمانہ حال میں حاصل ہے وہ محض عہد گزشتہ کے بڑے بڑے حامیان اشتراکیت کی بدولت حاصل ہے اور صرف تسلیم شدہ اشتراکیت کے پیش نامی ہم اس معیار کو زیادہ وضاحت اور آزادی کے ساتھ شامل پائیں گے گویا اس معیار نصب العین سے جماعت

کی ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے جس میں ایک فرد انسان خود کو ایک بڑی عورت کا ایک جزو سمجھنے لگے گا۔ اور اس کا احساس بھی کرے گا۔ مگر اس سے ایک ایسا بیان پیدا ہو جاتا ہے جس کی حقیقت یہ مان لیا جائے کہ مسلمہ ہے اور وہ اصلیت یہ ہے کہ جو نتیجے انسان کے فعلوں کے اس کی ذات پر پڑتے ہیں اس کے خود وہی نہیں بلکہ پوری جماعت ذمہ دار ہے اس لئے ہمیں ایماندارانہ مشقت کے نتائج یا انفرادی ذہن و عقل کے ثمرات کے متعلق جذبات کو برائے بخشتہ کرنے والی باتوں سے گمراہ نہ ہو جانا چاہئے۔ جس طرح افعال کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے اسی طرح ان کے اسباب بھی گروہ ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ بہت بڑی آمدنی پیدا کرنے کا سہرا ایک دولت مند آدمی نہیں بلکہ مجموعی طور پر ان حالات کے سر رہنا چاہئے جن کے سبب سے اس قدر زیادہ آمدنی حاصل ہو سکتی ہے گویا مختصر اس سے ہماری یہ مراد ہے کہ اس کا سہرا جماعت کے ہر فرد کے سر ہے۔ معدودے چند اشخاص لاکھوں غریبوں کی محنت کی بدولت دولت و ثروت ہی سے مالا مال نہیں ہو گئے ہیں بلکہ ان کو دائمی لسن فراغت کے برکات نصیب ہو گئے جن کے طفیل سے ایک ہل دولت یا ماجر کو اپنی قابلیتوں کے اظہار کا موقع مل سکتا ہے ہمارا یہ خیال نہیں ہے کہ ان لوگوں کو زیادہ معاوضہ ملنا چاہئے جنکی مشقت سے کسی گروہ کو دولت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے موجودہ اغراض کیلئے صرف یہ تسلیم کر لینا کافی ہے کہ جماعت کی متفقہ محنت سے دولت پیدا ہوتی ہے۔ کسی خاص شخص کے سوا اس کا سہرا نہیں رکھا جاسکتا کیونکہ یہ دولت محض اس کی

تنہا ذات کی بدولت نہیں حاصل ہوئی۔ اس لئے دو سیاسی امور اشتراکیتیں
مضمون ہیں یعنی (۱) افعال سے اقتصادی نتائج رونما ہونے ہیں اور (۲)
نتائج کے اقتصادی باب ہوتے ہیں لیکن اگر ان دونوں باتوں پر غور
کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس حوصلہ یا دماغ کو ہم اشتراکی کہتے ہیں وہ
یہ ہے کہ ایسے معاشرتی نتائج اور اسباب زیادہ دانستہ اور ترقی یافتہ
ہونا چاہئے کہا جاتا ہے کہ افعال کے جس قدر معاشرتی نتائج اسی تک
ہوتے رہتے ہیں ایسے سے ان کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے اور دولت
و فراغت میں جو کچھ فراوانی ہو اس کو زیادہ تر معاشرتی اسباب کا نتیجہ
سمجھنا چاہئے۔

انسان تنہا کوئی کام نہیں کرتے۔ کام کے نتیجہ کے لئے وہ کثیر تعداد
اشخاص جو کام کرتے ہیں اسی قدر قابل ستائش ہیں جس قدر وہ معدودے
چند اشخاص ہوتے ہیں جنکی نگرانی اور ہدایت میں وہ کام کیا جاتا ہے طرح
ہم اس وقت جب کسی آدمی ملکر کوئی ذہنی چیز اٹھاتے ہیں جس کو ایک شخص
تنہا نہیں اٹھا سکتا تو ایک شخص کی ذاتی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے
اسی طرح ہر شخص کی جداگانہ ذہانت یا طاقت کے اعتبار سے معاشرتی فحش
کے نتائج تمام اشخاص میں درستی کے ساتھ تقسیم نہیں کئے جا سکتے۔

گویا عام الفاظ میں وہ معیار فی الحال ایسے افعال سیاسی میں
ایک انقلاب برپا کر رہا ہے اور اکثر ایسے اشخاص بھی واقعی اس کے
زیر اثر ہو گئے ہیں جو کسی طرح اشتراکیت پسند نہیں کہے جا سکتے۔

اب ہم اس معیار کے ابتدائی ارتقا پر نظر ڈال کر اس کے معنی کی تحقیقات کریں گے۔

معیار کی تاریخی ابتداء

اشتراکیت کا ایک براہ راست سبب مختلف اقوام کے مابین سلسلہ رسل و رسائل کا اضافہ تھا۔ جس وقت تجارتی مقاصد کے لئے بھی ایسے گردہوں کی باہمی عداوت کی پرواہ کی جانے لگی جن سے دو افراد علاقہ رکھتے تھے یعنی جس وقت ایک فرد انسان قومی حدود کے باہر والے افراد کے ساتھ میو پار کرنے لگا اسی وقت سے مقابلہ شروع ہو گیا۔ تجارت میں جس بات کا آغاز ہوا تھا۔ ادبیات نے اس کو تکمل کر دیا۔ اور لوگ دوسرے ملکوں کے حالات کا مقابلہ اپنے ملک کے حالات سے کرنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کل فرقہ میں بیداری پیدا ہو گئی۔ لیکن جس قدر مختلف اقوام میں مقابلہ کیا گیا تھا اس وقت کون فرقے پاسے گئے تھے۔ زینداری میں زمانہ وسطیٰ کی رسم ذات کا کچھ حصہ باقی تھا۔ شہروں میں یورپ کے نشاۃ جدیدہ امتیازات جاری تھے جہاں معاشرہ متوسط الحال اشخاص کے خلاف تھا لیکن ان فرقہ بندیوں میں سے زیادہ نمایاں فرقہ بندی وہ تھی جو اپنے ہاتھ سے کام کرنے والوں کو ان اشخاص سے علیحدہ کرتی تھی جو محض ان کی محنت یا بزرگوں کی میراث میں پاسے ہوئے ملحقہ پر سہر کرتے تھے۔

لفظ مزدور یا کاریگر ایک جدید اختراع تھا جس میں واقعات کا ایک نئے طریقے سے مشاہدہ کیا گیا تھا۔ عوام مزدور طبقہ کو سرمایہ داروں کا خلیفہ سمجھنے لگے اور قومی حدود سے قطع نظر کر کے مقابلہ سیاسیات اور معاشرتی اصلاح میں شروع ہو گیا۔ کیونکہ حریت نظام اندوہ سہری بڑی باتوں کا خیال کرنا اس وقت بالکل بیکار معلوم ہوتا تھا۔ جب ان تہذیب یافتہ اقوام کے افراد کی ایک بہت بڑی تعداد کو خوراک اند پوشاک بھی نہیں ملتی تھی۔ انفرادیت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوا کہ معیار اشتراکیت میں ایک فرد کا دوسرے سے نہیں بلکہ ایک فرقہ کا دوسرے فرقے سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

۱۸۳۵ء کے پر جوش اشتراکیوں نے مزدور طبقہ کے درمیان اتحاد و اشتراک کے قیام کی تجویز کی۔ اشتراکیت کا نام پہلے پہل اس سال رائج ہوا جب رابرٹ اوپن نے تمام طبقہ ہائے اقوام کے انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ کچھ دنوں تک اشتراکی اصول کے مطابق مزدوروں کی تنظیم کی جاتی رہی۔ مزدوروں کے سیاسی حقوق کے مطالبہ (چارٹزم) کی تحریک میں جن چھپنی کا اظہار کیا گیا تھا وہ اس بات کی علامت تھی کہ مزدوری ہمیشہ طبقے میں ایک جدید احساس پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اس وجہ سے رونما ہوئی کہ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ جس طبقہ پر صنعتی کاروبار کا دارومدار تھا صنعتی ترقی سے اسی طبقہ کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا تھا لیکن کوئی ایسا معیار ذہن میں نہیں آیا تھا جو آہستہ آہستہ پیدا ہونے والے مزدور ہمیشہ افراد کی رہنمائی کر سکتا۔

۱۸۴۸ء میں عوام الناس کی طرف سے تحریکیں جاری نہیں کی گئیں

اور ان کی شکایات کا بذریعہ ادبیات اظہار نہیں ہوا اس وقت تک اشتراکیت کو قوت حاصل نہیں ہوئی لیکن جن طاقتوں سے اشتراکیت کا قالب تیار ہوا تھا وہ نہ تو ادنیٰ تھیں اور نہ انفرادی عقل کی اختراع تھیں۔ ادبیات اور انفرادی عقل سے بھی کچھ فائدہ ہوا تھا لیکن اس سے بدرجہا زیادہ فائدہ مزدوروں نے خفیہ طور پر ایک خیال اتحاد کے قایم ہوجانے سے پہنچا تھا۔

مفاد عامہ کے متعلق اس خیال کا طبقہ دارانہ جماعت کی صورت اختیار کر لینا ایک فطرتی امر تھا لیکن زیادہ تر اس کا اصلی منشاء دوسروں سے مخالفت کرنا نہ تھا بلکہ اس میں گروہ کے اندر ایک زبردست معاشرتی جذبہ پھیلانے کی جدوجہد کی گئی تھی۔ اس کے اظہار کی ضرورت محض اس لئے تھی کہ ایک جدید پیشقدمی کی جائے۔ اور اس کا ظہور ہوا تو فلسفیانہ یا علمی اشتراکیت کی صورت میں۔

علمی اشتراکیت کے مؤیدوں کا زور ۱۸۴۸ء میں اور اس کے بعد کئی سال تک رہا۔ اس زمانہ میں کارل مارکس کا اثر بہت زیادہ وسیع تھا کیونکہ موصوف نے اپنی معرکہ آرا کتاب (سرمایہ داری) میں یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ ارتقاء کے معاشرے میں وہ اشتراکی معیار اسی شکل میں ضرور حاصل ہو کر رہے گا۔ جس صورت میں اس کا خیال اس نے اپنے ذہن میں قایم کیا تھا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح جلد سے جلد اس مدعا کو حاصل کرنے کے تدابیر اختیار کئے جائیں اس کتاب میں صاف طور سے اس انقلابی اصول کا اثر نظر آ سکتا ہے جس کا اظہار تاریخ کے لئے مہیگل اور سٹین

کے لئے ڈارون نے کیا تھا۔ ڈارون نے جب اپنا خیال ظاہر کیا تھا اس کے قبل ہی لوگوں میں یہ نیاجہ بہ پیدا ہو چکا تھا کہ معاشرتی ساخت تغیر پذیر ہو سکتی ہے۔ لوگوں کو اس عظیم انقلاب کی خبر ہو گئی تھی جو طریقہ جاگیرداری اور صنعت پرستی کی دنیا میں واقع ہو چکے تھے۔ اس بات کا احساس عالم پر کیا جانے لگا تھا کہ ان سے بھی زیادہ تغیرات کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک روز انسانوں کے تعلقات باہمی کا ایک سرتاپا جدید نظام قائم ہو جائیگا لیکن بالفاظ نازیبا ڈارون کے ان غیر پختہ اصولوں کی اصلاح جن ان کے سبب سے ہمارا وجود انتخاب قدرت کا ایک انتہائی نتیجہ قرار دیا جانے لگا تھا۔ قدر و قیمت کی اس اخلاقی کسوٹی سے ہو گئی تھی جو اشتراکی ادوار کے مصنفوں کی نظر کے سامنے رہا کرتی تھی۔ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ قدرتی معاملات خود قدرت پر نہیں چھوڑ دیے جاسکتے اور یہ کہ جو لوگ ایسی نگاہ قدرت میں جس میں وحشیانہ طاقت موجود ہو زندہ رہنے کے سب سے زیادہ قابل ہوتے ہیں وہ ایک مہذب انسان کی رائے میں زندہ رہنے کے قابل نہ تھے۔

گویا صعود کو تسلیم کرتے ہوئے اشتراکیت میں دانستہ طور پر اس بات کی حمایت کی گئی تھی کہ انسان کو پیش بینی سے کام لے کر ارتقاء کے قدرتی رفتار میں رد و بدل ضرور کرنا چاہئے۔

لہذا اس سے معلوم ہو گا کہ ابتدائی اشتراکیت میں خواہ وہ ادین کے نقطہ خیال کے مطابق جذباتی اور خواہ مارکس کے حسب منشاء

علمی ہو۔ جو دریافت پچھلے دنوں اجرت پر کام کرنے والے طبقے یعنی غرباء کی ہوئی ہے اس سے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا ہے کہ اس معاشرہ کا منشاء یہ ہے کہ جس قدر دوسری جماعتیں ہیں وہ اس ایک طبقہ کے زیرِ کر دی جائیں۔ اس میں شک نہیں کارل مارکس کا قول تھا کہ اس گروہ کی آخری فتح سب کے لئے یکساں طور پر مفید ہوگی اور اس سے فرقہ بندی کا دستور صفحہ دنیا سے عرف غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ لیکن طریقہ اسے عمل میں فرقہ داری جنگ کو ایک نہایت ممتز اور نمایاں حیثیت حاصل تھی اور فرقہ وارانہ فتح کا حاصل کرنا ابتدائی حامیان اشتراکیت کا نصب العین تھا۔

اشتراکیت ابتدائی میں فرقہ کی بیداری کو جو فوقیت دی گئی ہے وہ بین الاقوامی تاریخ سے صاف ظاہر ہے۔ ایک مزدور پیشہ جماعت تھی جس کی بنیاد ۱۸۶۴ء میں بمقام لندن رکھی گئی اور جس کے پہلے کانگریس کا اجلاس ۱۸۶۶ء میں بہ مقام جنیوا منعقد ہوا۔ اس کے بعد یہ طے پایا کہ زمین اور سلسلہ جات ریل و رسایل پر قبضہ تو حکومت کا ہونا چاہئے مگر ان کا کام مزدوروں کی آغوشیں انجام دیا کریں۔ بذریعہ امداد باہمی کاریگروں کی جماعت کلوں پر قابض ہو جائے سرمایہ داران و درو راواجبی معاوضہ ہضم نہ کر جایا کریں۔ یہاں ہم کو مزید تفصیلات سے غرض نہیں ہے بشرطیکہ ہم یہ امر تسلیم کر لیں کہ کاریگروں کے معاوضہ یا انعام اور دوسری باتوں کے متعلق جو تصور لوگوں کے ذہن میں سما ہوا تھا۔

اس میں اس بات کا ایک مبہم ارمان کام کر رہا تھا کہ صنعت کا ایسا انتظام قائم ہونا چاہئے جو زیادہ معاشرتی ہو۔

باوجودیکہ کارل مارکس نے بین الاقوامی تعلقات قائم کرنے کے لئے عظیم الشان جدوجہد کی مگر ۱۸۴۸ء کے بعد وہ قائم نہ رہ سکا۔ تفرقہ پسندی سے ارکان منقسم ہو گئے جن میں سے بعض واقعی انفرادیت کے حامی تھے۔ ۱۸۸۹ء تک کوئی بین الاقوامی جلسہ نہ ہو سکا حالانکہ اس کے بعد اس قسم کے اجلاس ہوتے رہے۔

بعد ازاں دوسری منزل اس وقت طے ہوئی جب یہ دیکھ لیا گیا کہ لغت جماعت کی نہیں بلکہ دستور کی ہونا چاہئے۔ کارل مارکس کے مانند دیگر اکابرین کو اس بات کا مشاہدہ ہمیشہ ہوا تھا لیکن کثیر التعداد اشخاص ایسے تھے جو لغت تو کسی تنظیم کی کرتے تھے لیکن دراصل انھیں چند مالدار اور دولت مند افراد سے ذاتی عداوت ہو جاتی تھی۔

اشتراکی معیار میں تبدیلی بدرجہ ہومی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ فرقہ داری جنگ بے سود ہے۔ اور یہ کہ بخلاف متقابل اشتراک و اتحاد کے متعلق خواہ کوئی بھی تصور قائم کیا جائے۔ سب کی تہ میں یہ مدعا موجود ہے کہ ہر شخص کے افعال پر تمام گروہ کی نگرانی یا بالآخر ہونا چاہئے اشتراکیت میں بھی دوسرے معیاروں کے مانکنہ نوڈ کے ساتھ تغیر واقع ہوا کیونکہ اس کے بانیوں کو پہلے سے یہ خبر تھی کہ ان کے تجاویز میں آئندہ جھلکچیاں واقع ہو جائیں گی۔ وہ اس کی پیش منی ہی نہ کر سکے تھے اشتراکیت کا جوں

نہود ہوا۔ اسی قدر اس میں نشانیں پھوٹتی گئیں اور وہ نشانیں حریت یا نظام سے مختلف نہ تھیں۔ مختلف زبانوں اور ایک ہی وقت کی مختلف جماعتوں میں قسم قسم کی اشد اور فوری ضروریات پیدا ہوتی رہتی ہیں اسی لئے معیاروں کے مختلف اجزا کی داد دینا سب سے گنتی ہے۔ اس طرح جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ جرمنی کی اشتراکیت میں ایسی چیزوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے جن کو انگلستان کے آزاد خیال اصحاب مسلمہ سمجھتے ہیں۔ علاوہ بریں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اشتراکیوں کا مطالبہ انگلستان سے بھی زیادہ ہے۔ معیاروں میں اختلاف پیدا ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ ضرورتیں مختلف قسم کی ہوا کرتی ہیں لیکن کم و بیش سب تذبذب العین ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔

لہذا اب یہ واضح ہو گیا کہ حالانکہ اشتراکیت کی تصریح و تعریف بھی ہمیں اس وجہ سے مشکل ہے کہ یہ فی الحال مستقل نہیں ہے۔ صرف لوگوں کا دل اس کی طرف زیادہ مائل و راغب ہوتا جاتا ہے۔ مگر یہ ایک اساسی سیاسی کرشمہ قدرت ہے جسے اچھی طرح تمیز کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مختلف ملکوں میں اشتراک پسندوں کے منصوبے یکساں ہوں اور آپس میں اختلاف واقع ہو کیونکہ جن خرابیوں کی مخالفت کی جاتی ہے وہی مختلف الاقسام میں مگر معیار سب جگہ ایک ہے تنظیم کے مسئلے سے قطع نظر کرتے ہوئے انتہائی صورت میں اس معیار کا مدعا یہ ہے کہ مزدوری سے جو منافع ہو اس کی تقسیم موجودہ حالت کے مقابلے میں اور بھی زیادہ مساوات کے ساتھ ہونا چاہئے۔ مگر اس تشریح سے اس معیار کے اقتصادي پہلو کا اظہار ہوتا ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا

نشانہ ہے کہ دولت کے عالم یا معاشرتی ذرائع اس طریقہ سے تسلیم کئے جائیں کہ وہ معاشرے کے زیادہ کام آئیں یعنی اس کی تقسیم جماعت میں زیادہ پیمانہ پر ہو۔ اس لئے ہم یہاں ان طریقوں پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ جن کی حمایت اشتراکی حکومت اشتراکی تجارت یا انتظامات میں کی جاتی ہے لیکن وہ انتہائی معیار جو ان سب چیزوں میں یکساں ہے آجکل ذکور وانات کی ایک بڑی تعداد کے لئے ایک قوت محرکہ کا کام کر رہا ہے ان لوگوں کا کسی طرح بھی تمام تر ان معنوں کے مطابق غیور پیوں میں شمار نہیں ہو سکتا جو کارل مارکس نے لفظ ”غیرب“ کے سمجھے تھے۔ نہ اب اس معیار کا یہ نشانہ ہے کہ جسمانی مشقت کے بالمقابل ملنے محنت کی کسی طرح بھی کم وقعتی کی جائے۔

اب رہا یہ امر کہ آخر زندگی کا انتہائی معیار کیا ہونا چاہئے اس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ولیم مارکس کے تصانیف غالباً ابھی تک مستند نہیں ہیں حالانکہ ان میں اشتراکیت کی حمایت کی گئی ہے۔ مگر وہ حد سے زیادہ بے معنی ہیں اور تفصیل میں جو باتیں تحریر کی گئی ہیں وہ اس قدر ناقابل عمل ہیں کہ پر اثر طریقے سے ان باتوں کو ظاہر نہیں کرتیں جن کا مطالبہ حامیان اشتراک کی جانب سے ہوتا رہتا ہے۔ ”جان بال کا خواب“ اور ”نہیں گی بھی خبریں“ میں اشتراکی معیار کا اس قدر وضاحت کے ساتھ اظہار نہیں ہوتا جس قدر ایٹھنر کے معیار کا پرکھینے کی تقریروں میں ہوتا ہے۔ لیکن آجکل خیالی دنیا میں ”ابو“ نہیں ہیں۔ ہر شخص کو مدعا ہے غائی کا یہ صحیح بیان ان کتابوں میں مل سکتا ہے جو مسٹر وٹسن کے غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ موصوف نے اپنے تصانیف میں نہایت

بسیط شرح سے اس معیار پر بحث کی ہے اس لئے اب یہاں صرف اس کی عام خصوصیتوں کا ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اپنے موجودہ معاشرے کے ساتھ مقابلہ کرنے سے معلوم ہونا ہے کہ جو چیز ہمیں مطلوب ہے وہ زیادہ با ترتیب اور بالانتظام ہوگی۔ زندگی اور شہادت ان دونوں چیزوں کی بربادی کی روک تھام اور ان کے بجائے ایک باقاعدہ منظم نظام حکومت رائج ہونا چاہئے۔ جس میں ہر شخص کی ترقی کا مساوی موقع حاصل ہو۔ یہ خیال کہیں نہیں کیا گیا ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔ کیونکہ مواقع اور امکانات میں مساوات صرف اس لئے مقرر کی جاتی ہے کہ امتحان یا یہ معلوم ہو جائے کہ ہم میں سے کون اتنی صواب دہ سے زیادہ اچھے ہیں لہذا اشتراکی ملکیت میں عقلمند اور ذہین لوگوں کا غلبہ ہوگا۔ صرف وہی لوگ عہدہ سنبھالیں گے جو مہارت رکھتے ہیں۔ وہی لوگ خانگی مشینہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے ذریعہ سے سامان زندگی کی تقسیم زیادہ مناسب طریقہ سے کی جاسکے گی کیونکہ سب نسب کا سوال کسی کی راہ میں ایسی حالت سے سوا اور کبھی حاصل نہ ہوگا جس میں حسب نسب کے سبب سے شور یا ذہن میں فطری نقص واقع ہو جاتا ہے۔

اشتراکیت کے متعلق جو تصور باندھا گیا ہے اس میں نیا ہر قیود و شرائط موجود ہیں لیکن یہ حدود خود اس کے نہیں ہیں۔ بہر حال ایک بات یہ دیکھی گئی کہ معیار اشتراکیت کے بارے میں خامہ فرسائی کرتے وقت مصنف بدراہن فراسات کی ضرورت سے زیادہ تعریف کر بیٹھتے ہیں معاشرے کی موجود

بناوٹ کے نقائص محسوس کرنے والے اکثر ایسے اشخاص ہوتے ہیں جو آفاقاً طبیعت کی قدر و قیمت بہت بڑھا کر بیان کیا کرتے ہیں ہماری کھلوں کی ترقی سے وہ محصور ہو جاتے ہیں ان کو وہ زیادہ پیچیدہ اور غالباً زیادہ لطیف صفات نہیں نظر آتے ہیں جن کا تعلق فنون سے ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ مجہول وصول کنندہ یا مری کے ہنر سندانہ جذبات کو تعارت سے دیکھتے ہیں حق بجانب میں لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ حکومت و عملداری کی حد تک کمال و مہارت کی آزمائش زیادہ تر باقاعدہ ہونا چاہئے علم سے انسانوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا ہے ہنر کی بدولت علم سے بھی زیادہ فائدہ حاصل ہوا ہے۔ حکومت کا کام اگر ایک طرف علم میں شمار کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اسکو ایک ہنر بھی تصور کرنا چاہئے۔

اس خیال کے ساتھ اس طرف درمی کا بھی ذکر کر دینا مناسب ہے جو اشتراکیت یعنی کے علاوہ اور ہر قسم کی اشتراکیت میں دستی مشقت کے متعلق کی جاتی ہے۔ جب مشقت یعنی مزدوری کے معاوضہ کے سوال پر غور کیا جاتا ہے تو اس وقت اس دماغی محنت کا بہت کم خیال کیا جاتا ہے جو تنظیم کے معاملہ میں صرف ہوتی ہے اور تحقیقات خالص تنظیم میں جو محنت کی جاتی ہے اس کا تو ذرا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ صبی جماعت کے اشتراکیت کے رسالوں میں ان ضعیف الاعتقادیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ابتدائی عملی اشتراکیت میں تھیں۔ اس میں بہت خیالی پلاؤ پکایا گیا ہے جو کم و بیش کارآمد ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آجکل یہ خواہش زوروں پر ہے کہ اصلی

معاشرتی احساس اور دولت کا پُر اثر اور کار آمد استعمال زیادہ ہونا چاہئے۔

کارل مارکس کی اشتراکیت

حالانکہ زمانہ حال میں اشتراکیت کے بابت بہت کچھ ادبی ذخیرہ شائع ہو چکا ہے مگر کارل مارکس کی معرکہ آرا تصنیف میں اشتراک کی معیار کی نہایت سخت تشریح کی گئی ہے تاریخ کے متعلق جو کچھ خیال کارل مارکس کا ہے وہ بہت محدود ہے۔ تاریخی انقلابات کے بارے میں جو کچھ موصوف نے ذکر کیا ہے وہ اپنی سادگی میں بگھل کے خیالات سے ملتا جلتا ہے۔ کارل نے ترون و سٹی کی تجدید کی ہے جو شجاعت پسند اصحاب کا زمانہ تھا۔ اس کی غیر نیچہ مبالغہ آمیز نوٹوں اس کے پیروں میں لیکن ان محققانہ کتابوں کی طرح جن کو ہم نے ابوالکشمیہ میں معیاروں کی شرح قرار دیا ہے کارل مارکس کی تصنیف ”نثریہ داری“ عظیم ترین کتاب قائم رہتی ہے۔

کارل مارکس نے رہنمائی کرنے والے قصور انتہائی کے متعلق یوں خاص فرمائی کی ہے۔ ”اُدو ایسے آزاد افراد کی حمایت کی ایک تصویر کھینچیں جو عام ذرائع پیداوار سے کام لے رہے ہوں جس میں مختلف افراد کی محنت کرنے کی طاقت سمجھ بوجھ کر تمام جماعت کی مشترکہ محنت کرنے کی طاقت کی حیثیت سے کام میں لائی جاتی ہے۔ ہمارے گردہ کی مجموعی پیداوار اشتراک کی پیداوار ہے ایک حصہ پیداوار کے تازہ وسیلے کی صورت سے کام میں آتا ہے اور وہ اشتراک کی

ہوتا ہے لیکن دوسرے حصے کو ارکان جماعت وسیلہ پرورش قرار دے کر استعمال کرتے ہیں۔ جماعت کی تنظیم جہاں تک نتیجہ نیز ہوگی اور پیدا کرنے والوں کی جس قدر تاریخی ترقی ہوگی اسی قدر یہ نظام زیادہ مختلف ہوگا جس کتاب کا زیادہ حصہ ایک شرح واقعات ہے جو موجودہ حالات کے نقائص ان قوتوں کو ظاہر کرنے کے لئے کی گئی ہے جس سے موجودہ طریقہ خواہ مخواہ محولہ بالا معیار میں تبدیل ہو جائے گا۔ تجارتی ساخت کی جماعت کے وسائل پیداوار انسان پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ بہت سے آدمیوں کے قبضے سے جائیداد نکال لی جاتی ہے مزدور پانی پانی کو محتاج ہو جاتے ہیں۔

سرمایہ داری پھر انفرادی سرمایہ داروں کو بے جائیداد بنا دیتی ہے اور اس طرز سے ایک سرمایہ دار کے ہاتھوں سے دوسرے سرمایہ دار ہلاک ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ کے ایک شخص کے قبضے میں رہنے سے پیداوار کے طریقے محدود ہو جاتے ہیں۔ مزدوروں کو کارخانوں میں اشتراک و اتحاد کی تعلیم دی جاتی ہے آخر کار وہ بغاوت کر کے اپنے ذاتی مفاد کیلئے اشتراک کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ تاجروں کی پیداوار خود انھیں کی تباہی کا باعث ہو جاتی ہے ان کا زوال اور غربا کی فتح دونوں مساوی طور پر ناگزیر ہیں۔ بالآخر ایک ایسی جماعت تسلیم ہوگی جس میں فرقہ داری باہمی کشمکش غنقا ہو جائے گی اور معاشرتی فلاح کے لئے متحد و متفق ہو کر کارروائی کی جایا کرے گی۔

معیار کی موجودہ نشتر

ہم نے اجمالاً اس معیار کے متعلق مارکس کے خیالات سطور بالا میں قلمبند کئے ہیں۔ اس کے خاص پہلوؤں سے تمام موجودہ اشتراکیوں کے حقوق عام معیار کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے تین مقومات پیدا ہو جاتے ہیں (۱) قابل انسداد کون تھے ہے (۲) انسداد کا طریقہ کیا ہے (۳) اور اس کا نعم البدل کیا ہے۔

انسداد طلب جو طریقہ ہے وہ سرمایہ داری ہے افراد کے تعلقات باہمی کی ترتیب وہ چیز ہے جسکی بدولت کسی چھوٹی سی جماعت کو تمام دولت سرمایہ سے حاصل ہوتی ہے۔ سرمایہ کے انسداد کی کلفت کوئی شخص نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کا یہ منشا ہو جائے گا کہ اپنے ہمجنسوں کے فلاح وہ ہر دو میں انسان جو حصہ لیتا ہے وہی منفقو د ہو جائے گا۔ سرمایہ ایک ضروری۔ قدرتی اور انتہا درجہ کے اشتراکی کی نگاہ میں ایک قابل قدر قوت ہے۔ مخالفت جس چیز کی کی جاتی ہے وہ ہے سرمایہ داری یعنی مصرف سرمایہ کا یاد آئین جو ایک چھوٹا طبقہ استعمال کرتا ہے۔

اس کے انسداد کے لئے دو قوتیں کام کر رہی ہیں (۱) نشتر کا مرکز رکھنا اور ایسے بڑے بڑے کاروباروں کو وجود میں لانا جو

تمام جماعت کے لئے مقصود ہوں خواہ اس کے مالک معدوم ہے چند
اشخاص ہوں (۲) مشترکہ کام کرنے کے لئے انسانوں کی تنظیم وہ کام
خواہ کسی چیز کی ساخت میں اس کا ایک جزو یا حصہ تیار کرنا ہو خواہ کسی
خاص تجارت کے اغراض کے لئے محض گفت و شنید کرنا لہذا معاشرہ
کے ارتقا میں مختلف قسم کے امور کے متعلق کار آمد فیصلہ صادر کرنا معاشرہ
اشترکیت کا منشا ہے۔ لوگوں کا میلان طبع ایک طرف تو اشتراک اور اتحاد
کی جانب ہے اور دوسری جانب وہ ذاتی یا جداگانہ ملکیت پسند کرتے ہیں اس لئے
اول الذکر رجحان طبع کو ترقی کن قرار دینا چاہئے گویا موجودہ زمانہ کی اصلی
حالت کے لحاظ سے ایک حامی اشترکیت کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذاتی
معیار کے پائیکمیل پر پہنچنے کا آغاز ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ضروری
نہیں ہے کہ انسانوں کے عمل کے بغیر قدرتی طاقتوں کے دریعہ سے جدید
قسم کی جماعت وجود میں آ ہی جائے گی۔

لوگوں کو جس بات کی طلب ہے اس کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے یعنی
وہ جماعت کی ایک ایسی حالت ہے جس میں فراہمی دولت کے معاشرتی اسباب
کے نتائج بھی اقتصادی ہونا چاہئے۔ یعنی جماعت سے اگر ایک طرف فراہمی
دولت کے وسائل مہیا ہوتے ہیں تو دوسری طرف دولت حاصل ہو جانے
کے بعد اس سے تمام معاشرہ کو فائدہ پہنچنا چاہئے۔ بخلاف اس کے زمانہ
موجودہ میں معاشرتی اسباب سے دولت تو فراہم ہو جاتی ہے مگر غلط اور
لغو طریقوں سے لوگ اس کو جدا کر کے ایک نہایت تنگ حلقے میں بے تقوین

جس سے اس دایرے کی ترقی میں بھی پیچیدگی اور ہرج و مرج واقع ہونے لگتا ہو اور بڑے بڑے طبقوں کو ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچتا وہ بیچائے محتاج اور نادار ہی بنے رہتے ہیں۔ لہذا ہم کو ایک ایسی جماعت کا تصور کرنا چاہئے جس میں دولت کے بہرہ مندوں پر کل اشخاص کو رسائی ہو سکے اور یہ اس طرح سے حاصل کی جائے جس سے تمام جماعت یکساں طور پر مستفید ہو۔ اس کے نیچے بچے کو اس دولت سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہوتا کہ جماعت زیادہ دولت فراہم کرنے کے قابل بن جائے۔ جہاں تک انفرادیت کا منشا یہ ہے کہ ہر شخص کو آزادی صعود حاصل ہونا چاہئے اس کے ساتھ مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معیار اشتراکیت کا یہ مقصد ہے کہ ہر شخص کو اس گروہ کے فائدے کے لئے جس کا کہ وہ رکن ہے ایسا کام کرنے کا موقع دیا جائے گا جو وہ بخوبی انجام دے سکتا ہو۔ دونوں کا نقطہ خیال جدا جدا ہے مگر مدعا ایک ہے۔

دقیقہ سنجی

لیکن یہ نصب العین خواہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو مکمل چینی کے طور پر اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ اظہار خیال ضروری ہے کیونکہ دوسرے معیاروں کی طرح اس میں بھی قیود و تقاضاں موجود ہیں اور اس کے اظہار میں اکثر نہایت ضعیف الاعتقادی سے کام لیا جاتا ہے۔

ہم ان انتہا درجہ کی خرابیوں کو تسلیم کرنے سے انکار سن کر تے جن کی وجہ سے دنیا میں معیار اشتراکیت کا ظہور ہوا ہے۔ نہ ہم اس بات کے ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ ان خرابیوں کا علاج صرف یہی ہے کہ جو اقتصادی اور سیاسی تنظیم رائج ہے اس کے بجائے کوئی دوسرا نظام قائم کر دیا جائے ممکن ہے کہ ہم کو یہ کارروائیاں اختیار کرنا پڑیں لیکن اس حالت میں بھی یہ سوال غور طلب باقی رہ جاتا ہے کہ آخر کونسا نیا طرز موجودہ طریقے سے بہتر ہوگا۔ موجودہ معیار اشتراکیت سے اس مسئلہ کا کافی حل نہیں ہو سکا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اشتراکیت میں الاقوامی میں زائر انقلاب فرانس کے ارباب فہم کے حب الانسان کی جھلک نظر آتی ہے۔ جماعتوں کے وجود کا اس میں ذرا کبھی خیال نہیں کیا جاتا۔ خاندان۔ مملکت یا کسی جماعتی فرقہ کے بہ مقابلہ اس میں ایک فرد کی حیثیت اور اس کا وجود زیادہ برتر اور بلند سمجھا جاتا ہے لیکن اس قسم کے گروہ معلوم ہوتا ہے کہ قدرتی ہوتے ہیں یہ ان قدرتی طاقتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جو محالیت نیم آگاہی کئی نسلوں کے اخلاقی فیصلوں کے زیر اثر اپنا کام کرتی ہیں مگر اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ اس وجہ سے ان پر تنقید کی ہی نہیں جاسکتی۔ البتہ جو نکتہ چینی ان کے متعلق کی جائے گی وہ اس نکتہ سنجی کے بہ مقابلہ کم غیر سنجہ ہوگی جو اشتراکیوں میں رائج ہے۔ تمام عالم سے غیر صوری محبت کے خیال کی وجہ سے اشتراکیوں کے نظام عمل کی کامیابی میں بڑا ہرج ہوتا رہا ہے کیونکہ ایک اوسط درجہ کے انسانوں کو نیم سیمپارسی کی حالت میں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جس

جماعت سے اس کا تعلق ہے وہ اس کا وجود کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ خواہ آخر میں اس کے نیز اور تمام انسانوں کے عام مفادات ایک ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

منسلی اور روایتی (قومی) امتیاز محض قدرتی انتخاب ہی سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے وجود میں اخلاقی اثر کا بھی بہت کچھ حصہ ہے اور اس کا وجود ایک اچھی بات ہے۔ اسی طرح قانون اور حکومت و مملکت کے بھی امتیازات ہوتے ہیں۔ اور ان کے وجود سے بھی فائدہ ہوتا رہا ہے۔ نیز اس زمانہ میں بھی ان کی ہستی مفید اور کار آمد ہے۔

فی السامال اتنا تو وہ تسلیم ہی کریں گے جنہوں نے اشتراکیت پرکتا میں تصنیف کی ہیں لیکن اس کے علاوہ ہیں یہ بھی کہنا چاہئے کہ خاندانی اور جماعتی فرقہ کے متعلق بھی معاملہ بحث ایسا ہی ہے۔ صرف یہی بات نہیں ہے کہ وہ محض اسلاف کے اخلاقی اثر اور قدرتی طاقت کے سبب سے ظہور پذیر ہوتے ہیں بلکہ دنیا میں ان کا وجود ضروری ہے کیونکہ اس سے بہت کام نکلتا اور فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ بحیثیت امتیازات الفاظ ”اعلیٰ اور ادنیٰ“ بہت بھدے ہیں لیکن یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ یا لطیف چسپی رکھنے والے طبقوں کا وجود دنیا میں ہونا چاہئے۔ خواہ اس سے ذاتی سرمایہ کی ہستی معدوم ہی کیوں نہ ہو جائے جس کے ساتھ کوئی خرابی ضرور رہا کرتی ہے۔ اب آخری غور طلب سوال یہ ہے کہ کس نظام سے کس قدر فائدہ حاصل ہوتا اور کس قدر نقصان پہنچتا ہے یہ کوئی بھی فرض نہیں کر سکتا کہ کسی نظام

میں سراسر خوبیاں ہی ہوتی ہیں۔ بعض تنظیم سرتاپا مذموم ہی ہوتی ہے۔
 اس کے علاوہ جیسا کہ ہر قسم کی حکومتی اشتراکیت کے خلاف کہا جاتا
 ہے موجودہ نظام کی پیچیدگی اور مختلف الاقسامی کو خرابی سمجھ کر دفعتاً خارج از
 بحث نہیں کر دینا چاہئے

انتشار باہمی سے قیام تہذیب میں بڑا ہرج واقع ہوتا ہے لیکن اس
 طریقہ سے معاشرتی صعود کے لئے قدرت جو سامان با افراط مہیا کر دیتی ہے
 اس کو اگر انسان سہل بنانا چاہتا ہے تو اس تصویر میں بڑی دقت ہو جاتی
 ہے۔ اگرچہ افراط اقتصادیات کے منافی بھی ہوتا ہم نکل ہے کہ اختلاف کی
 وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے اس کا برداشت کرنا زیادہ مناسب ہو لیکن یہ
 امر واضح نہیں ہوا ہے کہ خیالات مقامی اور مقابلہ یہ دونوں باتیں مضرت ثابت
 ہوئی ہیں یا نہیں۔ اس بات کا کوئی ثبوت پایا نہیں جاتا کہ ضرر پہونچ رہا
 کیونکہ اس وقت تک کسی قدر اشتراک و اتحاد موجود بھی ہے اور ممکن ہے کہ جس
 آسانی سے ہم نقصان کا باعث مقابلہ کو قرار دیتے ہیں اس قدر سہولت
 کے ساتھ ہم اشتراک و اتحاد کو اس نقصان کا ذمہ دار قرار دے سکیں۔

علاوہ ازیں تمام وسائل پیداوار پر مملکت کا قبضہ ہو جانے سے جو اعلیٰ
 نمونہ کی تنظیم جامعیت کی قائم ہو جاتی ہے اس کا منشا یہ ہے کہ ایک ایسا
 عظیم نشان فرقہ تیار ہو جائے جس کو کسی قسم کا مقابلہ کرنے کا اندیشہ نہ ہو ہمیں
 ذرا بھی خبر نہیں ہے کہ معیار اشتراکیت کے پائیکسیل پر پہونچ جانیسے حکام
 کے طور و طریق میں کیا فرق واقع ہو سکتا ہے لیکن ہمارے موجودہ نقطہ نظر کے

مطابق حکام کی تعداد میں کس قسم کا اضافہ ہمیشہ مشتبہ نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ اگر معاشرت کی ایک مرتبہ تنظیم ہو جائے اس میں پھر کوئی رد و بدل کی ضرورت نہ رہے تو شاید اعمال مملکت ہی شروع سے آخر تک کار آمد اور مفید ثابت ہوں۔ اگر اشتراکیت کے ظہور پذیر ہونے کے وقت تک بھی تاریخ کا خاتمہ نہیں ہو چکا ہے۔ تو ہم ضرور ان ملازموں کے تابع و مطیع ہو جائیں گے جن کو ہم نے مقرر کیا ہے محض اسی وجہ سے حکام کسی قسم کے مزید رد و بدل کے خلاف ہوں گے۔

ہم اپنی قوم کے بہترین افراد اور معاشرت کی منظم قوت اس فرقہ کے سپرد کریں گے۔ اس طریقہ سے جو دائرہ حکومت بنے گا وہ اس قدر خود سر ہو گا کہ اس کے خلاف بغاوت کرنا شخصی مطلق العنانی یا مملکت کے خلاف سرکشی کرے بھی زیادہ دشوار ہو جائے گا۔ مل کی اسی دلیل میں ابھی تک عہد کی موجود ہے کہ ”اگر کسی ایسے معاشرے کے کاروبار کا ہر حصہ جس کے لئے وسیع اور اعلیٰ پیمانہ پر تنظیم اتحاد کی ضرورت ہے مملکت کے یہ قدرت میں ہو اور اگر حکومت کی جائیدادیں عموماً قابل ترین اشخاص سے پر ہوتی ہیں تو ان لوگوں کے سوا جو شب و روز معاملات پر غور و فکر کرنے ہی میں مصروف رہتے ہیں اور کسی دوسرے کام سے واسطہ نہیں رکھتے تو ملک کے تمام شائستہ اور با عمل ارباب دانش کے سرگوز ہو جانے سے ایک دقتی عہد ارسی قائم ہو جائے گی۔ باقی تمام حالت کو کل معاملات میں اسی حکومت کا منہ ٹاکنہ پڑے گا۔ عموماً ہر شخص اپنے اپنے کاموں میں اس حکومت سے ہدایت کا طلب گار ہو گا۔ ذی حوصلہ اور قابل اپنی ذاتی

ترقی کے لئے اس کے دست نگر رہیں گے۔ علاوہ بریں یہ حکام نظام و آداب کے اس قدر غلام ہو جائیں گے جس قدر محکوم حکام کے ہوتے ہیں۔ گویا مہذب حکومت ایک سخت گیر جنگی جماعت میں تبدیل ہو جائے گی جس کی غرض فکرن ہے کہ جنگ و جدل نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کی بندش آئندہ ترقی پر عائد کر دیں گی اب رہی تجارتی اشتراکیت جس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور جس میں جماعتی افعال کا دار و مدار امتیازات پیشہ پر ہوتا ہے اس سے جو خطرناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں ان کا حال قرون وسطیٰ کی تجارتی انجمنوں کی تاریخ سے معلوم ہو سکتا ہے یہ انجمنیں اول تمام گروہ کی فلاح و بہبود کے لئے قائم ہوئی تھیں مگر آخر میں ذاتی مقاصد کی تکمیل کر کے اور اپنے طریقوں سے کسی کو مقابلہ کا موقع نہ دے کر انھوں نے شہروں کو تباہ کر دیا جہاں ان کا بڑا زور تھا۔ اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک انگریز کی دلچسپیاں بھی محض اس وجہ سے وہی ہوں جو کسی باشندہ فرانس کی ہوتی ہیں کہ وہ دونوں پاپوش سازی کا کام کرتے ہیں۔ جو مصنوعی سادگی تنظیم کے متعلق ہر عمل کا ایک کمزور عنصر ہوتی ہے وہی اس جگہ بھی جوڑ ہے یہ اس وقت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ جب حامیان نظامیت کے حسب خیال ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ نظام کی از سر نو تنظیم کے لئے سبب پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فہم و فراست کے بہ مقابلہ ذہنی دانش اور ہدایت عجمی سے انسان کی زیادہ بہنمائی ہوتی ہے۔

جو لوگ خود کو اشتراکیت پسندوں میں شمار کرتے ہیں ان کو اس قسم کی اور اس کے علاوہ اور بھی نکتہ چیننیوں کی خبر پہلے ہی سے معلوم ہو گئی تھی۔

انہوں نے اس کا جواب بھی دیا ہے۔ اشتراکیت خود بھی اپنا جامہ اس قدر سرعت کے ساتھ تبدیل کر رہی تھی کہ واقعی وہ زمانہ بہت جلد آجائے گا جس میں قسم کی نکتہ سنجیاں بیکار ثابت ہوں گی۔ بہر حال ہم جو اعتراض کریں گے وہ اس خیال سے نہیں ہوگا کہ جو غلطی اشتراکیت میں سرزد ہوئی ہے وہ قطعاً ثابت ہی ہو جائے گی بلکہ اس تنقید سے ہیں یہ دیکھنا منظور ہے کہ معیار اشتراکیت میں کمزوریاں موجود ہیں لوگوں میں زیادہ معاشرتی احساس کا پیدا ہو جانا اور جماعتی فعل کے نتائج کا جماعت میں استعمال کیا جانا ان دونوں باتوں کے بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا جاسکتا ہے جس سے انفرادی اور معاشرتی تفریق کہ نقصان پہونچتا ہے۔ ماسوائے آنکہ یہ واقعہ بھی ہماری نظر سے اوجھل ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کی ذہنت خالص میں ایک ایسا ناقابل تقسم اور امتیازی جزو موجود ہے جس کو پامال کرنے یا ماتحت رکھنے کے بجائے ترقی دینا عین مدعا ہے۔

اگر ہمارے دماغ میں کوئی ایسا معیار آجائے جو انفرادیت اور اشتراکیت دونوں کے نقطہ خیال سے موافقت رکھتا ہو یعنی جس سے دونوں مقصد برآی ہو سکے تو اکثر ارباب فہم کی نگاہوں میں وہ نصب العین مفید اور کار آمد ثابت ہوگا۔ کیونکہ اگر ایک طرف ہم خود غرضی اور تنہا پسندی پر مائل ہوتے ہیں تو دوسری طرف ہم کو جماعت عظیم کی پیچیدگیوں میں ہی اپنی ذاتی حیثیت سے ہاتھ دھو لینا پڑتا ہے۔ معاشرہ ایک کلیہ منظم ہوتا ہے۔ ایک درخت میں پتیوں اور جڑوں کے مساوات کی صورت

تمام درخت کی صحت قائم رہتی ہے بجنسہ یہی حال معاشرے کا بھی ہے جو ایسے جداگانہ افراد کے بغیر سرتاپا تنزل کا شکار ہو جاتی ہے جسکی شکل ارتقاء اور مختلف النوع ارتقاء ہو چکی ہے یہ تنزل ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ اس کے اجزائے مشمولہ کا دار و مدار یکجانہ رہنے سے ہو جاتا ہے۔ تفریق افراد میں اس کی جداگانہ ہستی قائم رکھنے کے لئے اگر حامیان انفرادیت زور دینے میں قہرہ حق بجانب ہیں۔ اسی طرح اگر ایک اشتراک پسند تمام افراد کے عام اغراض ہونے پر زور دیتا ہے تو اس کا خیال بھی درست ہے کیونکہ ہر شخص کی شکل ترقی اس وقت ممکن ہے جب وہ کل جماعت کے قیام و قرار میں اپنے فرائض کو انجام دیتا رہے گا۔

گویا اشتراکیت میں ایک زندہ سیاسی معیار کی تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ جو لوگ اشتراک کا دم بھرتے ہیں ان کے طبقے کے حدود کے باہر بھی یہ معیار کارآمد ہے۔ ہر قسم کی نکتہ چینی اور اپنے مؤیدوں کے منصوبوں کی مسلہ ناکامی کے بعد بھی یہ معیار قائم رہا۔

جو وسائل اول کسی مقصد کی تکمیل کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں ان کے ناکام ثابت ہو جانے کے بعد بھی وہ مقصد بہ شکل امید قائم رہتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے نصب العین کی طرح یہ معیار بھی کسی ضرورت کے سبب پیدا ہوا لوگوں کو کسی ایسی چیز کا مشاہدہ ہوا ہے جو واقعی موجود اور قابل صعود ہے اس مشاہدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ معیار ظہور میں آگیا۔ دوسرے معیاروں کی طرح اگر معیار کی بناوٹ بھی اس کی خامیاں ثابت ہو جائیں گی کیونکہ

ضروریات انسانی کا دفعیہ ایک ہی چیز سے نہیں ہوتا ہے۔ جو شاندار معیار
 ابھی ہم اپنے ذہن میں قائم کر سکتے ہیں اس کی تکمیل کے بعد اور بھی متعدد
 نصب العین پیدا ہو جائیں گے۔

بارھواں باب

جمہوریت

جمہوریت ابھی حال نہیں ہی ہے

یہ ہے میاں لوگوں کا جو ایسے گردہوں کی منتظم جماعت بنانا چاہتے ہیں جن کا انحصار ایک دوسرے پر ہو اور جس میں ہر شخص کو اپنی بہترین طاقتوں کو نشوونما کا موقع حاصل ہو۔ اس قسم کا معاشرہ دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے انگلستان۔ فرانس اور ریاستہائے متحدہ (امریکہ) جمہوریت کے لئے مشہور ہیں۔ مگر ان ممالک کی تنظیم بھی ایسی نہیں ہے جس کے دلدادگان حریت خواہان رہا کرتے ہیں۔ البتہ ان ملکوں میں دوسرے ملکوں کے بہ مقابلہ جمہوریت

کامیاب کسی قدر زیادہ غالب ہے لیکن ان ملکوں میں اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے اور اس کے قائم ہو جانے کے امکانات بھی نظر آتے ہیں۔ ان ملکوں میں ایک متغیر اور بعض اوقات ایک مکمل جمہوری نگرانی معاملات حکومت میں رہتی ہو دوسرے دیا دے مقابلہ میں یہاں زیادہ انسانوں کو اپنے بہترین اوصاف کے نشو و نما کا موقع ملتا ہے لیکن صفحہ ہستی پر جس قدر بھی ممالک موجود ہیں انہیں سے کسی میں بھی جمہوریت قائم نہیں ہوئی۔

جن ظاہری واقعات اور رجحانات کا تجربہ پہلے ہو چکا ہے اس میں اس معیار کی بنیاد قائم ہے۔ اس کی ابتداء اس مشاہدہ سے ہوئی کہ معاشرتی عضویت میں بکثرت اشتیاق اپنی اپنی عمدہ ترین قوتوں کا ارتقاء نہیں کر پاتے ہیں۔

جمہوریت کے معنی

لفظ ”جمہوریت“ کی ترکیب بڑے مغسوس واقعات پر مبنی ہے اس کے اشتقاق سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ سیاسی معیار کی حیثیت سے اس کے کیا معنی ہیں۔ مخالفان انقلاب کا تجربہ ہے کہ اس لفظ کا استعمال تقریباً ہر معنی میں کیا گیا ہے لیکن ہم اس کا اقرار صرف اسی معنی میں کریں گے جس میں وہ لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں۔ جن کے دل میں اس معیار سے ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے لئے تحریک ہوتی ہے۔ بظاہر غیر معروف اور جاہل علوم انسانی

کی حکومت کو جمہوریت کہتے ہیں۔ اگر یہ کہہ بھی دیا جائے کہ اس کا مطلب انہو کی حکمرانی نہیں ہے پھر بھی اس کے اکثر موندوں اور شدید انکوں کا خیال ہے کہ دوسری قسم کی معاشرتی تنظیموں سے جمہوریت کا امتیاز اس گروہ کی تعداد اور ان کے اعتبار سے کیا جائے گا جو اس کے طرز عمل کے نگران ہوں گے اگر جمہوریت کے معنی وہی ہیں جو اوپر بتائے گئے ہیں تو کوئی معقول پسند انسان جمہوریت کی حمایت نہ کرے گا۔ نفس مطلب کا خیال کئے بغیر عنوان شمار کر کے شاید انسان کامیابی کے ساتھ جریدہ نویسی تو کر سکے لیکن اس سے ہمیشہ دماغ میں ایک سیاسی خفہ پیدا ہو جائے گا۔ اس خیال کے مطابق تو بھڑوں کا گلہ بھی ایک مکمل جمہور ہو سکتا ہے لیکن اگر اکثریت نے خود سرانہ حکومت کا دور دورہ شروع کر دیا تو اس سے ایک ایسی حکمرانی قائم ہو جائے گی جس کے احکام کی تعمیل جمہوریت میں داخل ہوگی لیکن یہ سراسر لغو ہے۔ محض یہ دریافت کر لینے سے جمہوریت کا پتہ نہیں چل سکتا کہ جمہور میں کتنے آدمیوں کو سیاسی قوت حاصل ہے لیکن اگر یہ بھی نہیں تو پھر وہ کون کسوں سے جس سے ہم ایک جمہور ہی اور دوسرے غیر جمہور ہی معاشرے کے مابین امتیاز کر سکتے ہیں۔ جمہوریت کا اندازہ تو ان ارکان جمہور کی صفت یا امتیازی خصوصیت کے اعتبار سے ہو سکتا ہے جن کا اثر اس جماعت کی تنظیم اور اصول عمل پر غالب ہوتا ہے اگر وہ خصوصیت ایسی ہے جو جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً جبروت شد سے کثیر التعداد انسانوں کو متابعت میں رکھنا تو اسے عدید یہ کہیں گے

اگر دولت و ثروت اور صوب و نسب کا خیال رکھنا اس جمہور کا خاصہ ہے تو ایک شریعہ اور کھینہ و حشیانہ پن ہے جس میں شیشے کی گولیوں کے مانند فوقیت ملتی ہے لیکن جب یہ طے شدہ ہے کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خصوصیت غالب رہتی ہے تو جمہوریت کا وجود صرف انسانوں اور جانوروں نیز مہذب طرز عمل اور حشیوں کے طور و طریق کے باطن امتیاز کرنے میں رہ جاتا ہے وہ خصوصیت یہ ہے کہ ہر انسان اپنے افعال میں معقول پسندی نیز اخلاقی ذمہ داری کا خیال رکھے۔ جس معاشرہ میں یہ دونوں باتیں موجود ہوتی ہیں اس کو جمہوری کہتے ہیں۔

زمانہ موجودہ میں بھی لوگوں کے دل میں یہ میلان موجود ہے کہ دنیا میں ان ستم کا معاشرہ قائم ہونا چاہیے۔

جس جماعت میں انسانوں کے باہمی ربط و روابط معقولات کے تحت ہوتے ہیں اور جن میں انسان کو تمام ذاتی افعال میں اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے وہ بھی ایک معاشرہ ہے جس میں ہر شخص کو حیات کے لئے کچھ نہ کچھ خیالات اور احسانات نذر کرنا پڑتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص محض قوت بازو ہی عطا کرے لیکن اس میں ہر شخص قابل و لائق تصور کیا جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں کوئی نہ کوئی بے نظیر چیز گر وہ کیلئے پیش کر سکتا ہوں۔ یہ حیثیت معیار یکساں انسانوں کے معاشرے کا نام جمہوریت نہیں ہے بلکہ یہ ان معنوں میں مساوی انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے کہ ہر شخص اس کل کا ایک جز و لاینفک ہوتا ہے معاشرے میں

ہر شخص کی خدمت بہ لحاظ فائدہ مساوی نہیں ہوتی لیکن جس شخص سے بھی
 جماعت کو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ مساوی طور پر ایک ایسا ہر شہمہ ہے جو
 سے حیات عامہ کا اخراج ہوتا ہے۔ علاوہ بریں جمہوریت کا غنشا یہ ہے کہ
 اس میں ہر شخص پر کچھ نہ کچھ بار ہوتا ہے کیونکہ اصل جمہوریت میں کوئی شخص
 بھی ان افعال کی ذمہ داری سے پہلو تہی نہیں کر سکتا جو تمام اشخاص
 کی طرف سے اور ان کے فائدے کے لئے اس کی ذات سے صادر ہوتے
 ہیں۔ جمہوریت میں ”حکومت“ سیاسی نقطہ خیال کے مطابق ذمہ دار
 ہوتی ہے یعنی حکومت کو عوام کے سامنے جواب دہی کرنی پڑتی ہے
 لیکن اس سے عوام کی اخلاقی ذمہ داری اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔
 خیال ہے کہ اس ذمہ داری کا دوسری اور سبک ترین مثبت
 سے غلط سلط نہ ہو کیونکہ جمہوریت جس قدر حاصل ہوتی ہے اسی قدر ایک قوم
 کی اخلاقی ذمہ داری اس حالت میں اور بھی المضاعف ہو جاتی ہے جو
 کوئی فعل اس کے نمایندے کے وساطت سے سرزد ہوتا ہے مگر ایک
 طرف فعل کا صدور اور اس کی ہدایت اور دوسری جانب حکام بالا کے
 ہاتھوں میں اختیارات دے کر پھر ان سے لاپرواہی اور بے اعتنائی
 کا اظہار کرنا یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ ہرگز نہیں جاری رہ سکتیں۔
 جمہوریت دنیا سے معاشرتی اور عضویت سیاسی دونوں توفیق
 ملتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر قسم کی معاشرتی زندگی مذہب صنعت
 اور سیاسیات غرض کہ ہر چیز میں جمہوریت سائر دوا کر ہو سکتی ہے

جمہوریت کے ان مختلف اقسام میں مشترکہ فعل صادر ہوتے ہیں ایک سے دوسرے کو آپس میں تقویت پہنچتی ہے لیکن دوسری طرف جب کہ سیاسیات میں حصول جمہوریت کے لئے جدوجہد کی جارہی ہے یہ بھی ممکن ہے کہ خانگی زندگی اور صنعت میں خود سری کا خیال پیدا ہو جائے کہیں کہیں سیاسی جمہوریت ایک غیر جمہوری معاشرتی فضا میں بھی حاصل ہو جا رہی ہے۔ مثلاً ان ملکوں میں جہاں کہ عوام کو یہ حرص ہوتی ہے کہ انھیں امرار و شرفار کے دربار میں شرف باریابی حاصل ہو جائے یا جہاں دولت مند اشخاص کو حصول خطاب کا شوق ہوتا ہے۔

اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ جمہوریت پسندی کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں اور جن کے قلوب خطابات کے سحر سازی سے بھی تسخیر نہیں ہوتے وہ بھی ہر وقت اہل دولت کے آستان پر جہ سائی کیا کرتے ہیں۔ بہر حال دونوں حالتوں میں چالپوسی اور خوشامد پسندی سے جمہوی خیالات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں خطا بیافہ یا شایستہ مگر غیر معروف اشخاص کی عوام مدح و ستائش کرنے لگتے ہیں یا کوئی سیاسی جماعت آئے دن نئے نئے منصوبے باندھا کرتی ہے۔ وہاں قانونی مساوات بھی نہیں حاصل ہوتا۔

معیار جمہوریت کا یہ نقشا نہیں کہ عقل و فراست نیز امتیازات شعائر کا بھی عام طور پر اعتراف نہ کیا جائے۔ صرف جسمانی طاقت۔ دولت یا حسب و نسب کے امتیازات کو جمہوریت پسند اشخاص غیر ضروری قرار

دیتے ہیں اسی لئے جمہوریت بجا طور پر ایک ایسا اصول ابتدائی قرار دگئی ہے جس میں انسان مساوی تصور کئے جاتے ہیں۔ یہ اصول اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہمیں بہترین اشخاص کا پتہ معلوم ہو جائے کیونکہ صرف مساوی مواقع بہم پہنچانے ہی سے عقل و فراست نیز امتیازات الطوارظاً ہو سکتے ہیں لہذا جمہوری معیار کا تعلق صرف سلوک اطفال کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ عالم طفلی میں امتیازات قابلیت تعلیم حقیقی کے ذریعہ سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ اصل میں غیر معروف اشخاص کے مجموعہ کا نام جمہوریت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی جماعت کو جمہوری کہتے ہیں جو عقل و فہم اور چال چلن کے اعتبار سے مختلف الاقسام افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہی ایک صورت ہے جس سے مثلاً اور حریت دونوں میں موافقت ہوتی ہے۔ جمہوری معیار میں مختلف انساں گروہوں کے تعلقات باہمی کا بھی سوال شامل ہے۔ کیونکہ اولاً یہ ظاہر ہے کہ انسان کے چال چلن۔ دل و دماغ کی صحت اور اس کی خود بوان سب چیزوں کی تیاری میں وہ گروہ حصہ لیتا ہے جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے لہذا مکمل انفرادی زندگی کے نشو و نما میں جو اثر حیات جمہوری کا پڑتا ہے اس کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

نمائندہ کسی جمہور کی بناوٹ اور اس کے افعال پر اس لگاؤ کا بہت کچھ اثر پڑتا ہے جو اس کے اور دوسرے گروہوں کے درمیان موجود ہوتا ہے اس سے اس وقت شعائر انفرادی کی ارتقا نہیں ہو سکتی جب تک گروہوں کے آپس کا میل اس کی اجازت نہیں دیتا یا اس کی ترقی نہیں چاہتا

گویا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بحیثیت معیار جمہوریت میں مختلف گروہوں کے باہمی انحصار سیاسی کا تصور بھی شامل ہے اس تحلیل کا سلسلہ لوگ حکومت خود اختیاری سے ملایا کرتے تھے اور یہ ثابت کرنے کے لئے الفاظ کا بہت کچھ الٹ پھیر کیا جاتا تھا کہ جو شخص کسی نظام سلط کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے دراصل خود حکمرانی کرتا ہے بعض حالتوں میں رضائے عامہ کا شمار اطاعت میں ہوتا تھا بحیثیت معیار حکومت خود اختیاری میں ایک اور تجویز کا اضافہ کیا گیا۔ وہ تجویز یہ تھی کہ اگر حکومت کی صورت میں رو بد بدل کرنا منظور ہو تو کل قوم کی رضامندی حاصل کرنا چاہئے لیکن اس معیار میں جن باتوں میں پچھلے دنوں اضافہ ہوا ہے اس کا تعلق مذہب خطہ پرستی اور ذاتی انفصال ہے۔

یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ جب جمہوریت کا استعمال گروہوں کے تعلقات کے زمرے میں کیا جائے تو اس میں ان امتیازات کے بہ مقابلہ جو حکومتوں کے درمیان فی تفریق میں کئے جاتے ہیں زیادہ لطیف امتیازات کا اعتراف ہونا چاہئے مختلف گروہوں کی سیاسی طاقت کا استعمال یا ان کی جزوی آزادی تو اب جمہوری معیار میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ زمانہ حال میں جتنی بڑی بڑی ملکیتیں ہیں ان کی مماثلت سے اندیشہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر ان مختلف انحصار گروہوں کو جو اس حکومت میں شامل ہیں زیادہ اختیارات اپنی زندگی پر نہ دئے گئے تو جمہوری رجحانات طبع کو صدمہ پہونچ جائے گا۔ برخلاف اس کے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر حکومتی جمہور کو اپنے طرز عمل کا فیصلہ کرنے کی خود

صلاحیت ہونا چاہئے جس سے وہ ان باتوں کی تکمیل کر سکے جو اس کی صفات عالیہ شمار کی جاتی ہیں لیکن صرف یہی کافی نہیں ہے کہ جمہور ایک دوسرے پر منحصر ہوں ان کے تعلقات باہمی بھی سیاسی ہونا چاہئے مراد کلام یہ کہ ان کا دار و مدار تناسب و متقابل طاقت و دولت پر نہیں بلکہ انصاف پر ہونا چاہئے۔ کیونکہ زمانہ موجودہ میں یہ ایک ناممکن شے بات ہے کہ ایک دوسرے سے کسی قسم کا واسطہ ہی نہ ہے اور اس ایک کا دوسرے سے واسطہ ہونے کا منشا یہ ہے کہ دونوں میں باہم کشمکش جاری رہا کرے تو جمہوریت قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر تمام جماعتوں کے تعلقات باہمی زور و طاقت ہی پر مبنی ہیں یعنی اگر ملکیتیں خود جنگ کے لئے آمادہ ہوتی ہیں اور دولت ہی میں ایک قوم دوسری قوم کو مغلوب رکھنا چاہتی ہے تو یہ ناممکن ہے کہ چھوٹے چھوٹے گروہوں کو کسی زمانہ میں بھی خود فیصلہ کر کے کا اختیار حاصل ہو۔ اس قسم کے سماج میں کوئی شخص واقعی صعود نہیں کر سکتا جس کے عضویت کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ گروہوں کے تعلقات دباؤ سے قائم ہوتے ہیں اس طریقے سے جو تنظیم ہوتی ہے وہ سیارہ نہ ہوتی ہے اس کے اور جمہوری معیار کے درمیان موافقت نہیں ہو سکتی کیونکہ فوجی نظام میں خواہ مخواہ کثیر التعداد اشخاص کے فعل کی ذمہ داری کا بار چند آدمیوں کے شانوں پر پڑ جاتا ہے تمام افسر اور ایک ایسے شخص کے زیر علم ہو جاتے ہیں جو خود ان میں کا نہیں ہوتا ان افراد کے مجموعہ سے جنگی قوت قائم ہو جاتی ہے جس میں بکثرت افراد جذب ہو جاتے ہیں اس لئے اپنی

اکثر افعال کے لئے فوجی حکومت کا سپاہی یا ایک بانستندہ ذمہ دار نہیں ہوتا
اس طرح اس کے فردیت کی ارتقاء ہونے نہیں پاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ جمہوری معیار
کے برعکس ہے لیکن اس صورت حالات کو اس وقت تک برابر تسلیم کرتے ہیں
جب تک حکومت کے باہمی تعلقات کا دار و مدار زور و قوت پر ہے گا اس لئے
انفرادی زندگی کے بارے میں جمہوریت کا جو معیار ہے اس میں جمہوری
تعلقات کی ایک جدید تنظیم کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ ان جماعتوں کیلئے
ضروری ہے کہ جلدی طور پر یا کلیتہً محض خود مختار ہی نہ ہوں بلکہ ان کا متعلق
کسی سیاسی نظام کے ساتھ ضرور ہونا چاہئے۔ قصہ یہ ہیں معیار جمہوری
کے خصوصیات جو زمانہ حال کی سیاسی زندگی میں ان پر اثر دکھاتے ہیں
ابھی تک ہم نے اس آخری اور انتہائی مقصد کا ذکر کیا ہے جمہوری
معیار میں شامل ہے لیکن ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جمہوریت کا تعلق ایک
طریقہ حکومت سے بھی ہے اس قسم کے ضروری ذرائع موجود ہیں جن چہودہ
معیار کی تکمیل منحصر ہے مثلاً حکومت اکثریت مسائل سیاسی میں وسیع پیمانہ پر
سائے دہندگی کے اختیارات اور قومی اقتدار اعلیٰ اس قسم کے الفاظ کے
کوئی قطعی معنی نہیں ہیں لیکن ان کا جو مطلب سمجھا جاتا ہے وہ کافی طور پر اس مفہوم
سے ملتا جلتا ہے جس سے فی الحال ہماری مطلب براری ہوتی ہے۔
مگر ان الفاظ سے مقصد انتہائی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ ان طریقوں کا
پتہ چلتا ہے جن کے ذریعہ سے جمہوریت حاصل ہو سکتی ہے۔ قومی اقتدار اعلیٰ
کا انشا یہ ہے کہ حکومت قائم شدہ مردوں اور عورتوں کے گردہ کی مشترک

حیثیت سے خدمت گزار ہے وسیع پیمانہ پر اختیارات رائے دہندگی حاصل
 ہونے کا مدعا یہ ہے کہ ہر صحیح الدماغ اور بالغ انسان کو ان معلومات اور
 فیصلہ جات میں اضافہ کرنا پڑے گا جو عوام الناس نے فراہم کئے ہیں حکومت
 اکثریت سے مراد یہ نہیں ہے کہ بکثرت انتخاب حاصل جسمانی طاقت کے لحاظ سے
 مضبوط اور تن آور ہوں کیونکہ یہ حالت ہمیشہ واقع نہیں ہوتی ہے۔ بخلاف
 اس کے مشایہ ہے کہ زیادہ انسانوں میں انسانی زندگی کے متعلق فیصلہ صحابہ
 کرنے کے لئے کوئی اور بنیاد مقرر ہونا چاہئے لیکن ان سب باتوں کو کوئی
 دانستہ منظور نہیں کر لیتا۔ یہ کہ دنیا کافی ہے کہ اکثر حالتوں میں دیگر اقسام
 فرمانروائی کے بمقابلہ جمہور کا با اختیار ہونا زیادہ قابل اطمینان ثابت ہوا ہے
 جمہوریت سیاسی کے متعلق جو مناسب تصورات قائم کئے گئے ہیں ان سب
 کی تہ میں یہ رائے مضمر ہے کہ کسی گروہ کے طریقہ حکومت اور اس کے ذکور
 وراثت کی زندگی ان دونوں چیزوں کے مابین ایک ایسا قریبی تعلق ہے کہ
 ہم مملکت کو اس کی مشترکہ حیثیت سے جمہور یا قوم کہہ سکتے ہیں لیکن اکثر ایسا
 ہوا ہے کہ چند حکام یا ایسے انتخابی شخص نے جن کو خاص رعایات و حقوق حاصل
 تھے ایک حصہ بن کر قائم کر لی اسی کا نام ”حکومت“ رکھ لیا گیا سیاسی جمہوریت
 دولت تمام ایسے شہر لوہاں کے سیاسی نظام کا نام ہو گا جو صرف اس
 حیثیت سے رعایا تصور کئے جائیں گے کہ جو ضوابط انہوں نے خود مرتب کئے
 ہیں وہ ان کے ذریعے سے معرض عمل میں لائے جاتے ہیں یا وہ خود اپنے بنائے
 ہوئے قوانین پر عملدرآمد کرتے ہیں۔

معیار کی ابتدا

سیاسی صعود کے آغاز ہی پر یہ معلوم ہو گا کہ جمہوری معیار کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ یہ امتیاز اور روم کے بعد جس قدر موجدان جمہوریت گزرے ہیں سب کو انھیں دونوں کی لہذیب سے روشنی ملی ہے۔ حالانکہ ان دونوں شہروں میں بھی غلاموں کا وجود تھا اور روم پر تو ایک حکومت اشتراقیہ کا پرچم لہراتا تھا۔ بہر حال مساوی مواقع ترقی کی قدر و قیمت کا پتہ ان دونوں کے چھوٹے چھوٹے گردہوں سے چلتا ہے جو خود کو اپنے ہمایوں سے زیادہ نایق و برتر سمجھتے ہیں۔ جو کثیر التعداد اشخاص قدیم شہروں کے باشندے تھے انھیں بھی دستور مساوات موجود تھا یہ ہی وجہ تھی کہ لوگ اس بات کے قایل ہو گئے کہ دنیا کے تمام انسان مساوی ہیں علاوہ بریں رتوں کی حب الالسانی اور مذہب مسیحی سے بھی جمہوریت کا سراغ لگتا ہے۔ زمانہ وسطی شہروں میں ایسے چھوٹے چھوٹے گردہ موجود تھے جن میں اصول جمہوریت کی آزمائش کی گئی تھی۔ جب حصول تفوق کی خواہش میں اختیار یودپ کا دور گزرا تو اس کے بعد انقلاب فرانس کا آغاز ہوا۔ جو بعدہ انفرادیت اور اشتراکیت کے مذاہب میں جمہوری معلوم ہوتا ہے مینزینی کی کے قومیت بھی جمہوریت پر مبنی ہے لیکن جمہوری معیار کو اپنی موجودہ شکل و صورت پر بیسویں صدی کے شروع تک قوت نہیں حاصل ہوئی تھی ۱۹۱۵ء میں روس

انقلاب کا شکار ہوا اور یہ انقلاب اپنے نقائص کے باوجود زمانہ حال کے اسی اصول جمہوریت کا نتیجہ ہے خواہ آخر میں اس کو کامیابی حاصل ہو یا نہ ہو تاریخ ارتقائیں یہ واقعہ بھی ایسا ہی شاندار شمار کیا جائے گا جیسا کہ ریاستہائے متحدہ کے اعلان آزادی یا انقلاب فرانس کا واقعہ تھا۔ جس معیار جمہوریت کے سبب سے روس میں آتش انقلاب مشتعل ہو ہی تھی وہی دوسرے ملکوں میں بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ گو یہ ممکن ہے کہ وہاں کی آگ روس کے بہ مقابلہ زیادہ خوفناک ہو۔ اس زمانہ میں جو سیاسی تجربے حاصل ہوئے ہیں ان کے دو عظیم ترین نقائص یعنی افلاس اور جنگ کے خلاف اس نصب العین نے زور باندھا ہے۔ یہاں افلاس سے مراد قلت آمدنی نہیں بلکہ وہ عدم تحفظ اور غلامی کی حالت ہے جس میں ہزار ہا انسانوں کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ تیز لفظ جنگ کا منشا بھی یہ نہیں ہے کہ مختلف اقوام باہم دست و گریہاں ہوں بلکہ اس سے وہ دستور مراد ہے جس کے سبب سے لگا ہے اسے معرکہ آرائیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ انفرادی نیر جمہوری ترقی میں دو بڑی خرابیاں ہار جھوٹی ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں انفرادیت اور اشتراکیت کی ابتداء اس وجہ سے ہوئی تھی کہ ہزاروں انسانوں کو روز بروز زوال و انحطاط کا شکار ہونا پڑتا تھا جس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمیں دنیا میں نسبتاً زیادہ آزادی اور تنظیم کے ساتھ رہنے کے لئے موقع حاصل ہونا چاہئے لیکن جمہوری معیار محض انفرادیت اور اشتراکیت کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ انسانوں کے ہر گروہ کو

امتیازی زندگی تسلیم کر کے اس کو ترقی دینا چاہئے جس سے انفرادیت اور ایک قسم کی خط پرستی یا قومیت کے درمیان رابطہ اتحاد پیدا ہو جائے۔ علاوہ بریں اس کے برعکس جمہوریت سے مراد ایک ایسے جمہور کی تنظیم بھی ہے جو دوسرے گروہ سے اس تنظیم کے بہ مقابلہ نسبتاً کم مماثل ہو جس کے لئے اکثریت کی اول اول اقسام میں تحریک کی گئی تھی۔ جمہوریت کا مقصدنا ہے کہ ہر شخص اور ہر جمہور کو رضا کارانہ اتحاد پر اس قسم کے اتحاد کے ذریعہ ایسے فرائض کی انجام دہی کے لئے آزادی حاصل ہونا چاہئے جن کا بار تبدیلی اکثریت میں حکومت پر ڈال دیا گیا تھا۔ انتظامات کا اصول دراصل جمہوری ہے گو ممکن ہے کہ اس کے حد سے زیادہ سبب و زر کر جانے سے حکومت کے ان عقائد کے بجائے جو اس کو بلا شرکت غیرے حاصل ہیں ایک جدید خود سرائہ حکومت قائم ہو جائے۔

معیار کا نظہار

جن کنابوں سے موجودہ صورت میں جمہوری معیار کے قیام پر اثر پڑا ہے وہ اس قدر زمانہ حال میں تصنیف کی گئی ہیں کہ عہد گزشتہ کے بڑے بڑے سیاسی صحائف کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے سے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہیں دو باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے جن کا تعلیم جمہوری معیار کی تاریخ حال سے ہے پہلی بات یہ ہے کہ اس کی بنیاد

جہان میں نہیں ہو سکتی صرف ادبیات قیاسی میں اس کا ذکر آیا ہے۔ وہٹ
 کی نقطوں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے اس کے علاوہ موجودہ زمانہ میں
 جمہوریت پسندوں نے جو ہوائی قلعے بنائے ہیں ان سے بھی ہمارے یہاں
 تصدیق ہوتی ہے۔ وہٹ آئن ایک شاعر تھا اس کا ایک خاص سیاسی
 اور تمدنی معیار تھا۔ اس نے مشاہدہ کیا تھا کہ ہر انسان میں ایک وصف لطیف
 موجود ہے اس کے دل میں ایک نہایت برودست خود مختاری کا خیال
 جاگزیں تھا اس کو معمولی انسان کی رضا سے عامہ میں اعتقاد تھا۔ انھیں
 سب باتوں سے اس نے دوسروں کے قلوب کو بھی ابھار دیا لیکن جمہوریت
 کی نوعیت کے بارے میں کوئی ایسی نمایاں اور مقبول عام تحقیق و تشریح موجود
 نہیں ہے جس کے سبب سے اس کا معیار وجود میں آیا تھا۔

اس معیار میں دوسری بات یہ ہے کہ امریکہ کی ریاستہائے متحدہ
 کے ساتھ اس کا تعلق نہایت گہرا ہے مگر مراد کلام یہ نہیں کہ ان ریاستوں کے
 علاوہ دنیا کے کسی اور ملک میں اس کی زیادہ تکمیل ہوئی ہی نہیں یا وہاں کے
 باشندے۔ بھی اس کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے ہی نہیں۔ اکثر اہل امریکہ کے دلوں میں
 یہ خیال موجود ہے معیار جمہوریت کو کمال تقریباً انھیں کے ملک میں حاصل ہوا
 دوسرے ملکوں کے باشندے اس کے معنی سے بخوبی بہرہ اندوز نہیں ہیں۔
 ریاستہائے متحدہ کے عوام میں جوش بڑی جلدی پیدا ہو جاتا ہے صنعت و
 حرفت کے معاملات میں وہاں اتہاد درجہ کی مطلق العنانی سے کام لیا جاتا ہے
 جب اس ملک کے باشندے جہاں جمہوریت رائج ہے خود اپنی

زبان سے اس کی تعریف کے بل باند بنے لگتے ہیں تو دلیل سے ذرا کام نہیں لیتے اور ان کی دلیل کا قاعدہ نہ بہت مرتفع اور نہ اپنی مخفف صورت میں بھی عالمگیر ہوتا ہے لیکن ریاستہائے متحدہ میں بھی مذکور کی کمی کی جو صورت اور جو خود غرضانہ سرگرمیاں زمانہ قدیم میں رائج تھیں ان کی وجہ سے ہمارے آنکھوں پر پردہ نہ پڑ جانا چاہئے۔ جس سے ہم کو وہاں اس معیار کی موجودگی نظر ہی نہ آ سکے۔ محض ریاستہائے متحدہ کے وجود ہی سے جمہوریت کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ جو انسانی حقوق انقلاب فرانس میں مقرر کئے گئے تھے وہ ریاستہائے متحدہ کے قواعد و ضوابط سے اخذ کئے گئے تھے جنوبی امریکہ میں جو متحدہ جمہوری حکومتیں قائم ہیں وہ شمالی براعظم میں جمہوریت کی کامیابی ہی کے سبب سے وجود میں آئی تھیں۔ یورپ کی مطلق العنان نیزاشرافی حکومت کے تارکان وطن ریاستہائے متحدہ ہی کو ایسی سر زمین تصور کرتے ہیں جہاں ان کی امیدیں برآ سکتی ہیں اور ان ملکوں میں جمہوریت کا کارگر نہ ثابت ہونا اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان کی پیشتر کی حکومتیں اس قدر ناقابل اور تحریک کن تھیں کہ جن قوموں کو انہوں نے امریکہ جانے پر مجبور کیا وہ جاہل اور غیر تعلیم یافتہ بنی رہیں۔ امریکہ کے خلاف اہل یورپ جو کوئی بھی الزام لگاتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ثانی الذکر خود اپنی خامیوں کا اعتراف کر رہے ہیں۔

نصب العین کے جزو ثانی یعنی جمہوروں کے تعلقات باہمی کے سلسلے میں بھی ریاستہائے متحدہ کو ایک جدید اصول کا علم بردار کہہ سکتے ہیں

اس بات پر نہایت شد و مد کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے کہ احبار یورپ میں جو تفالیں تھے ان کے ساتھ ساتھ ریاستہائے متحدہ کی حکمت عملی بھی پامال ہو چکی ہے۔ ایک اہم واقعہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ نے باقی ممالک تیس ریاستوں کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لیا ہے ہیں یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ دراصل ریاستہائے متحدہ بھی ایک معنی میں ایک دوسرے سے آزاد ہیں ہر ریاست میں بجا سے خود ایک محدود اقتدار اعلیٰ قائم ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان مضمونہ ریاستوں کے تعلقات کی تنظیم کرنے کے وہاں کی اتحادی انجمنوں کو ریاستوں کے باہمی نظام کا ابتدائی اصول معلوم ہو گیا ہو تاہم میں یہ کوئی امر اتفاقی نہیں ہے کہ جمہوریت پر جو نہایت غلامانہ مضمون لکھا گیا ہے اس میں ریاستہائے متحدہ کے صورت حالات کے بارے میں تحقیق و تدوین کی گئی ہے۔

ماکیون کی تصنیف (امریکہ میں جمہوریت) ابھی تک ایک ایسی کتاب مستقیم کی جاتی ہے جس میں معیار جمہوریت پر بخوبی بحث کی گئی ہے معیار کا جو کچھ بھی جوہر ہے وہ مصنف پر بخوبی روشن ہے موصوف نے لکھا ہے کہ۔

”شاعری، فصاحت اور ایسے تمام عطیات جو بہشت سے لٹا جاتے ہیں ان سے جمہوریت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس حالت میں بھی جب یہ عطیات جمہور کے مخالفوں کو میسر ہو جاتے ہیں تو ان سے انسان کی فطرتی شان و شوکت نمایاں ہو جاتی ہے اس طرح مدعائے جمہوریت

پورا ہو جاتا ہے وہ بتاتا ہے کہ گو انقلاب فرانس سے قدیم مقامی ادارے
 پامال ہو گئے مگر حریت کے بجائے اس میں دقتی حکومت کی مطلق العنانی
 کے لئے حمایت کی گئی مصنف کی نگاہ کے سامنے وہ خطرات بھی ہیں جو صوبوں
 جمہوریت سے پیش ہو سکتے ہیں یعنی خیالات باطل کا جو اگرچہ عوام الناس
 کے خیالات ہوتے ہیں ضد اور اصرار کے ساتھ قائم رکھنا سیاسی جمہوریت
 میں توازن قائم رکھنے کے لئے صنعتی معاملات میں مطلق العنانی اختیار
 کرنا تلون شعاری حکام افواج جمہوری میں جنگ کی خواہش اس لئے پیدا
 ہو جانا کہ انہیں جماعت میں اقتدار حاصل ہو جائے۔ اس سے معلوم
 ہوتا ہے کہ مصنف نے آنکھ بند کر کے محض جوش ہی سے کام نہیں لیا
 بلکہ ایک جمہوری معاشرے میں اس کی متعدد خوبیاں نظر آتی ہیں یعنی
 توانائی اختراعی قابلیت خاص خاص مقاصد کے لئے انجمنوں میں تنظیم
 ہونے کی صلاحیت سنجیدگی رائے اور دستور قدیم کی پابندیوں سے
 آزادی۔ اس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محض جمہوریت ہی وہ چیز ہے جن پر
 صرف تحفظ امن و تسلط کے مقابلہ اور تمام سیاسی مقاصد عالمی و برتر تسلیم کئے
 جاتے ہیں شاید یہی خاص وجہ ہے کہ جمہوری معیار کا انسانوں کے دل پر
 بہت اثر پڑتا ہے کیونکہ جمہوریت میں اس بات کی اجازت ہے کہ تمدنی
 نظام کی صورت ہمیشہ بدلی جاسکتی ہے اب ہم مستقبل کو بچہ دراز اور
 امکانات ترقی کو غیر محدود خیال کرنے لگے ہیں۔ ہمارے قیاسات اب
 ایسے نہیں رہے ہیں جو مر کو زو محدود دریں جن میں اور کبھی کوئی تغیر

ہی نہ واقع ہو بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے نظام زندگی میں برابری واقع ہو رہے۔

معیار کی موجودہ صورت

فی الحال معیار کی دو صورتیں ہیں ایک شکل تو وہ ہے جس میں یہ شروع شروع میں سیاسی نہیں ہیں دوسری حالت میں اس کا اثر انتظام اور طرز حکمرانی دونوں باتوں پر پڑتا ہے ایک طریقے سے جمہوریت کا تعلق صنعتی جمہوریت کے ساتھ بہت قریبی ہے خواہ وہ خالص طور پر سیاسی ہی کیوں نہ ہو لیکن اقتصادی نظام کی کمی سے سیاسی زندگی پر بہت اثر پڑتا ہے۔ زمانہ حال کی حکومتوں میں بہت سی کارروائیاں ایسی کی جاتی ہیں جن میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاشی فرایض انجام دیر ہی ہیں۔ صیغہ محاصل۔ ٹیپ خانہ اور بعض حکومتوں میں ریلوے جات کا انتظام یہ سب باتیں جزوی طور پر اقتصادیات سے تعلق رکھتی ہیں جن کارروائیوں کا سلسلہ ذرائع آمدنی سے ہوتا ہے ان کے لحاظ سے حکومت خواہ مخواہ اقتصادی جماعت نہیں ہو جاتی ہے مگر ہے کہ فرازدائی اور انتظام سیاسی ان دونوں کی مداخلت معاشی معاملات میں ہو جانے لگے لیکن اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس کی نوعیت ابتداً اقتصادی نہیں ہوتی کیونکہ اس کے ذریعہ سے کسی فائدہ یا منافع کی توقع نہیں کی جاتی ہے

حکومت کی کارگزاری کا اندازہ یہ دیکھنے سے نہیں ہو سکتا کہ اس سے کتنا فائدہ پہنچتا ہے بلکہ اس کی کسوٹی انصاف ہے حالانکہ سیاسی ماہرین اقتصادیات نے ان دونوں چیزوں کو خلط ملط کر دیا ہے تاہم منافع کے بہ مقابلہ انصاف زیادہ درست کسوٹی کا رناموں کے پرکھنے کی ہے بہر حال یہ ہو سکتا ہے معاشیات اور سیاسیات میں جو فرق حاصل ہے اس پر بحث نہ کریں اور صرف اقتصادی عدم تنظیم کے سیاسی اثرات تک اپنی توجہ محدود رکھیں کیونکہ معیار جمہوریت کی ابتداء کسی حد تک ان خرابیوں کے مشاہدہ سے ہوتی ہے جو صنعتی زندگی کی بد نظمی سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

پہلے سوال میں ملازمت کی بیقاعدگی اور دوامی کمی۔ یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔ جنگ کے قبل لندن کے بندرگاہوں کے مختلف صیغوں میں اس ہزار انسان ایسے تھے جن کو ملازمت حاصل ہونے کا کوئی امکان ہی نہ تھا حالانکہ کبھی بیکاری کی بلا کسی کے سر پر نازل ہوتی تھی اور کبھی کسی پر ایکے تہہ جو لوگ بیکار ہوتے تھے ہمیشہ انھیں کو اس بلا سے سامنا ہوتا تھا۔ ان بیکاروں کی مجموعی تعداد ہمیشہ دس ہزار ہوتی اور یہی حالت دنیا کے دوسرے حصوں میں تھی۔ عسلاوہ برس مہمی تجارتوں مثلاً تعمیرات وغیرہ میں بھی ملازمت کا طریقہ بیقاعدہ ہے۔ ہر صنعت میں ایسے کاریگروں کی کافی تعداد رہتی ہے جو اس زمانہ میں بیکار ہو جایا کرتے ہیں جب اس خاص صنعت میں منافع کم ہونے لگتا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ نان شبینہ کیلئے بھی محتاج ہو جاتے ہیں گویا صنعت کی تنظیم اس قدر خراب طریقوں سے

ہوتی ہے کہ کثیر التعداد مرد اور عورتوں کو اپنی قابلیت و نیرطافت کے استعمال کا موقع نہیں مل سکتا۔ دوسرے اختصاص کی ساری طاقت میں بچوں کا بھی شمار ہے جو لگاتار محنت و مشقت کی وجہ سے قبل از وقت زایل ہو جاتی ہے۔ یہ ہوتا ہے کہ ہم ان معاشی خرابیوں کو نظر انداز کر دیں جن کی وجہ سے اچھا انتظام نہیں ہو پاتا پیداوار کم ہوتی ہے اور غیر محفوظ رہتی ہے کیونکہ خالص سیاسی تقاضوں کی تعداد بھی کثیر ہے جن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ پیٹ بھر کھانا اور حسب ضرورت کپڑا میسر نہیں ہوتا وہ نہ خود دار نہ ان کے بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں ان کی ضروریات بھی حیوانوں کی سی ہوتی ہیں کیوں کہ ان کے ساتھ حیوانوں کی طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کو کھانا بعض جانوروں سے بھی کم میسر ہوتا ہے جن کی وجہ یہ ہے کہ ان کا کوئی آقا نہیں ہوتا ایسی گائے اور اگھوڑوں کا کیا حشر ہو گا جن کا کوئی مالک۔ یا دعویدار نہ ہو اور پھر بھی ان سے برابر کام لیا جائے یہی حالت ہر غیر مہذب حکومت میں کثیر التعداد انسانوں کی ہوتی ہے لیکن باوجودیکہ بعض امرا کا یہ خیال ہے کہ اگر غلام سی ایک آقا کی ملکیت ہوتے ہیں تو اس سے خود انھیں کو فائدہ پہونچتا ہے یہ خیال کرنے سے ہی سماجے جسم میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے کہ انسان انسان کو اپنا غلام بنا کر رکھے اس لئے ان سب باتوں کا علاج صرف جمہوریت ہی ہے۔ علاوہ بریں مدت ملازمت کی عدم کفالت سے بھی سیاسی خرابی پیدا ہو جاتی ہے جن مردوں اور عورتوں کو اپنی بقیہ زندگی کے لئے آقاؤں کا تابع فرمان رہنا پڑتا ہے

اور جن کو تجارت میں خسارہ عظیم یا منافع میں کمی ہو جانے کی وجہ سے انکو دان
برخواست اور بیکار ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے وہ بھی اچھے غمخیز نہیں بن
سکتے ان کی محتاجی اور غلامی میں بہ مشکل تفریق کی جاسکتی ہے ان کی نشست
یعنی سو بچنے سمجھنے کا مادہ اور ذمہ داری افعال ان باتوں کی ترقی کا
کوئی امکان ہی نہیں۔

انفرادیت اور اشتراکیت کے ضمن میں ہم نے انحطاط جسمانی کے نقص
پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے اس بحث میں ہم صنعتی بد نظمی کے عیب پر زیادہ
زور دیں گے۔ فی زمانہ کاریگروں کو برخاست کرنے یا اپنے منافع کی کمی
یا بیشی کے لحاظ سے ان سے کام لینے کے اختیارات چند اشخاص کے ہاتھ
میں ہوتے ہیں اور اسی پر کل صنعتی کاروبار کا دار و مدار ہے۔
کاریگر کوئی بھی نہیں بن سکتا کہ نہ معلوم کس وقت اور کس کسوٹی سے
کام لیکر وہ چند منتظم بشخص یا حصہ داروں کا گروہ دائرہ ملازمت کو تنگ
کر دے اسی وجہ سے کثیر التعداد اشخاص ہمیشہ غیر محفوظ رہتے ہیں اس تباہی
بد نظمی کے عالم میں ان کا ایک جدا گانہ گروہ بن جاتا ہے مگر یہ بد نظمی کاریگروں کی
تنظیم سے درست ہو سکتی ہے۔ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے اور ان عام اصولوں کے
مطابق کبھی یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ لازم رکھنے والوں کا انتظام خواہ کتنا ہی باقاعدہ
کیوں ہو لیکن مالی حالت اور پیداوار کو ایک باقاعدہ صورت میں لانے کیلئے
وہ اس قدر موثر نہیں ثابت ہو سکتا ہے لہذا نجات کی صورت یہی ہے کہ
دنیا کے ہر ایک گوشے میں زبردست تجماعی تنظیمیں قائم کی جائیں ضروری

کے اس نظام کا پہلا فرض یہ ہے کہ کارخانوں میں کام کا بندوبست کارگری کے ہاتھ میں آجائے اس قسم کا اختیار حاصل کرنے کے لئے سرکاریوں کی تنظیم ہو جانے سے یہ انہیں تمام دنیا کو رفتہ رفتہ دام جہالت میں گرفتار ہو سکے۔ بچا رہی ہیں کیونکہ اس رضا کارانہ تنظیم سے محض ہر شخص کی حفاظت ہی نہیں بلکہ نہایت شد و مد کے ساتھ لوگوں کے اس خیال کی تردید بھی ہوتی ہے کہ مزدوری ایک ”سامان تجارت“ ہے لیکن اور اشیائے خام خود اپنی تنظیم نہیں کر سکتے اس لئے از خود منظم مزدوری کو خواہ مخواہ اوزاروں یا سامان تجارت سے مماثل تصور کرنا ایک اقتصادی غلطی ہے اگر خیال لوگوں کے دل سے دور ہو گیا کہ مزدوری بھی ”سامان تجارت“ ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ جمہوری معیار کے سامنے لوگوں نے سر تسلیم خم کر دیا آزاد معاشی نظام کے علاوہ حکومتی کارروائی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور یہیں سے سیاسی جمہوریت کا آغاز ہوتا ہے مملکت ارباب کا انتظار نہیں کر سکتی کہ خالص اقتصادی یا رضا کارانہ انجمنیں اس صنعتی بد نظم کو دور کر کے ایک نظام قائم کریں اس بد نظم کے سبب سے بچوں کی حالت روز بروز ردی ہوتی جاتی ہے۔ انسانوں میں شہرت کی قیامت نہیں رہتی اس لئے ہر ایک صنعتی حکومت میں کارخانوں کے متعلق قانون نافذ کئے جاتے ہیں کیونکہ حکومت کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اقتصادی مقاصد کے لئے اپنے شہروں کی محنت و مشقت کے استعمال کی ایک حد مقرر کر دی جائے اس لئے ان صنعتوں کیلئے تجارتی بورڈ قائم کئے گئے

ہیں جن میں کاریگروں کو ابھی تک منظم کرنے کی طاقت اچھی طرح حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے بچوں کو جہاں لازمی تعلیم دی جاتی ہے وہاں بعدہ سرمایہ جات عامہ سے ان کی پرورش بھی ہونے لگتی ہے۔

ان سب باتوں میں ایک معیار کام کر رہا ہے وہ معیار سیاسی جمہوریت ہے کیونکہ موجودہ زمانہ میں حکومت اپنے باشندوں کے ارتقاء میں رخنہ انداز نہیں ہوتی بلکہ عملی طور پر اس میں مدد دیتی ہے۔ قانون بھی اب حاصل کر حکم ناطق نہیں سمجھا جاتا ہے اور نہ وہ مجرموں کی نگرانی کیلئے محدود و مقصود ہے بلکہ حکومتی نظام کے قیام کا ایک وسیلہ ہو گیا ہے۔

خارجی حکمت عملی کے معاملہ میں جمہوری معیار کے مطابق سیاسی جمہوروں کے مابین منظم تعلقات قائم ہو جانا چاہئے جس سے جنگ کی نوبت نہ آنے پائے۔ جنگ میں جو کچھ تکلیف صعوبت اور بربادی ہوتی ہو ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں کیونکہ جمہوری معیار کا اظہار ان خرابیوں کے خلاف نہیں ہوا ہے یہ تو جنگ و جدل یا جنگ پسندی کے خلاف قائم کیا گیا ہے جو فی زمانہ دستور میں داخل ہو گئی ہے۔ لیکن اس جگہ جنگ جیتی کے بجائے لفظ ”جنگ“ کا ہی استعمال موزوں ہے کیونکہ جنگ پسندی سے ایک دماغی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اور بظاہر اس کا تعلق صرف حکومت کے باشندوں سے ہے لیکن جنگ و جدل تو ہر ایک حکومت کی ساخت اور اس کے ہر ایک فعل میں داخل و شامل سمجھی جاتی ہے اور جمہوریت میں اس بات کی مخالفت کی جاتی ہے۔

بات یہ ہے کہ لوگ جوش میں آکر اور جذبات کے زیر اثر ہو کر اس مسئلہ پر بحث کرنے لگتے ہیں جس سے یہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اسی وجہ سے ہم کو مزید تفصیلات پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہمارے یہ کہنے سے کہ جمہوری معیار جنگ کو ایک دستور قرار دینے کا مخالف ہے یہ منشاء نہ سمجھ لینا چاہئے کہ جمہوریت پرست حکومتوں میں لڑائی چھڑ ہی نہیں سکتی یا جو لوگ اس اصول کے حامی ہیں وہ حاربانہ امداد دینے سے انکار کر دیں یہ پہلو صاف طور سے ذہن نشین ہو جانا چاہئے مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ جس جماعت کا نظام نہایت حسن و خوبی کے ساتھ قائم کر دیا گیا ہے اس میں بسم خیرات کی ضرورت ہی نہیں رہنا چاہئے تو اس کا یہ منشاء نہیں کہ اس حالت میں خیرات دینا غلطی ہے لیکن بحیثیت دستور جنگ و جدال کی تشریح ضروری ہے جس سے ہم کو صحیح طور پر معلوم ہو جائے کہ اس کی موافقت جمہوریت سے نہیں ہو سکتی لیکن اس معنی میں معرکہ لڑائی سے صرف یہ ہی مراد نہیں کہ حکومت مصروف ہو بلکہ جنگ درپردہ کے دور میں بھی زمانہ امن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس میں لڑائی کے لئے تیاریاں جاری رہتی ہیں ہر حکومت کے تمام باشندوں کے تعلقات باہمی کے ایک نظام قائم کرنے کو بھی جنگ و جدال کی حالت کہتے ہیں۔ دستور سے مراد یہ ہے کہ نوجوان اشخاص کشت و خون کی مشق کیا کریں اور ہمیشہ اس کے لئے تیاری کرتے رہیں نیز اگر کوئی دوسری جماعت کشت و خون کے لئے تیاری کرے تو اول الذکر اسکو روکیں

ایسا کرنے کے لئے مدت بہت تک نہایت زبردست تعلیم و تربیت حاصل کرنا پڑتی ہے اس کے بعد ہزاروں اشخاص زیادہ تر حکام کے ہاتھوں میں آکر پیکار بن جاتے ہیں انفرادی خصوصیات ذاتی اختراع کا مادہ اور ذاتی ذمہ داری ان سب باتوں کو نقصان پہونچنے لگتا ہے جس سے انجام کار حصول جمہوریت میں مزید دشواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن جنگ و جدل کے لئے اس قسم کی تیاریاں اسی وقت ناگزیر رہ سکتی ہیں جب تک سیاسی جمہوروں کا نظام نہیں قائم ہوتا اور اسی وقت تک جمہوریت پرستی میں ہرج و مرج واقع ہو سکتا ہے۔

علاوہ بریں آجکل لڑائی کا اثر محض جوانوں ہی پر نہیں بلکہ تمام باشندوں پر پڑتا ہے کسی جنگجو حکومت میں رٹنے والوں اور نہ لڑنے والوں کے درمیان قطعی کوئی امتیاز نہیں ہو سکتا کیونکہ سبھی تو جنگی تنظیم کے جزو ہوتے ہیں جنگ میں میرٹ اور اکثر خفیہ کارروائیوں کی ضرورت درپیش ہوتی ہے اس لئے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ انتظام کرنے والے حکام پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہ کی جائے اور نہ ان کو یہ ضرورت رہے کہ جو کچھ افعال ان سے سرزد ہوں وہ ان کی کیفیت باشندوں کے سامنے بیان کریں گویا جب لڑائی نظام سیاسی کی بنیاد تصور کر لی جاتی ہے تو حکام کی کارروائیوں کے خلاف نہ علانیہ مباحثہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی رائے دی جاسکتی ہے ایسی حالت میں ایک رضا کارانہ جماعت مشتبہ سمجھی جانے لگتی ہے جس کی سرپرستی مملکت

خاص طور پر نہیں کرتی اور اگر حکومت جنگ میں مصروف نہ بھی ہو تو اس کا یہ فرض ہے کہ جس وقت تک لڑائی چھڑ جانیکا احتمال ہو وہ حکام کے ان اختیارات کو محفوظ رکھے لیکن اس کا یہ منشاء ہے کہ حکومت ایسی کارروائی کرے جس پر کسی کو اعتراض اور حرف گہی کا نہ موقع دیا جائے جو خفیہ ہو اور جس کی نگرانی کا حق قوم کو نہیں حاصل ہے اس لیے پھر یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس طرح جمہوریت کا قیام ناممکن ہے۔

علاوہ بریں خارجی تعلقات کے معاملہ میں جو حالت حکومت کی ہوتی ہے کم از کم کسی حد تک تو اندرونی حکمت عملی کے سلسلے میں بھی اس کی وہی حالت ہوتی ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ دائرہ حکمرانی کے باہر آزادی کو پامال کر دیں تو خیال رہنا چاہئے کہ آزادی اندرون حکومت بھی زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اگر مسائل خارجیہ کی آڑ میں اپنی اور دوسروں کی طاقت کا مقابلہ کرنے ہی سے ہو سکتی ہے تو اندرونی مسائل میں بھی ہم معیارات انصاف کا حوالہ لینے کی عادت آسانی سے چھوڑ دیں گے

مراد کلام یہ نہیں ہے کہ انسان منطق کے سخت ترین قواعد کے پابند ہوتے ہیں یا یہ کہ مختلف اقوام کا طرز عمل مختلف مسائل میں یکساں ہوا کرتا ہے لیکن یہاں سوال غیر اصولی حکومتوں کا نہیں ہے ہم سیاسی رجحانات کا ذکر کر رہے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس حکومت کا نظام اس قدر زبردست ہے کہ وہ دوسری حکومتوں پر اپنا دباؤ ڈال سکتی ہے۔

اس کی شیرازہ بندی ساتھ ہی ساتھ ایسی بھی نہیں ہو سکتی کہ وہ خوف و رعب و طاقت کے بجائے انصاف کو تمدنی زندگی کی بنیاد قرار دے سکے اگر مملکت تشدد سے کام لیتی ہے تو دوسرے جمہور بھی اس کا ضرور استعمال کریں گے اور جس حکومت میں تشدد ہی پسند کیا جاتا ہے وہاں کے افراد بھی خواہ مخواہ ذاتی معاملات میں اس کا استعمال کرتے ہیں اس طرح انصاف و حریت کے بجائے رزور و طاقت سے کام لینا جماعت کا غالب ترین تصور ہو جاتا ہے ایسی حالت میں واقعی جمہوریت نہیں حاصل ہو سکتی۔ اس قسم کے نیز دیگر متعدد اسباب کی موجودگی میں جنگ اور جمہوریت ان دونوں چیزوں کے مابین موافقت کبھی نہیں ہو سکتی لہذا جمہوریت کا یہ کام ہے کہ وہ دوسرے کے بجائے کوئی دوسرا نعم البدل مہیا کرے۔

معیار جمہوریت کا مقتضایہ ہے کہ جمہوروں کے تعلقات باہمی کا دار و مدار انصاف کے اصولوں پر ہونا چاہئے جن اصولوں سے اس میں کام لیا جاتا ہے وہ یہ ہیں۔

”ہر جمہور کو اس بات کی آزادی حاصل ہونا چاہئے کہ وہ خاص اپنی زندگی کا نظام بنا سکے اور دوسرے جمہوروں کے ساتھ اس کے تعلقات کی تنظیم کر سکے“

”عدہ حکومت خواہ وہ کسی قسم کی بھی ہو حکومت اختیاری سے بہتر نہیں ہوتی“

”اگر دو جماعتوں کے درمیان کوئی نزاع ہو اور اس کے تصفیہ باہمی

میں دونوں کو ناکامی ہوئی ہو تو کوئی جماعت اپنے معاملہ کا تصفیہ کرنے کے لئے حوذ کو منصف نہ قرار دے۔“

”جس جمہور کو آزادانہ ارتقار کا حق حاصل ہو اس کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ دوسرے جمہوروں کی ترقی کا احترام کرے اور اس میں مدد دے کوئی بھی دو ملکوں کے درمیان کوئی مناقشہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر حکومت کے خارجی تعلقات تمام دول سے وابستہ ہوتے ہیں۔“

ان اصولوں کو خواہ ایسے الفاظ میں بھی ضبط کیا جائے جن سے ان کا اطلاق خاص حالتوں میں بھی ہو سکے۔ مگر یہ اس قدر غیر معین ہیں کہ جو لوگ ان کو پسند کرتے ہیں انہیں بھی باہمی اختلاف رائے واقع ہو جائیگا کیونکہ ملکوں کے باہمی اور خصوص بڑی حکومتوں کے تعلقات کے اعتبار سے جمہوریت کے جو معنی ہیں ان کی ابھی بخوبی تحقیق نہیں ہوئی ہے۔ پچھلے دنوں ضرور حکومتوں کی تنظیم باہمی کے مسئلہ پر غور و خوض کیا گیا ہے جس سے صورت حالات کچھ درست ہو جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ ابھی تک اس مسئلہ میں جو کچھ معلومات لوگوں کو حاصل ہیں ان سے نیک نتیجہ کو کوئی مدد نہیں ملی ہے لیکن اب ایک نئے دور کا آغاز ہے جب بڑی ملکوں کے معاملہ میں معیار جمہوریت کا سنجیدگی کے ساتھ اطلاق کیا جائے گا تو بہت کچھ نتیجہ برآمد ہوگا

نکتہ سنجی

معیار جمہوریت پر متحد و تنقیدیں کھینچتی ہیں۔ افلاطون کے زمانہ سے قنونیسم کا اصول ساز اور نقاد گذرے ہیں سب برابر "عام انسان" کے متعلق شک و شبہ اور نفرت کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ جمہوریت حاصل نہ ہر جہاں نہیں سکتی کیونکہ ہر جمہور میں پیشوا ہوتے ہیں اور جمہور میں کامل رہبر پیدا کرنے کی جس قدر زیادہ قابلیت ہوگی اسی قدر اس کی تنظیم عمدہ ہوگی لیکن جو لوگ رہنمائی کرتے ہیں انھیں خواہ مخواہ افعال جمہور کی ذمہ داری کا بار خود اپنے سر لے لینا پڑتا ہے۔ اس فیصلہ کے بھی وہی ذمہ دار ہو جاتے ہیں جس پر ان افعال کا دار و مدار ہوتا ہے نیز کثیر القعد اور انفرادی اس صورت حالات کو پسند کرتے ہیں اس نئے جمہوریت کا حاصل ہونا قطعاً ممکن نہیں بخلاف اس کے اگر عام انسان مختلف پیشواؤں میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے اپنا پیشوا بناتا ہے تو وہ کسی ایسے نا اہل کو پسند کر لیتا ہے جس کی باتیں اس کی سمجھ میں آ سکتی ہیں اس طرح وہ جماعت کی بربادی کے درپے ہو جاتا ہے ورنہ دو ایسے غیر معمولی صفت کے انسان کو اپنا رہبر بنا لیتا ہے جسکی نگرانی معمولی عقل والا انسان نہیں کر سکتا اس طرح جمہوریت کا خون ہو جاتا ہے۔

علاوہ بریں کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی جمہوری نظام قلیل القعد اور جماعتوں کو ان کی واجبی طاقت حتی الامکان نہیں دے سکتا۔ جمہوریت میں

حکومت کرنے والی طاقت وہی ہو سکتی ہے جو جمہور کے اراکین میں زیادہ عام ہوتی ہے لہذا جمہوریت کی طرف جس قدر زیادہ پیش قدمی ہوگی اسی قدر استثنائی و غیر معمولی ذہانت والے اشخاص کا جماعت پر حکم اثر پڑے گا۔ جن معیاروں کو صرف چھوٹے گروہ سمجھ سکتے ہیں ان کے حصول میں اس وقت بھی ہرج واقع ہو جاتا ہے جب وہ ترقی کن ہوتے ہیں جمہوریت میں کسی طریقہ سے بھی اصلی ارباب فہم کے چھوٹے سے طبقہ کا امتیاز ان اشخاص کے تغل ترین طبقہ سے نہیں کیا جاسکتا ہے جو کوئی رائے قائم ہی نہیں کر سکتو ان کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں کو اوسط درجہ کے انسانوں کا تابع ہو جانا پڑتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جمہور کی سرعت اور موثر کارروائیوں کے سبب سے جمہوریت اور تنظیم ان دونوں چیزوں میں موافقت نہیں ہو سکتی۔ ہم مستعد جمہوریت پرستی پر ایل ہوتے ہیں اسی قدر تفویض اختیارات میں دشواریاں پیش آنے لگتی ہیں۔ انتظامی جماعت کمزور ہو جاتی ہے قانون سازی میں حائل واقع ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں ہمارے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ جمہور کے سمست روادار بے تکے خیالات کا لحاظ کریں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ نہ تو جلدی سے کوئی قطعی رائے قائم ہو سکتی ہے اور نہ عالمانہ کارروائی ہی اختیار کی جا سکتی ہے اس کے علاوہ مختلف گروہوں کی تنظیم کے بارے میں جمہوریت کا جو معیار ہے خواہ وہ گروہ ایسے اقوام ہوں جو کسی حکومت میں شامل ہوتے ہیں اور خواہ وہ جداگانہ بڑی ملکیتیں ہوں مگر اس کے خلاف یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ

اس سے چونکہ کثیر التعداد اشخاص میں جدت عمل نیز کمال شخصی ذمہ داری کا مادہ نہیں ہوتا ہے اس لئے جنگ جمل کے لئے تیاری کرنے سے ان کی توقیر کم نہیں ہوتی پھر اگر انفرادی حضایل پر جنگ کے متعدد و خراب اثرات پڑتے بھی ہوں تو بڑی بڑی حکومتوں کی نوعیت ہی ایسے ہوتی ہے کہ ہر وقت انہیں جنگ چھڑ جانیکا اندیشہ رہتا ہے اس لئے ہمیں جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے صاف الفاظ میں اس کا یہ منشا ہے کہ مڑائی معاشرے کا ایک دستور وادی ہے۔

عادت سے جو دلیل اخذ کی جاتی ہے وہ صرف ایسے شخص کے خلاف کار آمد ہو سکتی ہے جس کا خیال ہے کہ محض داروں کے تغیر و تبدل سے ہم کو کل ہی جمہوریت حاصل ہو جائے گی کیونکہ اس قسم کی قوت کا انحصار محض اس واقعہ پر ہے کہ عادات میں تغیر رفتہ رفتہ ہوتا ہے لہذا جنگ کا رواج بھی دنیا سے ایک روز میں مفقود نہیں ہو سکتا۔ اس معیار کے خلاف اور جس قدر دلیلیں پیش کی جاتی ہیں حالانکہ وہ قطعی نہیں ہوتی ہیں مگر ان سے یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ جمہوریت پرستی میں کمزوری کہاں واقع ہے۔ ان دلیلوں سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ معیار خود غلطی پر مبنی ہے بلکہ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ انفرادی مساوی ترقی کا موقع حاصل کرنے کی مساعی ناکام ہوتی ہیں۔ اب علم کی کم وقتی سے وہ کوششیں از خود کمزور ہو گئی ہیں مکمل اور زندگی پیدا کرنے والی تعلیم دینا ہی جمہوریت کیلئے واحد کفالت ہے کیونکہ جب تک طاقت کے استعمال کا طریقہ معلوم نہ ہو طاقت ایک خطرناک شے ہوتی ہے جس نے دنیا کا دار و مدار بھالت پر ہوتا ہے وہ اکثر ترقی میں رخنہ انداز ہوتی ہے لیکن اگر

تعلیم کی نشر و اشاعت وسیع پیمانہ پر ہوتی ہے تو پیشواؤ کا انتخاب بھی اچھا ہوتا ہے ان کے افعال کی نگرانی بھی نتیجہ خیز ہوتی ہے علم سے انسان کو قلیل التعداد جماعتوں کو ان کے حقوق عطا کرنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اس سے مجمعہ کی جوش و خروش کی روک تھام نیز غیر معمولی قابلیت رکھنے والے اشخاص کی حفاظت ہوتی ہے۔ سوچنے کی قابلیت سے جو ہر شخص کے پاس کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود ہوتی ہے کثیر التعداد اشخاص میں بہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ آبادگی عمل کے لئے خود کو ایک نظام میں منضبط کر سکتے ہیں اس طریقہ سے زیادہ انسان کے ارادہ میں اثر پیدا ہو جاتا ہے اب رہیں وہ عادات جو جماعت میں زائد یا سے سلف سے چلی آرہی ہیں ان کے بائے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم کے ذریعہ سے نزاع کے وقت تشدد سے کام لینے کی حیوانی خصلت معدوم اور معقولات سے کام لینے کی عادت اور بھی مستحکم ہو جائے گی۔ یہ عادت بھی کسی طرح کم قدیم نہیں ہے حالانکہ بعض مرتبہ کم زور پڑ جاتی ہے۔ سہولت جو قومیں آزاد ہوتی ہیں ان کے اور متعدد قدیم ترین سنلوں کی یہ نصب العین ایک الہام ہے ایک وحی ہے مختلف سیاسی جمہوروں کے مابین تعلقات کی جدید تنظیم کرنے میں اس معیار سے یکساں طور پر رہنمائی ہوتی ہے۔ اس میں نہایت زبردست طاقت یہ ہے کہ یہ اس قسم کا معیار نہیں ہے جو اکثر اکیٹ کے مانند محض افراد کے واسطے یا قومیت کی طرح جمہوروں کے لئے مقصود ہو اس سے دونوں کو فائدہ پہنچتا ہو

کیونکہ کسی قوم یا حکومت میں اس وقت تک جمہوریت واقعی نہیں قائم ہو سکتی جب تک دوسری قوموں یا دوسری حکومتوں کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت جمہوری نہ ہو اور حکومتوں کے مابین اس قسم کا کوئی تعلق اقتت تک نہیں قائم ہو سکتا جب تک بقول کینٹ کسی نہ کسی منہی میں جمہوری نہ ہو۔

تیرھواں باب

بین الاقوامی اتحادیہ



آج سے کچھ عرصہ پیشتر جو مبہم ترین بین الاقوامی تعلقات رائج تھے اب ان سے ایک قطعی سیاسی تصور پیدا ہو گیا ہے کیونکہ اب کسی اشتراکیت پسند بین الاقوامی انجمن میں محض انسانی اخوت یا کاریگروں کا باہمی اتحاد ہی نہیں نظر آتا ہے بلکہ اس کی بدولت ایک ایسی دنیا بن گئی ہے جس کے ذریعہ سے تمام قومیں اپنے خارجی تعلقات کی تنظیم میں خود براہ راست قیام امن و آشتی اکیلے کوشاں رہتی ہیں۔

گذشتہ ابواب کے مانند ہم اس باب میں بھی اپنی توجہ معیار ہی تک محدود رکھیں گے اور اس نظام عمل کو بالائے طاق رکھ کر اس پر غور نہ کریں گے جس کے مطابق معیار پر فوراً عمل درآمد ہونا چاہئے اور جو

سعادہ بین الاقوامی کی بنیاد قرار دیا گیا ہے ہیں یہ دریافت کرنا چاہیے کہ
 آخر دنیا کی حالت بہتر بنانے کے لئے کون ایسا عام تصور ان لوگوں
 کے دلوں میں محرک ہو رہا ہے جو انجمن اقوام کے مدعا سے بخوبی واقف
 ہیں۔ ہر حکومت میں اکثر اشخاص کا یہ خیال ہے کہ سیاسیات خارجیہ
 کے دائرہ میں کام کرنے کی سخت ضرورت ہے لیکن ایسے لوگ بہت
 کم ہیں جن کا دل انجمن اقوام کے معیار سے متحرک و متاثر ہوتا ہے۔
 بعض اشخاص اپنی مملکت کو اس قدر زبردست و مضبوط بنا دینا چاہتے
 ہیں کہ مخالف اس سے مرعوب ہو کر پھر اس کے خلاف ہمارا اٹھانے
 کی ہمت نہ کر سکیں بعض حضرات کا خیال ہے کہ سیاسی تنظیم کے بارے
 میں کوئی تدبیر اس وقت تک کارگر اور موثر نہیں ثابت ہو سکتی جب تک
 تعلیم مذہب یا تجارت کے ذریعہ سے انسانوں کی عام دماغی کیفیت
 میں تغیر نہ واقع ہو جائے۔

بعض سمجھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی فرشتہ امن نازل ہو گا۔
 جو تمام معاملات کا انتظام کر دیگا لیکن جس قدر صحیح الدماغ اشخاص ہیں
 ان سب کا بالعموم یہ خیال ہے کہ بڑی بڑی حکومتوں کی موجودہ حالت
 ہرگز پسندیدہ نہیں ہے۔

اس وقت جو نقص ہے وہ صاف ظاہر ہے اور وہ نیا نہیں
 وہ خرابی ہے جنگ اور جنگ کے لئے تیار رہنا محض ذرائع تباہی
 کا استعمال اور ان کی ترقی کا شمار قور میں نہیں ہے یہ خرابی قدرتی

اسی وجہ سے اس میں اصول عمل کی تعلیم کا سوال پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ یہ اصول جمہوریت کے متضاد ہے لہذا انجمن اقوام کے معیار کا تعلق ان معنوں میں جمہوریت سے ہے کہ اس کا دار و مدار اور ترغیبات کے اصولوں پر ہے جو جنگ و جدل کے اصول کے خلاف ہوتے ہیں لیکن ہمیں حرب اور اس کی تیاری کے ان پہلوؤں کا تذکرہ کرنا ہے جن کا ذکر معیار جمہوریت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے کے وقت نہیں کیا گیا تھا۔ ذاتی ذمہ داری یا انفرادی آزادی پر معرکہ آرائی کا جو باز عمل ہوتا ہے اس کا بیان علیحدہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ ان سیاسی خرابیوں کا مفصل تذکرہ کرنے کے لئے جو جنگ کے سبب سے رونما ہوتی ہیں ہمیں ان نقایص کیساتھ منسلک کرنا پڑے گا جن کا سطور ذیل میں ذکر کیا جائے گا۔

اولاً جنگ و جدل سے معاشی بربادی ہوتی ہے۔ تمام دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ اگر لڑائی کی وجہ سے مصر، اسپین، یونان، روم اور زمانہ وسطی کے یورپ کے دولت و قوت کے فراہم شدہ ذخائر برباد و تباہ نہ ہو گئے ہوتے تو اس وقت تک نہ معلوم کتنی دولت ان ملکوں میں موجود ہوتی۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ متعدد دیگر اقسام کے نقایص پیدا ہو گئے ہیں لیکن تباہی دولت اور نقصان علم یہ دونوں باتیں خود ہی بہت بڑی خرابیاں ہیں۔ روز بروز جنگ و جدل تباہی خیز اور تباہ کن صورت اختیار کرتی جاتی ہے جس قدر نئی لڑائیاں ہوتی

ہیں اسی قدر کثیر البعد و النساءوں کو مسفقت بخش سامان کی پیداوار کے بجائے اسباب تباہی یا سامان حفاظت کی تیاری میں مصروف ہو جانا پڑتا ہے جو سامان تباہی ملک کے لئے برائے استعمال درکار ہوتا ہے اس کی تیاری اقتصادی تنظیم حکومت کے زیر انتظام ہوتی ہے اور اس کی تیاری کا انتظام کرتے کرتے حکومت ایک تجارتی کاروبار کی شکل اختیار کر لیتی ہے بعض اس تغیر کو پسند کرتے ہیں اور بعضوں کو افسوس معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے حکومت کا کوئی خاص تعلق انصاف و حریت کے ساتھ نہیں رہتا۔

ثانیاً جنگ سے زندگی اور خیالات کی بربادی ہوتی ہے فی زمانہ دنیا میں جس قدر لڑائیاں ہوتی ہیں اسی قدر اضافہ کسی جنگ جو حکومت کے شہر و آزا اور غیر شہر و آزادوں قسم کے آدمیوں کی تعداد اموال ہو جاتا ان اموات سے تمدنی نقصان نہایت شدید ہوتا ہے اور وہ بھی محض ایک ہی ملک میں نہیں۔ زمانہ جنگ میں نوجوانوں کے اموات کا اوسط بڑھ جاتا ہے جس سے معاشرتی نقصان اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔ حال کی لڑائیوں میں ایک یہ بھی بڑا نقصان ہوتا ہے کہ پیدائش کا اوسط گھٹ جاتا ہے پیدائش کے سلسلے میں بعض تعداد کے خیال پر نظر نہیں رہنا چاہئے ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ اگر شرح پیدائش میں تخفیف نہ واقع ہوتی تو جو لوگ پیدا ہوئے ان کی معلومات و فراست نیز قابلیت سے معاشرہ کو فائدہ پہنچا اور جو تعداد پیدائش میں کمی واقع ہوئی اسی لئے یہ نقصان پہنچا کہ جو فائدہ معاشرہ کو ان باتوں سے دستیاب ہو سکتا تھا وہ نہیں پہنچ سکا۔ علامہ بریں افرونی

اموات اور تنخیف پیدائش کے سوال سے قطع نظر بھی کر کے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ کسی جنگ عظیم کے دوران میں موجود ہوتے ہیں ان کے خیالات کی بحد بربادی ہوتی ہے کیونکہ تذبذب کے سبب سے انسان ترقی بخش فہمیدگی سے کام نہیں لے سکتا۔ ہوشیاری کے ساتھ سوچنے کی طاقت دوران جنگ شاہ کن قوتوں کو ترقی دینے یا جو بانا ایسی قوتوں کا مقابلہ کرنے میں صرف کر دیتی ہے۔ کسی شخص میں بھی دُور دُور تعمیری تدابیر پر غور کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اگر معمولی حالات میں امراض کے علاج اور ان کے السداد کے غرض سے درس کر کے ہمارے انسانی ذرائع میں افزونی کرتا ہے تو جنگ کے زمانہ میں اس کو مجبوراً زہریلے دھوکوں اور ان کے اثر کو زایل کرنے والی چیزوں کے لئے اپنی تمام طاقت صرف کرنا پڑتی ہے اور مورخ تو ایک سرکاری عذر خواہ ہوتا ہے۔ جن باتوں میں ادارہ جنگ سے بربادی ظہور میں آتی ہے ان کی یہ محض چند مثالیں ہیں۔

علاوہ بریں جیسا کہ عرصہ ہوا کہ ہائز نے کہا تھا کہ استعمال طاقت کے ساتھ ساتھ فیرب سازی بھی ہونے لگتی ہے کارروائیوں کے اختصار کا صحیح منشا یہ ہوتا ہے کہ دشمنوں کو دھوکا دیا جائے کیونکہ جب زور و طاقت حاصل کرنا ایک اصول مانا جا چکا ہے تو یہ بھی ذیل باسانی پیش ہو سکتی ہے کہ اس کے استعمال کے لئے کوئی حد بھی نہ مقرر ہونا چاہئے۔ ممکن ہے کہ یہ بھی کہا جائے کہ کارروائی جس قدر بیدردانہ کی جائے گی اسی قدر قوت کے استعمال کا خاتمہ ہونے لیکگا۔

آخری بات یہ ہے کہ اب مملکت کے نسبت یہ خیال دلوں میں جاگزیں ہو گیا ہے کہ شہریوں کی فارغ البالی میں افزونی کرنے کے لئے فرمانروائی کا وجود ہوتا ہے۔ ہر حکومت اپنے اپنے دائرہ حکمرانی کے اندر معاشرتی اصلاح اور انسانی نیز قدرتی ذریعہ کی ترقی میں حصہ لینے لگتی ہے لیکن زمانہ حال کے دول کے باہمی تعلقات اس قدر قریب ہو گئے ہیں کہ دوسری حکومتوں کی امداد اور اختراک کے بغیر کوئی واحد مملکت اپنے خاص شہریوں کی فلاح و بہبودی کا سامان مہیا نہیں کر سکتی۔

امراض اور جرایم ایک حکومت کی سرحد سے نکل کر دوسری مملکت میں پھیل جاتے ہیں لہذا ان کے اسناد کے لئے سرحد کے دونوں جانب سے مشترکہ کارروائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذریعہ میں اس وقت تک اضافہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ غیر ملکوں کی پیداواریں کام میں نہ لائی جائیں گی اور وہاں اپنے ملک بنا ہوا مال نہ بھیجا جائے گا۔ مگر جنگ کے لئے تیاری کرتے رہنے سے آزادانہ میل جول نیز مشترکہ عمل میں خلل واقع ہوتا ہے اسی لئے لڑائی مخالف ہے ان تمام اغراض کی جن کی تکمیل کے لئے مملکت کا قیام عام طور پر مانا جاتا ہے جو لوگ جذبات سے غیر متاثر رہ کر سمجھتے ہیں کہ ان تمام باتوں سے بربادی اور خرابی رونما ہوتی ہے ان میں سے چند کے دہیں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ دنیا میں ان مملکتوں اور قوموں کی ایک جدید حالت قائم ہو سکتی ہے یہ صورت وہ ہے جس میں اولاً ان مقاصد کو پورا کرنے میں تمام حکومتیں مشترکہ کارروائیاں اختیار کیا کریں گی جن کی متعدد مملکتوں کے شہریوں کو بالعموم ضرورت رہتی ہے

تفصلاً جرایم اور امراض ہر حکومت کے شہریوں کی مکمل اور آزادانہ زندگی میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ جدید خیال کے مطابق تمام دول ان امراض اور جرایم کے افساد کے لئے باہمی رضامندی سے یا مشترکہ کارروائی اختیار کیا کریں گے۔ اس کے علاوہ تمام حکومتوں کے شہریوں کے لئے یہ بھی بہت ضروری ہے کہ سلسلہ رسل و رسائل نیز باربرواری وغیرہ تمام دنیا کے ساتھ جاری ہو۔ لہذا تمام ملکوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مشترکہ جدوجہد کریں۔ ثنائی اس نئی دنیا کا انتظام اس طریقہ سے ہو گا کہ جن باتوں کے متعلق حکومتوں میں باہم اختلاف ہو یعنی جن سے ایک کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان پہنچتا ہو۔ انکا تصفیہ کسی مقنن یا انجمن سیاسی کے ہاتھ میں دیدیا جائے انجمن اقوام کے معیار میں یہ منشا شامل ہو کہ دنیا سے جنگِ جدل کا نام و نشان معدوم ہو جائے حالانکہ مستقبل قریب میں جو کوئی بھی انجمن قائم کی جائے گی اس کی فہرست عمل سے جنگ کے تمام امکانات کے خاسج ہونے کی امید کو مبہوم سمجھنا چاہئے۔ گویا ایک معنی میں اس کا یہ مطلب ہے کہ انجمن کے معیار کو ہر شخص تسلیم نہیں کرتا اسکی حمایت دہی کرتے ہیں جن کو جنگِ جدل کے بمقابلہ امن و شہتی زیادہ پسند ہے کیونکہ انہیں کے دل میں اس معیار سے تحریک ہوتی ہے۔ یہ فرض کر لینے سے کچھ کام نہیں نکل سکتا کہ ایسے استخا ص کے مانند ہر شخص کی خواہش ہو کہ دنیا سے جنگِ جدل کا دستور ہمیشہ کے لئے ناپید ہو جائے۔

یہ صحیح ہے کہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جنگِ بھالی امن کے لئے

کی جاتی ہے اس میں بھی کلام نہیں کہ غلامی کی حمایت بھی اسی خیال سے کی جاتی تھی کہ اس سے خود غلاموں کو ہی فائدہ پہنچتا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی بالکل درست ہے کہ اکثر لوگ ایسے تھے جو دستور غلامی کو معاشرے کی دوسری تمام مکن خیال صورتوں پر ترجیح دیتے تھے۔ نیز اس وقت بھی ایسے سعد یا انشعاص موجود ہیں جنہیں اور تمام نعم الابدال کے بمقابلہ جنگ زیادہ پسند ہے۔ بہر حال اس عجیب و غریب تفوق و برتری کے متعلق ہم کوئی بحث نہیں کریں گے ہماری توجہ صرف انہیں حضرات کی طرف محدود رہے گی جو انجمن اقوام کو ایک معیار تصور کرتے ہیں۔

معیار کی قدیم صوتیں

اس معیار کی تاریخ کے تین خاص دور ہیں۔ پہلے دور میں صرف چند سمجھدار اور پڑھے لکھے اصحاب اس معیار کی حمایت کرتے تھے۔ دوسرے دور میں ان لوگوں نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کیا جو سیاسی نقطہ خیال سے بااثر تھے اور آجکل یعنی تیسرے دور میں کثیر التعداد مرد و زن نہایت عمرت کے ساتھ اسی معیار سے متاثر ہو رہے ہیں۔ پہلا دور قرون وسطیٰ اور نشاۃِ جدیدہ کے اربابِ حل و عقد کا ہے۔ دوسرے دور میں انیسویں صدی خیال ہے اور تیسرا دور وہ ہے جس میں ہم نے حال ہی میں قدم رکھا ہے۔

مازمن و کیم کے ہم پر فتح پانے کے کچھ عرصہ قبل کیا رہیوں صدی

کے نہایت خشکین زمانہ میں اندرونِ فرانس اور دریا سے رہائش کے کنارے
تہذیبِ جدید کے دور کا آغاز ہوا۔ مگر جنگ کے سبب سے اس کو متواتر
پامالی نصیب ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ تاریک کا دور دورہ پھر
وہاں شروع ہو گیا۔ لڑائیوں کے بعد فصلوں کی تباہی ہوتی اور پھر قحط
امراض نے زور پکڑا تھا قحط تو ایسا ہولناک تھا کہ انسانی گوشت کھانے
تک فوبت آگئی ایک وقایع نگار کے بیان کے مطابق یہ گوشت سلاخوں
پر پکا پکا کر بھیجا جاتا تھا۔ بعض مقامات پر تو تازہ دفن شدہ مردے
کھود ڈالے گئے اور ان کا گوشت استعمال کیا گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ یورپ
میں اسی مردم خوری کا یہ نتیجہ ہوا کہ پہلی مذہبی جنگ میں سپاہیوں کے لئے
مردہ خوری بہت آسان بات ہو گئی۔ انھوں نے واقعی ان کا گوشت
استعمال کیا بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں لوگ امن و آمان کے لئے
فریاد کرتے لگے۔ بہت سی دوسری تحریکیں بھی جاری ہوئیں جن میں وہ کچھ
قابل ذکر ہے جس کا نام کچھندگانِ خدا یا ”انجمنِ خدامن“ تھا
۱۸۶۲ء کا واقعہ ہے کہ ایک سنجار کو ایک جنگل میں لیڈی مریم کی صورت دکھائی
دی۔ لیڈی نے سنجار کو ہدایت کی کہ ”جاؤ اور ایسے آدمیوں کی ایک
جماعت بناؤ جو متحد ہو کر جنگ کے خلاف مقابلہ کریں اور یہ مناجات
ان کے در و زباں ہے۔“ اے فرزندِ الہی تو دنیا کو تمام گناہوں سے
آزاد کرتا ہے ہم کو امن و آمان کی دولت عطا کر“ برصغیر نے اسی ہدایت
کے مطابق ”انجمنِ برادرانِ امن“ قائم کی جسے اپنے مقصد میں کما حقہ

کا میابی حاصل ہوئی۔ انجمن کے ماننے میں اور کچھ زیادہ تجروری حالات نہیں ملے تھے۔ بہر حال ان برادران امن اور بعد از ابتدائی زمانہ کے زانیوں یعنی درویشوں کے مساعی جلیلہ قرون وسطی کے اتحاد میں بھی شامل ہیں جن کا تذکرہ پیشتر کیا گیا ہے۔ ایسی انجمن کے قیام کے بارے میں جس قدر خیالات بعد کو ظاہر کئے گئے ہیں ان کا دار و مدار اسی اتحاد پر تھا۔ زمانہ وسطی کا مسلک اس عقیدہ سے محدود تھا کہ زبردست مرکزی حکومت تھی امن و عافیت کی واحد کفالت ہو سکتی ہے لیکن اس کے بعد کئی نظریات پیدا ہو گئے انداد جنگ کی غرض سے ملکوں کی ایک انجمن قائم کرنے کا خیال پیری وڈوئے کی قضیفات میں بھی ظاہر کیا گیا ہے جو چودھویں صدی کے آغاز میں فلند ہوئی تھیں۔ ایک کتاب در اصل مقدس کی دریافت میں پیری نے جو تجویز شایع کی تھی کہ تمام قوموں کو اپنے حالات کا باہمی تصفیہ نہایت سے کر لیا جائے اور مناسب ہے کہ اس مقصد کے لئے ایک بین الاقوامی عدالت قائم کی جائے۔ مصوف نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اگرچھوٹی چھوٹی لڑائیاں بند ہو جائیں تو بڑی بڑی لڑائیوں کا سلسلہ بھی منقطع ہو جائے گا ان کا خیال تھا کہ جنگی قوموں یا حکومتوں سے معاشی تعلق ترک کر دیا جائے جس کی اجازت دینے کا اختیار ایک فوق الاقوامی جماعت مجاز کے ہاتھ میں ہو۔

یہ خیال کہ یورپ کے تمام بادشاہ کسی نہ کسی معنی میں ایک خاندان کے رکن ہیں۔ قرون وسطی کے بعد جاری نہ رہ سکا۔ اسی وجہ سے زمانہ بعد میں

ارباب فہم کو یہ رائے قائم کرنا پڑی کہ یورپ میں جداگانہ بڑی بڑی حکومتیں ہونا چاہئے
 ملکوں کو فائق جوہر تسلیم کرنے کی وجہ سے جو تشدات کئے جاتے ہیں ان کے
 خلاف زمانہ احیاء میں احتجاجی کاروائی کی گئی۔ بڑی حکومتوں کی ایک برادری
 یا انجمن قائم کرتے۔ کے خیال سے اتحاد یورپ کے پاس میں قرون وسطی کا تصور
 بھی جاری رہا۔

ایٹریس کے خطوط سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ ادارہ جنگ کے
 خلاف ذہنی مخالفت کی گئی ایک اتحادیہ امن قائم کرنے کے لئے تدابیر بھی معر
 عمل میں لائی گئیں تھیں۔ اس قسم کی ترکیبوں پر عمل درآمد کرنے والوں کے سلسلے میں
 موصوف نے سیورس کے ولیم کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے
 معمولی طریقہ سے معاہدہ کرنے کی تجویز کی تھی جس سے بادشاہوں کا ایک اتحاد
 قائم ہو جائے اور انجمن اقوام کا کام یہ ہو کہ وہ پنچایت کے ذریعہ سے تصفیہ
 مسائل کا رواج جاری کرے۔ مگر اس تدبیر کا کچھ نتیجہ نہ نکلا اس کے بعد ایٹریس
 نے اپنی تصنیف ”شکوہ امن“ قلمبند کی۔ اس کتاب میں کوئی تعمیری نظام عمل
 نہیں درج کیا گیا ہے۔ پھر بھی اس میں جذبات کے خلاف ایک نہایت موثر
 آواز بلند کی گئی ہے کیونکہ ایٹریس کا خیال تھا کہ محض جذبات کے سبب سے
 تعمیری قومیت کا قیام نہیں ہو سکتا۔

۱۹۲۲ء میں ایمرک گروس نے اپنی کتاب ”نیو سیناس“ شائع کی
 اس میں انجمن اقوام کے قیام اور پنچایت کے ذریعہ سے فیصلہ پر زور دیا گیا ہے۔
 اقتصادی نقطہ خیال سے جنگ کے خلاف جو دلیلیں اس کتاب میں درج

کی گئی ہیں اُن میں جدت پائی جاتی ہے۔ سستی کی سرگہشت کی نسبت
 کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب ۱۶۲۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے ہم کو فرانس کے
 تاجدار ہنری چہارم کی اس عظیم الشان کارروائی کا حال معلوم ہوتا ہے جس کے
 مطابق تمام حکومتوں کے ایک وفاقہ کے ذریعہ سے حصول امن کی کوشش کی جانی
 والی تھی۔ انگلستان کی ملکہ الزبتھ اس عمل کے حق میں تھی۔ اس میں تین خاص
 خاص باتیں شامل تھیں۔

(۱) یورپ کے تینوں قسم کے مذہبوں میں یکجاگت و اتحاد پیدا کرنا۔

(۲) عیسائیوں کے موروثی امرا کی طاقت میں مساوات اور یورپ کے
 پندرہ دلوں کی ایک مجلس شوریٰ قائم کرنا جو عدالت و نظم و نسق کے معاملے میں
 ثالث اعلیٰ ہو۔ بشرطیکہ تمام ریاستیں اس بات پر راضی ہوں کہ اگر ایک حکومت
 سلسلہ جدال و قتال شروع کرے گی تو باقی تمام مملکتیں متحد ہو کر اس پر کڑی
 کر دیں گی۔

۱۶۹۳ء میں ولیم آئن نے ایک مضمون بعنوان ”یورپ کا موجودہ و آئندہ
 امن“ تحریر کیا۔ جس میں ایک عدالت ثالث کے قیام کی تجویز دی ہے۔ اس
 میں جان بلرز نے ایک رسالہ شائع کیا تھا جس میں ایک اتحادیہ کے قیام کی
 رائے دی گئی ہے اور جس کی سرخی یہ ہے ”آئندہ تاجداروں اور مملکتوں کے
 حدود و حقوق کے متعلق نفسیہ نزاع کی غرض سے ایک یورپی حکومت کے قیام
 اور ایک سالانہ کانگریس کے انعقاد کیلئے چند دلائل“۔

لیکن اس قسم کی تمام تدبیریں خاص طور پر بے اثر ثابت ہوئیں اس شعبہ

میں جو کچھ بھی ترقی پذیر کارروائی سترھویں صدی کے درمیان کی گئی وہ یہ تھی کہ تمام قوموں کے لئے قوانین مرتب کئے گئے تھے جن کو اس زمانہ میں قانون اقوام کہتے تھے اور جن کا نام آجکل قانون بین الاقوامی ہے جیسا کہ پیشتر دیکھا جا چکا ہے۔ گروٹشس نے چند ایسے اصول دریافت کرنے کی کوشش کی تھی جنکے ماتحت حکومت کے خارجی افعال سرزد ہوتے ہیں پیونڈارف نے ان اصولوں کو باقاعدہ ترتیب دیا اور ویٹل نے وساطت اور فیصلہ بذریعہ ملاقات کے متعلق بحث کی لیکن ان ثالثوں کا تعلق تنظیم امن سے اس قدر نہ تھا جتنا جنگ کے دستور سے تھا اور انھیں کی مدد سے بین الاقوامی ارباب خیال کی ساری باتیں جنگ میں رعب و طاقت کے استعمال کی حد مقرر کرنے کی طرف مبذول دیکھ کر ہو گئی۔

تاریخی نقطہ خیال سے اتحادیہ کے موضوع پر نہایت اہم تصنیف "پروجٹ" کی ہے جو ایسے ڈی سینٹ جی نے قلمبند کی ہے اس کا نفس مضمون اس قدر قریع نہیں جس قدر وہ سرچشمہ بہت جس سے یہ مضمون اخذ کیا گیا ہے۔ ایسے نے اپنی دیباچہ میں ان تدابیر کا ذکر کیا ہے جو پندرہویں صدی میں اختیار کی گئیں۔ موصوف نے انہیں تدابیر کو زمانہ بہت دیکر اسے ذی بے کہ امن دواہی کے قیام کے لئے ۱۹ ویں صدی کا ایک دنا تہ نامہ لکھا ہے۔ اس دورپ کے لئے ایک کانگریس تجویز کیا گیا تھا جیسے پہلے پہل فرانس کی طرف سے قدم اٹھا باجائے ناقہ رہا ۱۹۵۷ء میں روس کے ساتھ میں دامن دوامی کی عنان ادارت تھی اس موضوع پر موصوف نے اکثریت نامہ جو سالہ قلم بد گیا ہے اس میں نہایت

عوز و حوض کے بعد یہ بتایا ہے کہ حکومتوں کے تعلقات باہمی میں جو طوائف
 کی حالت ہمیشہ رہا کرتی ہے اس کا صرف یہ علاج ہے کہ کسی نہ کسی طرح کی
 وفاقی حکومت قائم کی جائے موصوف نے وضاحت کیسا تھا یہ بتا دیا ہو کہ
 موجودہ صورت حالات دوامی جنگ کی ہے کیونکہ جو معاہدہ اس کیا جاتا ہے
 اس کے پس پر دو بھی جنگ کا نشانہ ہو جو درہنہ ہے اس کے لئے ایک نئی بنیاد
 وفاقہ میں مل سکتی ہے جس میں ایک مجلس شوریٰ ہو اور جس کو یہ اختیار حاصل ہو
 کہ جو ملکات اور کباب جنگ کی مجرم ہو وہ یورپ کے زیرِ لعنت کر دی جائے
 جنگِ جدل کے طرز کی متحدہ کا رائیابی رفاقت کب کرے۔ لیکن ایک دوسرے
 مضمون میں روسوں نے اس فکرو عنصر پر بھی بحث کی ہے جو اس خاکہ میں موجود ہے
 جو یورپی وفاقہ کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ یہ فکری بہت سادہ تھی اس میں سیاسی
 جذبات اور بین الاقوامی زندگی کی سیدگی کو کچھ پروانہ کی جاتی تھی مگر اس قسم کے
 الزام دوسری تحریکوں اور تدبیروں پر بھی عائد ہو سکتے ہیں جنگِ فلسفیوں نے جنگ
 نعم البدل قرار دیا تھا۔ روسوں نے خود بھی اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کوئی قطعی
 رائے نہیں دی۔ ٹیکنیک کی تصنیف ”اسن دوامی“ میں ایک قطعی ترکیب پیش
 کی گئی ہے جس میں بڑی بڑی ریاستوں کے باہمی تعلقات کی وہی حالت قائم
 کرنے کے لئے رائے دی گئی ہے جو موجودہ زمانہ میں رائج ہے اس میں جو خیال
 نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ دول کا ایک اتحاد یہ قائم ہونا چاہئے۔ یہاں دی گئی
 ہے کہ جن حالات سے جنگ نافع ہو جائیگا احتمال ہو پہلے ان کا انسداد کیا جائے
 اس سے خواہ مخواہ یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ معاہدات صلح ایسے ہوں جن میں یہ سب

سے کام لے کر پس پردہ جنگ کی تیاریاں کی جائیں اور مستقل افواج کا فوراً
 سدباب ہو جائے نیز معاملات خارجہ میں دخل دینے کے لئے کوئی بھی قومی
 قرضہ کسی کو نہ دیا جائے۔ کسی مملکت کو دوسری حکمرانی کے انتظام میں دخل دینے
 کا کوئی حق نہ ہو اور محاصرت کی ترکیبیں محدود کر دی جائیں بعد ازاں ہم ہر فریاد
 کے اندرونی جمہوری آئین کی بنیاد پر انجمن اقوام قائم کریں جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آزاد
 حکومتوں کی ایک انجمن قائم ہو جائے گی کینٹ لے ایک دلیل یہ بھی پیش کی ہو کہ
 پر امن نظام ان مہذب کن رجحانات کا قدرتی نتیجہ ہے جن کا پتہ تاریخ سے چلتا ہے
 اس کتاب میں جو معیار صادق مطلق نظر رکھا گیا ہے وہ سیاسی واقعات کی اس منظر
 یا مشاہدہ کے مقابلہ زیادہ نمایاں ہے جو اس معیار میں موجود ہے۔ لہذا ہمیں سلی
 زیادہ باریکی کے ساتھ تحقیق و تجسس کی ضرورت نہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ اپنے اپنے
 عام رویہ میں ہا بز کا خیال غلط اور کینٹ کی رائے درست ہے۔ لیکن اس معاملہ میں
 ہا بز کی دلیل اور غور و خوض کینٹ کے مقابلہ میں زیادہ فائق و برتر ہے مگر کینٹ کی
 تصنیف سے پتہ چلتا ہے کہ اتحادیہ کے بارے میں جو معیار قدیم سے چلا آتا تھا
 اس میں اس نے ایک نئی زندگی پھونک دی ہے۔

مگر ان تمام تجویزوں کا رخ ایک ہی طرف ہے اس لئے یہ بات زیادہ
 اہم ہے کہ سیاسی کارروائیوں پر انکار اثر بہت کم پڑا ہے لیکن اس کا سبب زیادہ تر
 یہ ہے کہ ان تحریکوں میں معیار ان معنوں میں نہیں پیش کیا گیا۔ جن میں اس نقطہ کا
 استعمال ہم نے اپنی بحث کے اندر کیا ہے ان تجویزوں میں صرف چند ارباب فہم
 کے خیالات نظر آ رہے تھے۔ بخلاف اس کے سیاسی جماعت میں کثیر التعداد

اشخاص نے اپنے تدبیر اور سیاسی معاملہ فہمی کو اپنی ہی سرحد تک محدود کر لیا
 اس محدود خیال سے جنگ کی حمایت اس لئے نہیں کی جانی تھی کہ یہ امن کا
 مخالف ہے بلکہ اس کے سبب لوگوں کے دل میں یہ بات جم گئی کہ جنگ ایک
 امر ناگزیر ہے کیونکہ سرحد سے آگے ان غیر ملکی اشخاص کا سوال پیدا ہو جاتا تھا
 جن کی کوئی تفریق نہیں کی گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہی نظام اس وقت
 سرحد ہی تک محدود تھا۔

۱۔ تقاریر دوسری منزل میں اس وقت قدم رکھا گیا جب یورپی دولتوں کے
 با اثر اشخاص نے حکومتوں کی باہمی تنظیم کے خیال پر عمل درآمد کیا اس منزل میں
 خاص بات یہ تھی کہ دو جدا گانہ نوعیت کی انتظامی کارروائیاں اختیار کی گئیں
 یعنی ایک طرف سیاسی تنظیم ہوئی۔ مثلاً اتحاد مقدس اور وفاق یورپ قائم
 کیا گیا اور دوسری جانب معاشرتی تنظیم کی گئی۔ جس کی ایک مثال ڈاکخانہ جات
 کا بین الاقوامی اتحاد ہے۔ سیاسی حلقہ میں اتحاد مقدس سے کم از کم جنگی اتحاد کے
 تصور میں رد و بدل ہو گیا جو قدیم سے چلا آتا تھا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس اتحاد
 سے قیام امن کے معاملہ میں مہذب حکومتوں کے عام مفاد کی ترجیحی ہوتی ہے
 لیکن صاف بات یہ ہے کہ یہ اتحاد اس لئے کیا گیا تھا کہ حکومت کے مسئلہ اور
 اور بعضوں کے خیال کے مطابق وہ طریقہ جاری رہیں جو متروک ہو چکے ہیں
 اتحاد یورپ میں منصوبے بہت باندھے گئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اصولاً تو یورپی
 دولت کو صرف سیاسیات خطہ بلقان میں مشترکہ کارروائی کرنے سے سروکار
 تھا لیکن قومی تحریکوں کے باوجود اس میں جو سیاسی مخالفت اور اصولی اختلاف

جاری تھے ان کے سبب سے اس اتحاد پر عمل نہ ہو سکا۔ بہر حال اس کی موجودگی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملکوں میں متحدہ عمل کی خواہش بالعموم موجود تھی۔

حکومتوں کے باہمی تعلقات کی بنیاد پر معاشرتی تنظیم کی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۱۴ء کے قبل تک عوام الناس کی قریب قریب میں بین الاقوامی تنظیمیں قائم ہوئیں۔ ان میں دو اہم ترین قابل ذکر ہیں۔ اولاً ڈاکمانہ جات اور دوم آبن حفظان صحت جو قریطینوں اور وبائی امراض کا انتظام کرتی ہیں۔ ایسی تنظیمیں محض نیک نیتی ہی کام کرتی ہوئی نہیں نظر آتی ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ حال کے طریقہ زندگی کی خاص ضرورتیں حکومتوں کے عام مقاصد میں متحدہ کارروائی اختیار کرنے کے لئے آمادہ کر رہی ہیں۔

بعد ازاں کانفرنس کا قیام ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں حکومت روس نے قندھار کے مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے ایک کانفرنس کی تجویز پیش کی ۱۸۹۸ء میں اس کا انعقاد بمقام ہیگ ہوا۔ اس میں تین ملکوں کی طرف سے نمائندے آئے تھے۔ اس کانفرنس میں بصد غور و خوض جو دستور قیام ہوا اسکی رو سے یہ طے پایا کہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک طریقہ یہ رائج کیا جائے کہ طرفین کے درمیان ایک تیسری جماعت کو دخل و مستحولات کا اختیار ہو اور امور نزاعی کا تصفیہ کرنے کیلئے ایک بین الاقوامی تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جائے اس میں پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرنے والی عدالت کے اختیارات کی بھی حد بندیاں کی گئیں جو پہلی ہیگ کانفرنس میں قیام کی گئی تھیں۔ ان عدالت نے ابھی تک پندرہ منافشوں کا تصفیہ کیا ہے۔ بین الاقوامی تنظیم کا مزید ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ فیصلہ بذریعہ

پنجایت کے متعلق حکومتوں کے درمیان ۱۲۲ معاہدات ۱۹۱۲ء میں ہوئے اس کے بعد سے ایک نئے قسم کے معاہدہ کا طریقہ رائج ہو گیا جس میں طرفین کے مابین نزاعی امور کا فیصلہ کرنے کے لئے دو امی بین الاقوامی کمیشن قائم کرے کی اجازت دیدی گئی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے مختلف حکومتوں کے ساتھ اس قسم کے تین معاہدے کئے۔ ایک معاہدہ ایسا ہے جس میں ارجنٹائن، برازیل اور چلی بھی شامل ہیں۔

ان معاہدوں کے مطابق ایک ایسا کمیشن قائم کیا جاتا ہے جس کو تنازعہ فیہ امور سپر دکرے جاتے ہیں برطانیہ عثمانی کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا ہے اس میں کمیشن کو برسر نزاع حکومتوں سے یہ بھی کہنے کا اختیار حاصل ہے کہ وہ نزاع کی تحقیقات بھی کرے گا۔ اس کے علاوہ امریکہ کے اتحادیوں کے قائم ہو جانے ایک اور اہم صورت پیدا ہو گئی ہے کیونکہ اس انجمن میں شمالی اور جنوبی امریکہ کی حکومتوں کے عام مفاد کی ترقی کے لئے جدوجہد کی جاتی ہے ابھی تک ریاستہائے بین الاقوامی میں جو کشمکش جاری ہے وہ اس جدید صورت حالات سے بالکل بدل جائے گی۔

زمانہ جنگ میں ایک نئی قسم کا بین الاقوامی نظام قائم ہوا ہے۔ تمام جنگجو اور بعض جانبدار حکومتوں کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ اپنے حدود میں سامان خوراک سالہ جات خام برائے صنعت اور بار برداری کا انتظام خود کریں اس کے بعد سے حکومتوں کی کئی مشترکہ تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں۔ تحساد یوں کو مشترکہ خرید سامان خوراک اور سالہ جات کی تقسیم نیز جہاز سازی کے انتظامات

میں حکومتوں کی باہمی تنظیم کا تجربہ ہوا ہے۔ مرکزی طاقتوں نے بھی اپنے لئے مملکتوں کے مشترکہ نظام قائم کئے۔ اسی کی بنیاد پر اسکیٹنڈینیویا کے مالک نے شرح تبادلہ اور باربرواری کا انتظام کر کے ایک نئی پیشقدمی کی ہے اسی لئے ہجوہ صورت حالات ۱۹۱۴ء سے بالکل مختلف ہے۔ بین الاقوامی تنظیم خد باتوں کے لئے مقصود تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی زندگی میں اس سے کوئی نئی بات نہیں پیدا ہوئی۔ متعدد دول کی مشترکہ کارروائیوں کا ہم کو اب علی تجربہ ہوا ہے لیکن زمانہ پیشین کی مبہم بین الاقوامیت صرف انتظامی دفاتر ہی میں پائی جاتی ہے۔ خواہ کسی غیر دانشمندانہ کارروائی کے سبب سے یہ جدید نظام زمانہ امن میں نہ بھی قائم ہے مگر جو کچھ تجربہ حاصل ہو چکا ہے وہ بے سود نہیں ثابت ہو سکتا۔ بین الاقوامیت نیز مقاصد عامہ کے لئے متعدد دول کی کارروائیاں اب خیالی پلاؤ نہیں کہی جاسکتیں۔ ہم نے ایک جدید سیاسی دنیا میں قدم رکھا ہے جس میں علمی انسانوں کے متعلق سست روی تصور اور تکمیل شدہ واقعات یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں۔ ہم کو یہ مشکل ابھی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں کیا عظیم الشان پیشقدمیاں ہونے والی ہیں۔

جدید صورت حال

سیاسی زندگی اور سیاسی تخیل یہ دونوں باتیں انسانی اغراض سے جداگانہ نہیں ہیں۔ مادی حالات یا مذہبی جوش و خروش کا اثرات تقاضا سیاسی

کی بقا پر کارگر ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ عالیت اور اکثریت کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے لیکن فی الحال سیاسی زندگی کے کسی اور شعبے میں حالات اس قدر تبدیل نہیں ہو سے جس قدر تغیر ریاستوں کے باہمی تعلقات میں واقع ہو گیا یہ صحیح ہے کہ زمانہ وسطیٰ میں اسی طرح لوگوں کو انہیں اقوام قائم کرنے کا خیال تھا جیسا کہ آجکل ہم کو ہے یہ بھی درست ہے کہ انیسویں صدی میں پنچایت کے ذریعہ سے امور تنازعہ کے تصفیہ کی حمایت اسی طرح کی جاتی تھی جس طرح آجکل ہوتی ہے لیکن ان قدیم معیاروں کا وجود اب ایک ایسی دنیا میں ہے جس میں کلوں کی ایجاد اور علمی طبیعیات کی وجہ سے سترہواں ایک شاندار تغیر واقع ہو گیا ہے اب آمدورفت محض گھوڑوں کے ذریعہ سے اور سڑکوں پر نہیں ہوتی نہ سفینوں یا بادبانی جہازوں سے لوگ آتے جاتے ہیں۔ ریلوے، دوخانی جہاز، سوٹر اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے آمدورفت ہوتی ہے اس لئے موجودہ دور میں مختلف قوموں کو آپس میں ملنے جلنے کا موقع زیادہ رہتا ہے۔ اب مملکتوں کی سرحد سے تجارت میں کوئی ہرج نہیں ہوتا۔ اہل پیشین کے زمانہ میں جو محلات دور دراز واقع تھے اور جہان کا سفر ان کے لئے نہایت دشوار گذار تھا اب ان کی دوری سے سفر میں کوئی وقت نہیں ہوتی۔

برقی تار۔ ٹیلیفون اور لائیکلی پیام رسانی سے مختلف قوموں کے خیالات ایک طرف سے دوسری طرف پہنچاتے جاتے ہیں۔ نیر سینما کے اختراع سے بھی اجنبیت کا خیال دور ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے ابھی تک غیر ملک والوں سے ملنے جلنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ سیاسی شعبہ زندگی

میں جو خاص نتائج رونما ہوتے ہیں وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔
 دول کی تعداد میں تخفیف ہو گئی ہے مگر ان کے طول و عرض میں اضافہ
 ہو گیا ہے ان کی حکومت کے طریقے اور ان کے بعض ادا سے متلا جنگی خدمت
 جذب ہو چکے ہیں اب ایک سیاسی اور قومی نظام وسیع پیمانہ پر قائم ہو گیا ہے
 جس کی کارروائی عالمگیر ہوتی ہے اور قرضہ جات کی داد و ستد غیر ملکوں میں کا ہوا
 پر ذاتی سرمایہ لگانے اور برآمد و درآمد میں اضافہ ہو جائیسے تمام ملکوں کے مابین
 انحصار باہمی کا سلسلہ بہت بڑھ گیا ہے۔

سیاسی ارتقار کی تاریخ میں یہ سب باتیں بالکل نئی ہیں اس زمانہ کو گزرے
 ہوئے ابھی سو سال بھی نہیں منقضي ہوئے ہیں جب سے زندگی کی بادی ضرورتوں
 میں اس قدر عظیم الشان تغیر واقع ہو گیا ہے کہ پرنکلیئر سے بیکرو اسٹنگٹن اور
 سکندر سے لے کر نیو الین تک چمکے جس قدر بزرگ گزرے ہیں ان کے اور ہمارے
 درمیان ایک نہایت وسیع خلیج حایل ہو گیا ہے۔ لہذا اس قسم کی نئی دنیا میں
 اتحادیہ اقوام کا معیار پائیدار بن گیا ہے۔ لیکن اس سے ایک بات یہ
 پیدا ہوئی کہ اس وقت تک اقوام اعلیٰ کے جو معنی سمجھے جاتے ہیں لوگ آئندہ
 اس کو کسی قدر محدود صورت میں تسلیم کریں گے ایسی انجمن میں کوئی حکومت
 بجائے خود ایک مکمل سیاسی نظام نہیں قرار دی جا سکتی۔ بجز اس حالت کے جب
 وہ دول جن سے ملکر اتحادیہ قائم ہوا ہے اختیار کسی ایسی جماعت کو نہ سپرد کریں
 جس میں وہ مشترکہ طور پر کام کرتی ہیں کوئی بالاترین حکومت نہیں قائم ہو سکتی
 مسلط حکومتوں کا انسداد ہو سکتا ہے فی الحال بالکل غیر معین صورت میں اس

معیار سے صرف یہ گشت ش کی جاتے گی کہ جانمیں کو ہتیار اٹھانے کی نوبت نہ آئے مگر تصفیہ کے لئے ثالث کے حوالے کر دیا جائے۔ فیصلہ طلب یعنی اس قسم کے نزاعات جو عہد ناموں کی تشریح و تفسیر یا قانون بین الاقوامی سے منظر شدہ اصولوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ایک عدالت ثالث کے سپرد کر دئے جائیں گے نیز عدالت طلب یعنی سیاسی مناقشات ایک کانفرنس مختص کے تفویض کر دئے جائیں گے لیکن ایسے تنگ معاہدوں کے ذریعہ سے ان ملکوں کی فرزندانی کی بھی حد مقرر ہو جائے گی جو اس دائرہ میں شامل نہیں ہیں۔ اتحادیہ کے حقیقی نظام میں جو جنوری ۱۹۲۲ء میں صلح کے معاہدوں کے تحت زیر عمل آیا تھا یہ طے کیا گیا کہ بڑی ملکوں کے مستقل نمایندگان اور دیگر حکومتوں کے استعجابی نمائندوں کی ایک کونسل قائم ہو ایک مجلس ایسی بھی ہو جس میں تمام حکومتیں شریک ہوں جو اس کی رکن ہیں مستقل دیگر ٹریٹ کے لئے جنیوا تجویز کیا گیا۔

اتحادیہ اقوام کے معاہدے کے بموجب کونسل اور مجلس نے اپنے اختیار سے بین الاقوامی عدل گسترش کی غرض سے ایک مستقل عدالت ہیگ میں منصب کیا ہے صلح کے معاہدوں کی رو سے مزدوروں کے لئے بین الاقوامی آئین کا قیام ہوا ہے۔ کانفرنس عام انٹظامی جماعت اور دیگر کام مقام جیو ا ہے جن کے قریض کم و بیش مجلس کونسل اور دیگر ٹریٹ سے ملتے جلتے ہیں۔

بہر نوع یہ ضروری ہے کہ ملکوں کی باہمی تنظیم کی بنیاد اسی بات پر ہوگی کہ ایک خاص مقصد کی تکمیل کی جاتے نہ صرف یہ کہ آئندہ رونما ہوا

مناقشات کے لئے پہلے ہی سے سالہ ہم پہنچا ہے۔

درحقیقت لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا سے جنگ کا نام و نشان مٹانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ پہلے ہی سے نزاعات کی روک تھام کر دی جائے اور جس قدر کم نزاعات ہوں گے اسی قدر زیادہ ان کا فیصلہ پنچایت کے ذریعہ سے ہو جاتا کرے گا۔ لیکن ان کا انسداد اس وقت ہو سکے گا جب حکومتیں مشترک عمل کی عادی ہو جائیں گی لہذا محض بین الاقوامی عدالیتیں قائم کرنے کے مقابلہ میں انتظامی مقاصد کے لئے دول کا مشترکہ نظام قائم کرنا زیادہ ضروری ہے مندرجہ ذیل اتحاد عمل کے رائج ہونے کے پہلے دس سال میں اس یہ کام لئے گئے (۱) ۱۹۱۴ء کے جنگ عظیم کے جو دشواریاں چھوڑ دی تھیں ان کا اصل بذریعہ عدالت یعنی یہ کہ جنگ کے قیدیوں کی رہائی اور آسٹریا کے مالی حالت کی بحالی اس کے توسط سے ہوئی (۲) چند سیاسی تنازعات مثلاً آ لینڈ جزائر اور ۱۹۲۶ء کا یونانی بلغاری جھگڑے کا تصفیہ (۳) قومی اقلیتوں کے حقوق اور بعض خطوں کی حکومت میں بین الاقوامی ذمہ داری کا قیام۔ (۴) ریل سہیل تجارت اور حفظان صحت کی تنظیم کی ترقی (۵) بین الاقوامی عدالتوں کے ذریعہ بعض معاملوں کو طے کرنا۔ (۶) مزدوروں کی بین الاقوامی تنظیم سے مختلف ممالک میں معاشرتی حالات کو درست کرنا۔

بہر کیف ان دس برسوں نے چند طاقتور اور مستعد چھوٹے دول کو اتحادیہ کے باہر ہی چھوڑ دیا ہے جس کی وجہ سے اتحاد قائم کرنے کی قدم چلت علی کو رو کرنے اور حالات حرب کی تخفیف میں یہ جدید طرز نام کام رہا ہے۔

اس طرح پر اقوام کے اس اتحادیہ کا معیار چند صدوں کے تحت قابل تکمیل ثابت ہوا جس میں حکومتیں دنیا کی سب قوموں کے درمیان امداد باہمی کا ذریعہ اور اپنی عام دلچسپیوں کے حصول کا آلہ بن سکیں جو فرایض کہ اس تنظیم سے ادا ہو سکتے ہیں ان کا دار و مدار قدرِ ثما حکومت کی ساخت اور اپنی مدد ریزی میں تبدیلی کے امکان اور غیر لوگوں کی طرف سے رویہ کو ترقی دینے کی قابلیت پر ہے لیکن ہر صورت میں معیار کا اظہار کسی تنظیم سے درحقیقت بہت کم ہوا کرتا ہے۔ قائم شدہ اتحادیہ پر جو غور و نظر ہو رہے ہیں اور جو کام اس سے یا جارہا ہے انہیں میں مزید مشورہ و نمائی طرف اشارہ موجود ہے۔

ایک ایسی دنیا کے نصب العین کو جس میں جنگ ناپید ہو اور جنگی تیاریاں مقصود نہ ہوں از سر نو پیرس کے معاہدے میں جگہ دی گئی ہے۔ جنگ کے خاتمہ کے لئے قومی حکمت عملی کا آلہ کار بنایا گیا ہے اس معاہدے پر دستخط تو ۱۹۲۸ء میں ہوئے مگر درحقیقت جنگ کے بائے میں اور بھی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ دراصل اتحادیہ کا مقصور جو مختلف ممالک میں حاوی ہو بین الاقوامی حربی طاقت کی ضرورت سے جداگانہ ہے جس کے ذریعہ سے نازک زمانہ کی دشواریوں کو معاہدوں کی تبدیلی یا دوسرے طریقوں سے رفع کیا جاسکے یا کسی حالت یا تفریق کو قائم رکھا جاسکے۔

قومیت اور اقتدار اعلیٰ کے متعلق رسمی میلان میں ایسے انقلابی تبدیلی کی جانب نصب العین رجوع کرتا ہے جو کئی پشتوں تک ممکن ہے وقوع پذیر نہ ہو سکے۔ سیاسی کئے کا نفرنسوں میں جو نیا میدان کھل گیا ہے یعنی حکومتوں کے

مابین جملہ تنازعات کا بین الملکیتی نظم و نسق یا ثالثی مداخلت سے تصفیہ کر لیا جائے۔ وہ مدبروں کی عملی قابلیت اور تخیل کو کسوٹی پر کسے رہا ہے۔ مگر ان سب باتوں سے ایک یاسی آمد کی ضرورت داعی ہوئی تو

مگر یہ ایسی ہے کہ جس کے باعث دنیا کو حکام کی حلقہ بگوشی سے نجات نہ حاصل ہو سکیگی۔ نمایندہ حکومت سے بھی ناقابلیت پر اظہار کا پرہیز نہیں کر سکتا۔ لیکن اس قسم کے تدابیر پر زور محض اس لئے دیا جاتا ہے کہ ہم کو اس امر کا احساس ہو جائے کہ پیری ڈوبائے یار و سو کے زمانہ سے اب تک ہم نے کس قدر آگے قدم بڑھایا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہے اس کے بارے میں ہمارے تصورات نسبتاً زیادہ قطعی ہیں نہیں بلکہ وہ جوش و خروش بہت زیادہ پُر اثر ہے جو معیاروں کی روح ہوتا ہے۔ اس وقت دنیا میں ہر طرف ایسی قوتیں موجود ہیں جو حکومتوں کی باہمی تنظیم کرنے میں برابر اپنا کام کر رہی ہیں فردرونی جتنی بڑی بڑی جماعتیں ہیں ان کا بھی خیال ہے کہ ایک ایسی انجمن قائم ہونا چاہئے۔ اتحادی حکومتوں نے اعلان کر دیا ہے کہ ان کو بھی دنیا میں ان الصاف کا دور دورہ جاری کرنے کی غرض سے ایک ادارے کی تجویز پسند ہے اور اس مقصد کے لئے جس قدر عملی کارروائیاں کی جائیں گی وہ انہیں بدل و جان نہرت کریں گی۔ وسطی اور مشرقی یورپ کی قوموں نے بھی اس خیال کا خیر مقدم کیا ہے۔ اسکی ترویج و ترقی کئے لئے بہت سے اور بھی اتحادیے قائم ہیں۔ تمام دنیا کی قومیں بحال بخیرگی اس عالم طوائف الملوکی میں ایک سترپا تعمیر کی امید وار ہیں جس کے سبب سوزنا

قبل از جنگ میں مختلف حکومتوں کے تعلقات میں کشیدگی واقع ہو گئی تھی اور
 ہماری نگاہوں کے سامنے ایک عظیم انسان معیار کام کر رہا ہے۔ پیشتر کے
 حیاروں کی جو رفتار تھی وہی اس نے بھی اختیار کر لی ہے اور اس لحاظ سے
 یہ خود بھی قدیم ہے کہ چند اختیارات کے دل میں ہمیشہ ان کے متعلق تحریک ہوتی
 رہی ہے۔ سر دست اس کی تاریخ میں ایک نازک دور آگیا ہے۔

اعتیاد

۱۔ قسم کی ٹخن کے خلاف کسی نے بھی شدید اعتراض نہیں کئے ہیں لیکن
 ان کا منشا یہ نہیں ہے کہ انداد جنگ کی غمر سے جتنی بھی اچھتیں قائم کی جائیں
 وہ سب یکساں طور پر نیند بہہ ہیں جس طرح دوسرے معیاروں کی تکمیل خطرہ اپنیش
 کرتی رہی ہے اسی طرح اس معیار میں بھی مشکلوں سے سامنا ہو سکتا ہے مگر
 ہے کہ ایسی انجمن کے ذریعہ سے بعض طاقتور حکومتوں کا غیر مزہ بند ہو سکے
 جو ان حکومتوں کی سرکوبی کیا کریں۔ اول الذکر کے حق میں مضرت رساں
 ثابت ہوں نیز اسی ہیئت سے وہ ان تباہی خیز جنگوں کی تیاری کی پردہ پوشی
 بھی کرے جو تمدن جماعتوں میں واقع ہو جایا کرتی ہیں۔ علاوہ بریں ٹکٹن ہر
 کہ چھوٹے جمہوروں کے حق میں یہ اتحاد یہ بھی اسی طرح ظالم ثابت ہو جیسی کہ
 اکثر جمہوری حکومتیں ہوا کرتی ہیں یہ بھی اندیشہ ہے کہ انجمن کو جنگ سے
 اس لئے نجات دلائے گی کہ صنعتی معاملات میں ہماری غلامی زیادہ مکمل

اور عالمگیر ہو جائے۔

یہ بھی گمان غائب ہے کہ یہ انجمن محض ایسی جماعت ہو جس میں صرف چند قوموں کا ایک گروہ متحد ہو یا جن سے غیر ذمہ دار و قدرت پسندوں کی حکومت قائم ہو جاتی ہو لیکن یہ وہ خطرات ہیں جو فرات اور نیک نیلی سے کام لیکر دور کئے جاسکتے ہیں اس صورت سے انجمن معیارات تقاضوں کے باوجود قائم رہ سکتا ہے جو اس میں ابتداء موجود تھے۔

قوموں کے درمیان اس قسم کی طوائف الکلوکی اور اس کے سبب سے جو لڑائیاں حکومتوں کے مابین ہوئی ہیں ان دونوں کا ہم کو احساس ہو گیا ہے۔ حکومتوں کی تنظیم مشترکہ کے ابتدائی عوارج کا بھی ہم کو تجربہ حاصل ہے۔ اسی تجربہ کی بدولت ایسے ایسے منصوبے اور تدبیریں پیدا ہوئیں جو انجمن اقوام کے معیار میں شامل ہیں لیکن معیار و تجارت میں ہم کو قوت محرمہ اور اس کے وسیلے ان دونوں چیزوں میں فرق ضرور سمجھ لینا چاہئے یعنی ہم کو یہ دیکھ لینا مناسب ہے کہ جس ارمان سے اس معیار کی ابتدا کی گئی تھی وہ اور خیر ہے اور جن طریقوں سے لوگ اس نصب العین کو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ دوسری شے ہے۔ اگر یہ انجمن امن کے ساتھ ساتھ حریت قائم کرنے میں قاصر بھی ہے اور مہذب زندگی کے بتدریج دفعیہ میں جنگ و جدل کا سلسلہ لگاتا رہا جا رہا ہے پھر بھی جو تصور حکومتوں کے باہمی تنظیم کے بارے میں اب تک پیش پیش رہا ہے وہ بیکار نہیں ثابت ہوگا۔ ترقی کا حاصل کرنا ایک شہوار امر ہے اور ممکن ہے کہ اس میں ہم کو مایوسیوں سے سامنا پڑ جائے لیکن یہ فرض کر لینے کے کافی اسباب موجود ہیں کہ جن باتوں میں ہمارے بزرگوں کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی ان میں ہم کو کامرانی

نصیب ہو گئی کیونکہ جو لوگ رنجست انسانی کے متعلق قدیم اصولوں کا اعادہ کرتے ہیں ان کے قبضہ سے رفتہ رفتہ حکمت عملی نکلی جا رہی ہے۔ مگر مرد کلام یہ نہیں ہے کہ محض ایمن ہی کے قیام سے مطلوبہ معیار حاصل ہو جائے گا۔ اگر جنگ کا قطعی اسناد بھی ہو جائے تو وہ کافی نہ ہو گا۔ کیونکہ اقوام اور ریاست کے تعلقات کے لحاظ سے جن لوگوں کے دل میں واقعی حریت اور نظام کے معیار سے شریک ہوئی ہے وہ ایک ایسی دنیا کے منتہی ہیں جس میں بنی نوع انسان کے تمام دائرہ حیات میں ہر قوم اور نسل کو اپنی ذاتی خصوصیتوں اور روایتوں کو مکمل طور پر اور آزادی کے ساتھ رونق دینے اور ترقی کرنے کا موقع حاصل ہو۔ بہت ممکن ہے کہ ایسی صورت حالات کے حصول میں ہیکو ماہیا سال تک یا دوسری کا منہ دکھنا پڑے۔

چودھواں باب

تتمت

سیاسی تغیر میں قدرت کا حصہ

اب تک ہم نے یہ دیکھا ہے کہ زمانہ موجودہ کے بنانے میں ان تصوروں نے کس حد تک حصہ لیا ہے جو انسانوں کے ذہن میں ایسی صورت حالات کے متعلق قائم کر رہے ہیں جنہیں وہ مناسب اور قابل حصول سمجھتے ہیں لیکن بالعموم ان معیاروں کا ذکر کرنے کے قبل ان دیگر متعدد قوموں کی موجودگی کا تسلیم کر لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے سبب سے زمانہ کو موجودہ صورت حاصل ہوئی۔ بلا شک شبہ مستقبل میں بھی انقلاب واقع ہو جائے گا خواہ ہم کو اس انقلاب کی آرزو ہو یا نہ ہو انسانوں نے اپنے حصول مقصد کے لئے جو مساعی اب تک کی ہیں ان کے علاوہ بے شمار

ایسی قدرتی طاقتیں برابر کام کر رہی ہیں جن سے معاشرے کے مورخوں اور علمی بدبو کو قلعوں رہتا ہے۔ کیونکہ موجودہ سیاسی حالت کے باسے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے انسان کی انفرادی اور اجتماعی کیفیت و مائع اقتصادی تغیرات اور جغرافیہ یا علم نباتات کے قوانین سے واقفیت ہونا ضروری ہے انسان تنہا نہیں ہے اور قدم قدم پر مختلف حقائق گرد و پیش کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔ اگر خاص خاص باتوں میں ہم باقی تمام دنیا سے مطلب نہ رکھ کر ایک انسان کی حالت پر غور کریں تو ہم کو اس بات کے یاد دلانے کی ہمیشہ ضرورت پڑے گی کہ بہت سی ایسی طاقتیں جو ہمیں دکھائی نہیں دیتی ہیں خود انسان کے اندر تغیر پیدا کرنے میں پہلے کام کو چلی ہیں اور ابھی تک کر رہی ہیں بہر کیف ہم بڑی قوتوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں اور صرف آج ہوا۔ آگ سے نیز قدرتی پیداوار کے اثرات کو فوری طور پر مندرجہ اور اہم قرار دے سکتے ہیں۔ مگر ہم ان باتوں کو بھی ماہر ان اقتصادیات کے لئے چھوڑ دیں گے اور صرف یہ دیکھیں گے کہ ایک انسان کی ذات سے دوسرے انسان کو ذات پر کیا اثرات پڑتے ہیں لیکن جملہ انسانی کیفیتوں پر غور کرنے سے ہم کو اس کا جو جو ہر نظر آتا ہے یعنی جب ہم بال کی کھال نکال کر اس کے باریک سے باریک پہلو کو بھی دیکھ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان خود اپنی خواہشوں کا مالک و مختار نہیں ہوتا ہے۔ نہایت تنگ حدود و قیود کے علاوہ اور کسی حالت میں نہیں اپنی پسند سے کام لینے کا اختیار نہیں ہے یعنی ہم کو اس بات کا فیصلہ کرنے تک کی آزادی نہیں ہے کہ ہمیں کون چنیر حاصل کرنا چاہئے اور کون نہیں کرنا چاہئے۔

بہر حال جن قدرتی طاقتوں کے بدولت یہ شخص کو اپنی حیثیت حاصل ہوئی

تھی خواہ وہ جغرافی ہوں یا حیاتیاتی اور خواہ معاشی ہوں مگر انھیں طاقتوں کے
اہل تھیں ان کے دل میں ان کے نقطہ خیال کے مطابق آزادی حاصل کرنے کی خواہش
از خود پیدا ہو گئی آج جن معاشرتی تنظیموں میں ہم کا پلٹ کر ناچاہتے ہیں وہ
محض افراد گزشتہ کی دانستہ کارگزاری کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ کسی حد تک
انھیں قدرتی کاموں کے اثر سے ان کا وجود ہوا ہے۔ نیز جس وقت اپنی حسب
طلب قوتوں کو استعمال کرنے کا واقعی انتظام کر چکے ہیں۔ اس وقت ہماری
تکمیل شدہ خواہش بھی ایک قوت بن جاتی ہے۔ اور اس کا بھی انہیں قوتوں
میں شمار ہو جاتا ہے جو ہم کو ایسے قوانین کے مطابق تبدیل کر دیتی ہیں جن پر ہماری
قوت ارادی کا قبضہ وقابو نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ ہم ایک چھوٹی سی حکومت میں
آمدنی کی از سر نو اس طرح تقسیم کرتے ہیں کہ اقتصادی نقطہ خیال سے شہری
کا رتبہ مساوی ہو جائے لیکن ایسا کرنے سے فوراً ہی اس قسم کے قدرتی نتائج رونما
ہونے لگتے ہیں جو ہماری آزادانہ پسندیدگی کے سبب سے کہیں واقع ہوتے
خواہ ان نتائج کی پیش بینی ہو ہی ہو اور خواہ نہ ہو ہی ہو۔ اس سے کچھ واسطہ نہیں
بظاہر اس کا مطلب یہ ہی نکلتا ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جس کا کام خود
سجود ہوتا رہتا ہے ممکن ہے کہ اس مطلب کو لوگ محض ایک کمزور خیال قرار دیں
لیکن جس طرح معیاروں کی طاقت ضرورت سے زیادہ قدامتوں کے دل سے
فراموش ہو جاتی ہے اسی طرح اس کمزور خیال کو کبھی مصداق و مقام
نسیان پر رکھ دیں۔

دنیا میں ایک عام رجحان طبع یہ ہے کہ شہرخص پائیداری اور استقلال

کا خواستگار رہتا ہے اس کی مخالفت میں انقلاب پسندوں کی داں نہیں گلنے پاتی اگرچہ وہ تمام دن کسی مسلط نظام کے خلاف تقریر کرنے میں اپنی قوت صرف کرتا ہے۔ مگر محالاً کی حالت موجودہ کی مخالفت کئے بغیر نہ تو وہ کھا سکتا ہے نہ پین سکتا ہے اور نہ چل پھر سکتا ہے اس لئے معاشرے کی موجودہ ساخت میں سرسے پاؤں تک کا یا پاٹ ہو جانے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا اس کے برخلاف دنیا تغیر پسند بھی ہے اور تغیر پسندی کے خلاف قدامت پسندوں کا کوئی داوا نہیں چلتا۔ اگرچہ وہ اپنی بزرگوں کو ہو ہو تعیلید کرتے ہیں تاہم ان کے جائے سکونت اور ان کے پوشاک میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ان کی خوراک بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں جن زبان میں وہ زبانہ ماضی کی تعریف کے پل باندھنے لگتے ہیں اور جس کے استعمال سے ان کو یہ امید ہو جاتی ہے کہ حالات اپنی اصلی صورت میں قائم رہ سکتے ہیں وہ اپنے معنی کے لحاظ سے اس وقت تبدیل ہو جاتی ہے جب انسان اسکو استعمال کرتا ہے اس لئے اس بات کا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ مدتوں اس قسم کی دشواریوں سے سابقہ رہے گا۔ پائیداری اور تغیر ان دونوں باتوں کے متعلق قدرتی رجحانات مصلحان وقت یا قدامت پرستوں کے مساعی سے مستغنی رہ کر اس وقت تک قائم ہیں۔

بہر حال ان لاتعداد باتوں کو مد نظر رکھ کر جن یہاں سے معیاروں کا یا تو بہت کم اثر پڑتا ہے یا بالکل پڑتا ہی نہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ معیار جس صورت کو وہ اختیار کر رہا ہے اب ہم اس کے لحاظ سے اس کے چند عام پہلوؤں پر اپنی توجہ مبذول کریں گے۔

حالیہ معیاروں میں اختراعی قوت کی موجودگی

—————

گزشتہ چار ابواب میں جن معیاروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب اس لحاظ سے زمانہ حال کے ہیں کہ ان کی ابتداء حال میں ہوئی ہے۔ سیاسیات علیٰ یہ قدیم معیاروں کے بمقابلہ وہ زیادہ نمایاں طور پر کام کر رہے ہیں اور قابل حصول مقاصد کے سلسلے میں وہ زیادہ عمومیت کے ساتھ مقبول ہیں۔ لہذا جو تعلقات ان معیاروں کے درمیان ہیں ان پر روشنی ڈالنا ضرور مناسب ہوگا۔ ان معیاروں میں بہت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی مسائل و حصوں میں منقسم ہیں ایک حصے میں ان نصب العین کا شمار ہے جن کا تعلق جمہور سے ہوتا ہے اور دوسرے حصے میں ایسے معیار شامل ہیں جن کو افراد سے سروکار ہے کیونکہ اولاً قومیت اور شہنشاہیت ان دونوں معیاروں کے گرد و ہوں کے تعلقات کی از سر نو تنظیم ہوتی ہے۔ بظاہر وہ ایک دوسرے کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔

قومیت کا مدعا یہ ہے کہ ہر جماعت جدا جدا آزادی کے ساتھ جاوہ ارتقاء میں گامزن ہو اس میں معیار کا ایک ایسا مبالغہ آمیز پہلو شامل ہے جس میں اس بات کی نہایت شد و مد کے ساتھ مخالفت کی جاتی ہے کہ مختلف قومی تہذیبوں میں ایک ہی طریقہ حکومت رائج ہونا چاہئے۔ شہنشاہیت میں جس قدر مختلف جماعتوں کے مشترکہ ارتقاء کے لئے صدا بلند کی جاتی ہے اور اس سے بھی ایک مبالغہ آمیز تخیل اس بات کا پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک گروہ کا دوسرے گروہوں کے

اندر اپنا طریقہ حکومت رائج کرنا ضروری ہے لیکن اپنی اصلی صورت میں یہ دونوں معیار ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

جامعاتوں کے بہترین تعلقات کے باوجود میں بشعورات مبہم ہیں کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جو دگ واقعات پر غور کرتے ہیں ان کو اس خیال سے انفاق ہے کہ گروہ کے خاصہ فطری کی حفاظت مونا چاہئے جن کا نام ہے قومیت لیکن اگر ایک ہی قانون اور حکومت کے ماتحت متعدد مختلف گروہوں کے مابین نہایت قریبی تعلق ہو تو اس سے بھی بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ اسی کو شہنشاہیت کہتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ کون جماعتیں متحدہ ہیں اور کون علیحدہ رکھی جائیں اس کا تصفیہ تو اس دستور کے نیک یا بد نتائج کا اندازہ کرنے سے ہو سکتا ہے جو ہمیں وراثتاً اہل پیشین سے ملے۔

نمائندہ انفرادیت اور انتمزاکیت دونوں کا تعلق افراد سے ہے۔ انفرادیت پسندوں کے حسب خیال تنظیم جس قدر کم ہو اسی قدر اچھا ہے کیونکہ جو شخص واقعی آزاد ہے اس کو اپنا فرض ادا کرنے کے لئے بیرونی دباؤ کی ضرورت نہیں ہوتی انفرادیت میں انگریزی۔ وایات کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کی مبالغہ انگیز صورت میں انگریزوں کا وہ تعصب ظاہر ہوتا ہے جو انھیں دوسری حکومتوں سے ہوا کرتا ہے۔ نیز اس شک شبہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو اس قوم کو ان اشخاص کی طرف سے ہوتا ہے جو ایسی باتوں میں پھنسی لیتے ہیں جس میں ان کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی۔

لیکن ایک ایسی دنیا میں جہاں ہیرل کا اثر میں نہرے پڑتا ہے صرف بچے

اپنے ذاتی کام سے سرکار کھنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ اس کے برعکس اثر اکیسٹ
پسندوں کا خیال ہے کہ دنیا میں انسانوں کے باہمی تعلقات کی جس قدر نظم کی جائے
اسی قدر اچھا ہے کیونکہ انسانوں کی تعداد کثیر کا دار و مدار دستوروں پر ہوتا ہے
اور ہمیشہ اس امر کے متعلق شخصی فیصلوں پر نہیں ہوتا کہ دنیا میں کون ایسی بہترین بات
ہے جو انسان کو کرنا چاہئے۔ اثر اکیسٹ میں جرمنی کی روایات منعکس نظر آتی ہیں
یہ معیار بھی اس حالت میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے جب اہل جرمنی حکام کی جنبہ داری
کرنے لگتے ہیں تو ان کے دہیں یہ ڈر سما جاتا ہے کہ کہیں وہ فرد کی طرح انمنانہ
رہ جائیں لیکن تا وقتیکہ انفرادی فیصلہ اور انفرادی فعل کا معلومات نیز خیال ان کو
ہمیشہ ارتقار کی طرف مایل نہ رکھیگا۔ یہ اوئے دوسا تیز آگے ترقی نہیں کر سکتے۔
اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ انفرادیت اور اثر اکیسٹ کے
بارے میں جن کے مطابق افراد کے تعلقات کی ترتیب ہونا چاہئے۔ ایسے تصور
میں جو ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے۔ رہا یہ امر کہ دونوں میں
سیاسی تعلقات کے متعلق اقتصادی پہلو زیادہ غالب نظر آتا ہے اس کی وجہ
یہ ہے کہ دونوں کا ظہور ایک ہی زمانہ میں ہوا تھا کیونکہ جس طرح قرون وسطی
میں سیاسی معیاروں پر مذہبی رنگ چڑھایا گیا تھا اسی طرح انیسویں صدی
میں سیاسیات نے معاشیات کی صورت اختیار کر لی اب بیسویں صدی میں جو معاملہ
درپیش ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی دیگر غیر اقتصادی ضروریات کے لحاظ
سے معاشرہ میں رد و بدل کر دیا جائے جب کہ ایسا برابر ہو رہا ہے تو یہ بات
بہت بڑی حد تک ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہماری تنظیم نہایت کافی ہونا چاہئے

(جو اشتراکیت کا معیار ہے) اور انفرادی قابلیت کے اظہار آزادی کے ساتھ
 موقع حاصل ہونا چاہئے (جو انفرادیت کا نصب العین ہے) کیونکہ مملکت
 ایک خود سر حکومت ہے جس کی تنظیم کا دار و مدار اس کے شہریوں پر نہیں
 ہوتا اور اگر کسی حکومت کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی تنظیم
 محض ایک موروثی دستور ہے نیز زندگی کے مفید مقاصد کے متعلق جو
 جدید تصورات ہیں ان کی تکمیل کا وہ ایک قطعاً جدید وسیلہ نہیں ہے
 تو ایسی حکومت کو طوائف الملوکی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا

قدیم معیار اور اس کا موجودہ اثر

سن معیاروں کی ابتداء زمانہ حال میں ہوئی ہے ان کے علاوہ
 متعدد دیگر معیار بھی موجودہ صورت حالات کو ایک نیا جامہ پہنانے میں
 حصہ لے رہے ہیں۔ ماضی میں جو کچھ تکمیلات ہوئی ہیں انھیں پر تغیرات کا
 دار و مدار ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ عظیم لڑائیوں یا جمہوری عادات کے تذکروں سے
 اس قسم کی کارگزاری کا مفہوم اس قدر اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہو سکتا
 جس قدر اس بات پر غور کرنے سے ہو سکتا ہے کہ انسانوں کے دہیں
 کن باتوں کی خواہش موجود تھی۔ اس لئے ایک زمانہ کے بارے میں
 یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس میں ہماری سیاسی میراث کی تکمیل ہی

نہیں ہوئی بلکہ اس کے معیار کے قائم ہونے میں مدد ملی ہے اگر ایک طرف نصیب اس تکمیل کا روح رواں تھا تو دوسری جانب جو کچھ بات حاصل ہوئی اس سے حالت مطلوب کے تصور میں چند نقائص ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ معیار کے مرکوز و محدود ہونے کے سبب سے اس کی صوت خود بھی رفتہ رفتہ بگڑ گئی ہے۔ بعض لوگوں نے تو اس طرح خیال ظاہر کیا ہے گویا خود معیار کا کوئی اثر سیاسی نظام عمل کے قیود پر نہ پڑا تھا۔ جس میں معیار آشکار ہوا تھا۔ بہر حال زیادہ مناسب یہی ہے کہ لفظ معیار کے وہ مبہم معنی نہ قرار دے جائیں جو ایسے معیار سے مترشح ہوتے ہیں۔ مگر اس حالت سے معیار میں محض یہ ظاہر ہو گا کہ اس میں کسی ایسے نئے کی خواہش کی جاتی ہے جو نسبتاً زیادہ بہتر ہو اور وہ بہتر چیز کوئی خیالی پلاؤ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی جہالت ہے جس کو لوگ بہتر تصور کرتے ہیں۔ نیز اس جہالت کی وجہ سے واقعی چھوٹے انسان میدان عمل میں کار نمایاں کرنے کے لئے متعدد ہوتے ہیں۔ نیز اس سے جو سیاسی نظام عمل نتیجہ ہوتا ہے اس سے بارہا یہ عیاں ہو چکا ہے کہ جس حکومت کا تخیل ذہن میں قائم ہوا تھا وہ اس قدر پسندیدہ نہ تھی جتنی کہ شروع میں تصور کی گئی تھی۔

لہذا ہماری موجودہ کارگزاری کی بنیاد وہ معیار ہے جس کی جزوی طور پر تکمیل ہو چکی ہے اور جو خواہ مکمل طور پر حاصل ہو بھی گیا ہے تاہم کسی حد تک ناقص معلوم ہوتا ہے لیکن اصلی تصور کا کچھ نہ کچھ حصہ

اتناک قائم ہے۔ اسی سے ہم کو آئندہ کام کرنے کے لئے تحریک ہوتی جو
مغذب نسل کو ہی ہے جو تکمیلات گزشتہ کو محض قبول ہی نہیں کرتی بلکہ
جس کے دل میں ان معیاروں سے تحریک ہوتی ہے جو تجربہ سوکارانہ
ثابت ہوتے ہیں افراد اور گروہوں کے باہر کسی تعلقات کے لحاظ
سے خواہ کچھ ملکیتیں ناپسندیدہ ثابت ہوں جو کسی زبان میں قابل ستائش
ماتی جاتی تھیں مگر فی زمانہ ایسی حکومتیں موجود ہیں جو کسی وقت عمدہ شمار
کی جاتی تھیں اور ناکام و ناقص ہونے پر بھی اتناک عمدہ ہی سمجھی جاتی
ہیں۔

معیاروں کی ارتقار

یہ نہیں ہو سکتا کہ حریت یا نظام ہمیشہ ناپسندیدہ تصور کیا جاتا ہے
اسی وجہ سے بعض معیار لافانی سمجھے جاسکتے ہیں لیکن وہ بھی فانی اس
حالت میں ہو سکتے ہیں جب وقتاً فوقتاً ان میں تغیر ہوتا ہے گا۔ مگر جب ہم
اپنی نظر عہد گذشتہ پر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس آزادی کی
جدوجہد میں اہل تہذیب نے دن رات ایک کر دیئے تھے۔ وہ اس آزادی
سے بہت مختلف تھی جو ہم آج کل حاصل کرنا چاہتے ہیں
اس زمانہ کی اور آج کل کی آزادی میں جو فرق واقع ہے ہم اس کو
وہی فرق سمجھتے ہیں جو ایک بچے اور ایک جوان آدمی میں ہوتا ہے یا یہ کہ

فرق اس قدر زبردست ہے جس قدر باپ اور بیٹے میں ہوتا ہے۔ ہر حال دونوں حالتوں میں ظاہر ہے کہ جو باتیں ہم کو عہد ماضی میں حاصل ہوئی ہیں ان میں ہماری مشینری میں کسی قسم کی ترقی ہو جانے پر بھی کوئی تغیر اس قدر زبردست نہیں ہو سکتا ہے جس قدر زوردار وہ انقلاب ہوتے ہیں جن سے ہماری خواہشات مغلوب ہو جایا کرتی ہیں۔

گویا یہ معنی ہیں ارتقار کے اس حالت میں جب اس کا استعمال سیاسی معیاروں کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ جب ایتھنز کو پہلے پہل خود آزادی حاصل ہوئی تھی اس وقت سے انسانی حوائج اس غرض کے اندر بالکل تبدیل نہیں ہو گئے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے لیکن ان ضروریات کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوا ہے۔ گویا نظام اور حریت ان دو الفاظ سے ساری تاریخ تیار کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان سے ویسی متضاد خواہشوں کا ظہور ہوتا ہے جن سے اس معیار کی تکمیل ہونی ہو جو ہر زمانہ کے لوگوں کے خیال میں آیا ہے لیکن نظام بڑھتے بڑھتے اتنا شہنشاہیت یا آمرانیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور حریت مختلف زمانوں میں قومیت یا انفرادیت کی صورت میں نمودار ہوتی ہے حریت یا نظام سے جو نئی بات پیدا ہوتی ہے وہ اپنے مختلف صورتوں سے گذر کر نمودار ہوتی ہے اور اس سے بھی نئی نئی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں گویا انقلابی حقوق سے انفرادیت اور آمرانیت دونوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان کی ارتقار ہوتی ہے۔ اس تصور کے قوانین

بھی تحقیق ہو سکتے ہیں۔ ان قوانین کی مدد عہد موجودہ کے رجانات پر فیصلہ یا اظہار خیال بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ قانون کوئی معمولی قانون نہیں ہے کہ جن دو باتوں میں بعد المشرقین ہو وہ ایک مسئلہ میں باہم دیگر مطابق ہو جائیں علاقہ بریں یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ موجودہ میدان کے بارے میں کوئی صاحب فیصلہ آسانی سے نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن محض تاریخی واقعات کے درس سے مختلف معیاروں کا درمیانی فرق سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ تنقیداً منطق یا فلسفہ دماغ کے کسی عام قانون سے یہ نہیں ثابت ہو سکتا کہ حریت، ایتھنز اور نظام روم کے مابین کیا تعلق ہے۔ بعض مرتبہ دو مشترک معیار ایک ہی وقت میں رائج ہوتے ہیں بسا اوقات منفرد معیاروں کے بعد واقع ہوتا ہے اور بعض مرتبہ اجتماعی معیار کے پہلے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ہر حال جس ترتیب سے تاریخی نتائج رونما ہوتے ہیں ان میں کوئی منطق کارگر نہیں ہوتی یعنی ان کے بارے میں کوئی خاص قانون نہیں مقرر کیا جاسکتا۔

البتہ عام بیانات ضرور ملے جاسکتے ہیں ان میں سے ایک بیان یہ ہے کہ اگر تمام اشیائے مطلوبہ ایک ہی نام سے موسوم کی جائیں تب بھی ان میں کچھ نہ کچھ فرق ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود تاریخی میں ایک ہی چیز کئی کئی باتوں سے موسوم کی گئی ہے جس حد تک ان تمام بیانات میں آہنی گنجائش موجود ہوگی کہ ہم آئندہ کے لئے بھی ان کو درست تصور کر سکیں۔ اس حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ معیاروں کے متعلق ایک تاریخی قانون موجود ہے لیکن اندر سے حالات یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس قانون سے ان باتوں کا ایک بیان ہوگا ہمیں

گذشتہ معنی کے لحاظ سے کوئی احتیاج اس حد تک شامل نہ ہوگی جس حد تک قیاس اس کا اثر مستقبل پر پڑتا ہے لیکن اکثر معیاروں کے باہمی موافق و مخالف ہوتے یہ نہیں ثابت ہوتا ہے کہ سیاسی معیار اور رواج میں متر یا اپنی راستے سے ترقی نہیں ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہوں جس کو یا ضل و ارہ ارتقار کا اختتام کہتے ہیں لیکن اس حالت میں بھی ایک تکمیل شدہ نہیں بلکہ ایک معیار من القایم کی حیثیت سے عہد ماضی کا اثر زمانہ مستقبل پر ضرور پڑے گا۔ غور کر ایسے معلوم ہو گا کہ ہم نے ایک معیار نہیں بلکہ متعدد معیاروں کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جگہ اس نقطہ کی ٹھیک اور قطعی تشریح کی گئی ہے ایک معنی میں وہ معیار حکومت مطلوب ہے لیکن وہ آسان بھی نہیں ہے اگر ممکن ہے کہ حامیان انفرادیت و کلائے قومیت نیز علمبرداران شہنشاہیت کے درمیان اصولی مصالحت ہو سکتی ہے جس طرح حریت یا نظام کی امید میں ایک عام خواہش مرکوز ہوتی ہے تاہم حکومت مطلوبہ کے خاص خااصل اجزاء کو علیحدہ بکھنڈ پڑے گا اگر ایسا نہ کیا جائے تو ہم ایسے انسان بن جائیں گے جو جذبات کے زیر اثر ہو کر طرح طرح کے خیالی پل باندھا کرتے ہیں۔ دوسروں کے خیالات سے موافق ہونے کے لئے اس وجہ سے تیار نہیں ہوتے کہ وہ اس چیز کو خود غور کر کے دماغ سے برآمد نہیں کر سکتے جس کی انہیں خواہش ہوتی ہے۔

سیاسی مسائل اور سیاسی رواج

اب یہ کہنا باقی ہے کہ سیاسی واقعات کی متعلقہ بحث میں دو سوال جدا

رکھ دئے گئے ہیں۔ ایک سوال یہ ہے کہ موجودہ صورت حالات میں کون بات
 اچھی ہے اور کون خراب۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ دفعہ شرابی کا ذریعہ کیا ہو
 نیز یہ کہ اچھائی کا صعود کین باتوں سے ہونا ہے۔ سیایات کے دوسرے ہم
 میں معاشرتی تقاضوں کی تشخیص اور محاسن کے شناخت کی استعداد بڑھ
 جانا چاہئے۔ واقعات کی تشریح کے ساتھ ضروری ہے کہ اس پر اخلاقی
 فیصلہ بھی شامل ہو۔ اس کے علاوہ ہم یہ دیکھنے کی قابلیت ہونا چاہئے
 کہ جو بات پہلے خراب معلوم ہوتی تھی وہ بعد ازاں عمدہ ثابت ہو سکتی ہے
 یا جو بات نفیس معلوم ہوتی تھی وہ ممکن ہے کہ درحقیقت خراب ہو۔ اخلاقی فیصلہ
 کرنے کے لئے واقعات کے مشاہدہ یا ان کو بیان کرنے کی لیاقت درکار ہے
 اسی وقت تربیت بھی لازمی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ واقعات موجودہ کو
 ایمانداری کے ساتھ بیان کرنے والے مورخوں میں معاشرتی محاسن معاً
 کا اندازہ کرنے کی فراست نہیں ہوتی جو غیر پختہ خیالات و مانع میں بہت
 موجود رہتے ہیں انہیں کے ماتحت اس قسم کے فیصلے صادر ہوتے ہیں کیونکہ
 بہت کم اشخاص میں واقعات یا افعال اس کے دور میں تاریخ پر غور کر کے
 ان کو قبیح یا احسن قرار دینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

بیش قیمت اخلاقی فیصلے غیب سے برآمد نہیں ہوتے اور نہ وحی کے
 مانند نازل ہوتے ہیں بجائے اس کے ان کی دستی یا غلطی کسی خاص شخص
 کے مطابق ہوتی ہے۔ اس سوال کا جواب کہ اس میں خرابی کیا ہو
 اکثریت کی رائے کا سہارا لیکر آسانی سے دیا جاسکتا ہے کیونکہ مریض ہی

خود اپنی تکلیف کو بخوبی بیان کر سکتا ہے لیکن جب اس کے علاج پر غور کیا جاتا ہے تو حالت مختلف واقع ہو جاتی ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ معاشرتی نقائص کا علاج کیا ہے اکثریت کی رائے پر دوسرے درجہ کو اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ علانہ مابین کا کام ہے۔ یہ مابین جسم پیاست کے معائنہ ہونے پر ریاستی مسائل کا جو مطالعہ انھوں نے کیا ہے اسی کے مطابق انہیں علاج دینا کرنا چاہئے کیونکہ یہ شاید نادری ہو تا ہے کہ کوئی مریض اپنا علاج خود ہی تجویز کرے۔ گویا ایسی حالت میں یہ بھی ضروری ہے کہ کثیرالاعمال اپنی رائے کا اظہار کریں اور یہ وہ حالت ہے جس میں توحید کے لئے کسی نہ کسی قسم کی جہود ضروری ہے کیونکہ جب کوئی مابین علانہ تجویز لیکتا ہو اور اس علاج کی آزمائش بھی ہو چکی ہو تو بعد ازاں یہ بتانا مریض کا کام ہے کہ علاج مجوزہ سے اس کو فائدہ بھی ہوا یا نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک نیک نیت مطلق العنان حکومت میں فائدہ یا نہی ایسی رعایا کے فلاح و بہبود کے لئے معاشرتی معالجات کام میں لائے اور انہیں اس پر کہنے کی تائید ہو کہ اس دوائے اس کی جان نہ دیا جانی ہے یہی حکومت عہدہ میں بھی ہوتا ہے خواہ اپنے وقت سے نوید و ان بھی کیونکہ نہ ہو۔ تمام جماعت کو اس وجہ سے نقصان پہونچ سکتا ہے کہ وہ ان مطلق العنان کے خلاف حرف نہایت زبان پر نہیں لاسکتی جو اس کی فلاح و بہبود کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں بھی اکثریت ہی کی رائے

سے یہی فصلوں کے متعلق بہترین علمی ترویج مہیا ہو سکتی ہے۔ لیکن مسائل ہوتے ہیں پیچیدہ۔ اسی نے سب باتوں کا ایک ہی علاج نہیں ہو سکتا۔ معیاروں کے درمیان سے معلوم ہو جائے گا کہ کتنی مختلف اقسام فراموش موجود ہیں اور ان کے لئے کس قدر طرح طرح کی عمارتوں کی ضرورت ہے۔ زیادہ کل تاریخی معلومات سے معلوم ہو گا کہ۔ اشرقی اصلاح لینے جو تہذیبیں ماز حال میں اختیار کی گئی ہیں ان کو عرصہ ہوا کہ ماکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اسی واسطے دوسری قسم کے علاج تجویز کیے جائیں گے جن کی بیشتر کافی آزمائش کچھ عرصے کی گئی تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ علاج کیا ہے جو اس کے جواب میں جو متعدد اور مختلف قسم کی تجاویز پیش کی جاتی ہیں ان کے مدنظر رکھنے سے مختلف سیاسی فرقوں کے وجود کی ایک مقبول وجہ مہیا ہوتی ہے۔ یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ خلاف علاج ایک جماعت ماہرین تجویز کرے اور فلاں نقطہ دوسری صف کے غور و فکر کا نتیجہ ہو۔ حالانکہ جماعت کی تنگدلی کے خلاف بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ مگر بالکل وہی باتیں ماہرین ان فن کے کس کس گروہ سے خلاف ہی جاسکتی ہیں جو کسی پیچیدہ مسئلہ پر کامل طور پر متفق الرائے نہیں ہوتے۔

لیکن یہ ہے کہ قیادت ہم ایسے ماہرین کا وجود تسلیم کریں جن کو ہر ایک بات کا علم ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ امر اصل یہاں ہی کے آسان ترین مسائل میں بھی ہم کو ایسے حکماء حاذق مہیا نہیں ہوتے جن کو تمام باتوں پر عبور حاصل ہو سکے۔ امند چید بالا مثال سے یہ ہیں مراد ہے کہ

ہر ایک دستہ جو علیحدہ تجویز کرے گا وہ خواہ مخواہ مقبول ہی ہوگا۔ البتہ ہر ایک جداگانہ تجویز کے مطابق ایک علیحدہ گروہ ضرور قائم ہو سکتا ہے جو اپنی مجوزہ تدبیر علاج کی حمایت کرے گا۔ جہاں تک مجوزہ علاج پر غور و فکر ہو اس وقت تک وہ سماج اپنی تجویز کی نشر و اشاعت کر سکتی ہے اس کے ہر رکن کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنی جماعت کی تجویز کے محاسن سے ہر شخص کو بہرہ اندوز کرے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ایسی حالت میں یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک فرقہ بند مدبر اپنی جماعت کا فرقہ قائم رکھنے میں مریض کا مفاد نظر انداز کر دے لیکن یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور باتوں کے ماہروں کی طرح علماء ریاسی زیادہ بے ایمانی سے کام لیتے ہیں۔ خواہ یہ معلوم بھی ہو کہ ریاسی معاملات میں نیم حکیم خطرہ جان نیم ملاحظہ ایماں کی مثل صادق آ سکتی ہے کیونکہ معالجہ امراض کے بہ مقابلہ سیاسیات میں مسائل زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں اور جہالت زیادہ طاری ہوتی ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جماعتوں کو زیادہ ملائمت سے کام لینا اور صرف ایک اصول کی نشر و اشاعت کے لئے ان کا وجود ہونا چاہئے نیز یہ بھی مناسب ہے کہ کئی کئی گروہوں جن کا قلیل عرصہ تک قیام ہے لیکن جس حد تک زیادہ سے زیادہ جانبدارانہ علاج چند عام اصولوں سے مطابق ہوتا ہے اس حد تک فرقہ پر جماعت بندی کا دستور ایک مقبول آئین ہوتا ہے اس بنا پر جماعتی حکومت کے وجود کے اسباب بیان

کئے جاسکتے ہیں جس میں صرف دو جماعتوں کے درمیان مخالفت رہتی ہے
 کیوں کہ یہ ظاہر ہے کہ معاشرتی تقاضوں کے لئے جس قدر سیاسی و فنی
 ہوتے ہیں ان میں دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اصول نظام کی
 پیروی کی جائے اصول حریت اختیار کیا جائے گویا اس سے معلوم ہوا
 کہ جن معیاروں کی تاریخ ہم نے بیان کی ہے ان کا شمار عہد موجودہ الکی
 سیاسیات عملی کی تعمیری قوتوں میں ہے اور باوجود کہ ہمارے طرز عمل میں عیب
 موجود ہیں تاہم ہم بجائے اس کے کہ ان کا اسناد کر دیا جائے اس میں اصلاح
 کرنے کے لئے چند وجوہ پیش کئے جاسکتے ہیں۔ البتہ جس اختلاف رائے
 کے سبب سے فرقہ اور جماعتی حکومت یہ دونوں چیزیں پھولتی پھلتی رہتی ہیں
 وہ تنقید اور نکتہ چینی یا کسی خاص گروہ کے فلسفہ اور اصولوں کی مخالفت
 کے لئے کار آمد اور مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ تجویز علاج کے لئے ماہران
 فن کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے اس کی وجہ سے دوسری باتوں کی طرح حکومت
 کا مینہ کا طریقہ بھی رائج ہو گیا ہے کیونکہ جب کابینہ کے ہاتھ میں چارہ کار
 کی تجویز کا اختیار ہوتا ہے تو یہ کبھی ممکن ہے کہ مریض سے دواؤں کے رد
 کرنے یا یہ کہنے کا اختیار بھی چھین لیا جائے کہ ان کے استعمال سے اسکو
 کچھ فائدہ نہیں حاصل ہوگا۔ اختلاف رائے کا اختیار ایک قابل قدر
 چیز ہے۔

مگر یہ حقیقت پھر بھی قائم رہتی ہے کہ واقعات کو مختلف نگاہ سے
 دیکھنے یا دفعیہ کے لئے مختلف تجویزیں پیش کرنے سے جو اختلاف آراء

واقع ہو جاتا ہے اس کے باوجود اکثر مسئلوں پر حوام کی رائے حل ہو جاتی ہے اگر جماعتی کشمکش کے جوش و خروش میں یہ بنیادی اصول فراموش کر گئے جائیں گے تو بڑا نقصان ہو گا۔ عملی سیاسیوں کو زیادہ سروکار اس قسم کے تعلق سے نہیں بلکہ مسائل متنازعہ فیہ سے ہوتا ہے لیکن کسی جمہوریہ میں جس اجرت کو اکثریت حاصل ہو جاتی ہے اس کی نگاہ میں یہ اصول کسی قانون کے بہ مقابلہ زیادہ اہم ہوتے ہیں اور کوئی بھی عملی سیاست داں فرقہ کے پیشانیہ میں اس وقت تک کسی قسم کی طاقت نہیں بہم پہنچائے گا۔ جب تک وہ اس قسم کی طاقت کو ان بنیادی اصولوں سے نہ اخذ کرے گا جن پر ہمسام مہذب اشخاص متفق الرائے ہوتے ہیں۔

اس قسم کے اصولوں کی ایک مثال کے طور پر ہم اس تصور کا ذکر کر سکتے ہیں کہ ہر قسم کی حکومت محکوم کی بہتری کے لئے ہونا چاہئے اگر ایسا نہ ہو تو عموماً اس بات سے عام طور پر اتفاق کیا جاتا ہے کہ کم از کم اکثریت کو حکومت سے زیادہ فائدہ پہنچنا چاہئے۔ یہ اصول ہے افراد کے باہمی تعلقات کے بارے میں اب رہا جمہوروں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ عام طور پر لوگ یہ تسلیم کریں گے کہ عام طبقہ انسانیت کی معمولی حاجتوں سے انقطع نظر کر کے ہر جمہور کو مختلف صورت سے فائدہ پہنچنا چاہئے یہ ایک خطہ جاتی یا مقامی حکومت کا اصول ہے اس قسم کے اور بھی بنیادی اصول لے سکتے ہیں جس سے زیادہ ضروری اصول یہ ہے کہ جن اشخاص کے ہاتھ میں سیاسی اختیارات ہوں انہیں چاہئے کہ خواہ وہ خود زمانہ انتخاب کی تفصیلی سرگرمیوں میں

مشغول ہوں اور خواہ کثیر التعداد اشخاص اس زمانہ میں جب کوئی انتخاب
 و پیش نہیں ہوتا۔ سیاسی مسائل کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیں۔
 لیکن وہ ہرگز ہرگز مقررہ بنیادی اصول نظر انداز نہ کریں۔ اب علم طرز
 سیاسیات کے بائیسے میں یہ کہنا باقی رہ جاتا ہے کہ اس وقت جو صورت
 حالات ہے وہ قطعاً قابل تعریف نہیں قرار دی جاسکتی۔ اگرچہ چند اشخاص
 اس کے مداح ہیں تو ان کو اس امر پر بھی غور کر لینا چاہئے کہ وہ اس
 صورت حالات میں کس قسم کا تغیر پیدا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ایک نہ ایک روز
 اس میں تغیر وقوع پذیر ضرور ہو گا۔ ہر زمانہ میں معیاروں کی تیاری کے لئے
 جہد و جہد ہونا چاہئے۔ بشرطیکہ ہم آنکھ بند کر کے قدرتی طاقت پر اعتقاد
 نہ کریں۔ کیونکہ ایسا کرنا زمانہ قدیم کی جہالت پرستی کے مساوی ہو گا حالانکہ
 بظاہر زمانہ حال کے فلسفے میں قدرتی طاقتوں پر اعتبار کرنے کیلئے
 بہت زور دیا جاتا ہے لیکن معیار بنانے اور اس کے لئے جدوجہد کرنے
 کی بجائے جس قدر ایمان داری کی ضرورت ہے اسی قدر علم بھی درکار
 ہوتا ہے۔ نیک نیت اشخاص خواہ وہ مرد ہوں اور خواہ عورت نہایت
 پسندیدہ اور قابل تعریف ہوتے ہیں لیکن اگر وہ دولتِ مسلم سے محروم
 ہیں تو واقعی ان کا نہایت خطرناک المناظروں میں شمار ہے آج کل سیاسی
 کارروائیوں میں انہی نیت کے بہ مقابلہ علم کی بہت زیادہ ضرورت ہے
 یہ ایک بڑا مسئلہ ہے اور یہاں اس پر بحث نہیں کی جاسکتی لیکن اہل انداز
 اندازہ لگاتے ہیں کہ بجا ہے اس کو ہمیشہ وہ مردوں کی بھلائی

کی فکر رہتی ہے۔ لوگوں کو اپنے فائدے کے غرض سے ایسے عقلمند شہرارت
 پسندوں کی رہنمائی و اجازت زیادہ پسند خاطر ہوتی ہے جو ہمیشہ اپنے مفاد کو نظر
 رکھ کر کام کرنے میں کیونکہ کوئی شخص بھی دوسروں کی بہبودی کے بغیر اپنے اصلی مفاد
 کی فکر نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف نیک نیتی سے بھی واقعات کی لاعلمی کی تلافی
 نہیں ہو سکتی جس چیز کی سبب زیادہ ضرورت ہے وہ ہوسایہ تعلیم اور سیاسی
 پاکیزگی کو خود اپنی خبر گیری کے لئے علیحدہ رکھ دینا چاہئے۔

ضمیمہ اول

اس مضمون کا دوسرے مضامین سے اس قدر قریبی تعلق ہے کہ اس کی حدود بندیوں کی تشریح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے مگر زبانی تشریح کافی نہیں ہے کیونکہ یہاں ہم کو یہ نہیں تحقیق کرنا ہے کہ لفظ سیاسیات کا استعمال کون معنوں میں ہو سکتا ہے بلکہ ان سطور میں ہم کو ایک قسم کے واقعات کا دوسرے قسم کے واقعات سے فرق دکھانا ہے لہذا ان تمام واقعات کا ذکر ضروری ہے جن کا سیاسیات میں حوالہ دیا جاتا ہے۔ بعدہ یہ دیکھنا ہے کہ ان واقعات میں چھوٹے درجے کے واقعات کون ہیں جنہیں معیار کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

سیاسیات کی نوعیت

انسانی زندگی قسم قسم کے افعال خیالات اور واقعات پر مشتمل ہوتی ہے کیونکہ یہ جتنی بھی چیزیں ہیں سب خوراک اور لباس کی بہم رسانی کے لئے معقود ہوتی ہیں یا ان مسائل پر اثر پذیر ہوتی ہیں بعض خیالات اور افعال کا اس تعلق پر اثر پڑتا ہے جو ایک انسان کی سرگرمیوں اور دوسرے انسانوں کی سرگرمیوں کے امین ہوتا ہے۔ گویا زندگی کے جو مختلف شعبے اپنی نوعیت کے مطابق علیحدہ مقرر کر دیے گئے ہیں مختلف علوم میں انہیں پر بحث کی گئی ہے جن میں پہلے

علوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سیاسیات - اقتصادیات - درس مذاہب معنی دینیات جس طرح
 دہری تعلقات کیلئے انسان کے ہر شعبہ میں واقعات کا علم ضروری ہے اسی طرح
 سیاسی شعبوں میں بھی کوئی علم ہونا ایک شرط لازمی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ بھی
 یکتا سے عصر نہیں ہوتا اس لئے تاریخ کا اجرا ایک ضروری بات ہے لیکن اسکا
 ابتدائی تعلق ان فیصلوں سے ہوتا ہے جو ان واقعات کے بائیسے میں
 صادر ہوتے ہیں جن سے ادب و اخلاق کے نسبت خاص معلومات
 کے بغیر کچھ مدعا براری نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے ایک مورخ کو اخلاقی
 فیصلہ پیش کرنے کا کوئی حق نہیں حاصل ہے وہ فیصلہ صادر کرتا ہے
 لیکن ایک حد تک اور وہ یہ ہے کہ بزرگوں کے اثر سے یا اتفاقاً اس کو کوئی
 خاص اخلاقی کسوٹی کا پتہ چل گیا ہو مہنی جب تک اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ
 اخلاق کی رو سے کون بات اچھی معلوم ہو سکتی ہے اور کون خراب گویا سیاسیات
 ایک ایسے علم کا نام ہے جس میں اولاً افراد اور فرقوں کے درمیانی تعلقات
 پر اخلاقی فیصلہ صادر کیا جاتا ہے۔

سیاسیات کا معاشیات سے بھی نہایت گہرا تعلق ہے لیکن یہ
 ضروری بات نہیں ہے کہ جس شخص کو اقتصادیات میں عبور حاصل ہے
 وہ عملی سیاسیات نہیں ہو سکتا کیونکہ اقتصادیات میں صرف مشقت اور
 اشیا کی کار آمدگی کے بائیسے میں سمجھ کی جاتی ہے اور سیاسیات
 میں آزادی ایسی چیزوں کی خواہشات سے بھی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے

جن کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان سے سراسر معاشی فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ اکثر اشخاص سمجھتے ہیں کہ تمام افعال انسانی انکی انتہائی تشبیح و تمجید کے لیے ہیں۔ لیکن اولاً یہ ناممکن ہے کہ کسی ایک کام کے ذریعہ سے تمام مختلف اقسام سرگرمیوں کی صراحت ہو جائے اور ثانیاً اگر تحقیقات کے میدان کو بے حد وسیع کر دیا جائے تو یہ ایک صحیح علم کی حیثیت سے معاشیات کی تمام خوبیاں خاک میں مل جائیں گی۔ یہ کسی طرح بھی فرض نہیں کیا جاسکتا کہ تاریخ میں اقتصادی ضرورت ہی قوت بخیر کہہ سکتی ہے یا مثلاً حریت کے ارمان یا قوم پرستوں کے کشمکش نامہ کی توضیح معاشی مضامین میں ممکن ہے۔ حریت یا انکی انکی نقد قیمت ہو سکتی ہے ممکن ہے کہ کسی ایسی حالت میں جس سے ہم ابھی یہ سمجھیں حریت خوش میمتی پر مبنی ہو لیکن اسکا ہونے پر بھی نقد قیمت کا ذکر کر کے حریت خوش چلانی نظام یا قومیت کے معنی واضح نہیں ہو سکتے گویا جن تعلقات پر معاشریات میں بحث کی جاتی ہے وہ یا تو تجارت یا پیشہ سے متعلق ہو پھر یا جن کا شمار صنفی زمرہ میں ہو سکتا ہے لیکن سیاسی روابط زیادہ تر قانونی یا اخلاقی ہوتے ہیں۔ لہذا سیاسیات اور اقتصادیات میں یہی بڑا بھاری فرق ہے کہ اول الذکر کا رشتہ جماعت کی اسی تنظیم سے ہوتا ہے جو ایک اعلیٰ قسم کی زندگی بنا۔ نے کی غرض سے قائم کیا جاتا ہے یا بالفاظ دیگر سیاسی اور ہر کام یہ ہے کہ ہندو زندگی کو برقرار رکھ کر اس کے مزاج کے لئے جدوجہد کرے۔ یہ کام صرف یہیں تک محدود

نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ سے محض ایسی مادی ضروریات مہیا ہو جائیں جن پر تمام تہذیب کا دار و مدار ہوتا ہے۔

تہذیب کی جو موجودہ صورت ہے اس میں اس کا بھی تعلق معاشرتی تنظیم سے ہوتا ہے کیونکہ یہ نظام فرائض انسانی سے مختلط و منسلک کر دیا گیا ہے لیکن مذہبی تنظیم میں تمام افراد یا تمام گروہوں کا باہمی رشتہ سیاسی تعلق سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک حکومت اور ایک کلیسہ ان دونوں کے مابین جو فرق واقعی حایل ہے اس پر ہمیں بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ دونوں چیزیں شامل تصور کر لی جائیں تو دونوں میں سے کسی ایک چیز کا وجود ضرور مٹ جائے گا۔ اگر ان دونوں چیزوں کو علیحدہ تصور کیا جائے تو ہر ایک ذاتی اغراض میں امتیاز مشکل سے ہو سکتا ہے لیکن ہماری موجودہ مدعا براری کے لئے صرف سیاسی واقعات ہی ایسے واقعات ہیں جو انسانی زندگی کی اُراستگی یعنی تہذیب کی مادی۔ ذہنی اور جذباتی ترقی کو دو لان میں پیش آیا کرتے ہیں۔ اگر کلیسہ کا سلسلہ صرف اسی بات سے ہے اور کسی دوسری مضم کی زندگی سے نہیں ہے تو غالباً اس کی تمام جدوجہد سیاسی قرار دیجاسکتی ہے۔

آخری امر یہ ہے کہ ایک علم ایسا بھی ہے جس میں معاشرتی تعلقات کا درس دیا جاتا ہے اس علم کو علم عمرانیات کہتے ہیں۔ سیاسیات اس علم کی ایک شاخ ہے کیونکہ سیاسیات میں ان مہذب قوموں کا ذکر ہوتا ہے جو ایک قائم شدہ حکومت کی پابند ہوتی ہیں مگر اجتماعیات میں ہر قسم کے انسانی

رد وابط پر بحث کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ قدیم کی جن طاقتوں کی جو
 سے ابتدائی تعلقات قائم ہوتے تھے یا ان میں کسی قسم کا تغیر واقع ہوا تھا
 وہی قوتیں اب تک سیاسی گردہوں میں بھی کام کر رہی ہیں۔ لیکن وہ طاقتیں سیاسی
 زندگی کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ لہذا اس فرق کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہئے
 جو ایک طرف اقتصادیات - دینیات - اور عمرانیات اور دوسری سیاسیات کے
 درمیان واقع ہے مادی عروج کے علاوہ اور بھی دیگر ضروریات میں دنیوی
 فائدہ پہونچنے کے لئے جو مہذب نظام قائم کیا جاتا ہے اس کے درس اور مطالعہ
 کو سیاسیات کہتے ہیں۔ سیاسی امور کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کا سرو
 افراد سے ہوتا ہے اور دوسری قسم کی سیاسیات میں جماعتوں کے رشتہ باہمی بحث
 کی جاتی ہے۔ سیاسیات کے جو معنی بالعموم سمجھے جاتے ہیں اس کے مطابق اس کا
 میل اس رشتہ سے ہے جو ایک مہذب معاشرے یعنی تہذیب یافتہ انسانوں
 کے درمیان ہوتا ہے لیکن اس قسم کا معاشرہ جدا جدا جماعتوں میں منقسم ہوتا ہے مثلاً
 خاندان - شہر - طبقہ - قومیت اور ملک - واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے سیاسی
 امور کی تفریق تحریری اور محض درس کے لئے مقصود ہوتی ہے کیونکہ جن افراد سے
 تکرار کردہ ہوتا ہے ان کے متعلق بحث کے دوران میں خود جماعت کی نوعیت کو قطعاً
 نظر انداز کر دینا مناسب نہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی موزوں نہیں ہے کہ دول کے
 باہمی تعلقات کے بارے میں خیال آرائی کرتے وقت افراد کو طاق نیاں پر مٹھا
 دیا جائے۔ لیکن اصولاً دونوں مسئلوں کو علیحدہ کر کے پہلے افراد اور اس کے بعد گروہوں
 کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ اگر اداروں پر بحث کی جائے گی تو

تفہات افراد کے ضمن میں معاہدات جہازم انفرادی یا تقسیم دولت کے معاملے پر پیش ہو جائیں گے لیکن باتوں پر ان خصوصیات کے علاوہ غور کیا جاسکتا ہے جو قوم یا مملکت کے حالات گرد و پیش میں ہوا کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ باتیں وہ نام اصول ہیں جن کا ہر ایک فرقے کے انسانوں یہ اطلاق ہو سکتا ہے اس کے برخلاف یہیں یہ بھی اٹنا پڑے گا کہ جتنوں کا وجود بھی ایک سیاسی واقعہ ہے خواہ وہ جتنیں آزادانہ میل جول سے قائم ہوں۔ مثلاً تجارتی آئینیں اور خواہ وہ قدر شاظہ و پندہ ہوں مثلاً خاندان قوم وغیرہ اور اس قسم کے گرد و ہول میں جو باہمی تعلق ہوتا ہے اس کا درس بھی سیاسیات کا دور را جزو ہے اس قسم کے واقعات کا علم بھی وہ قسموں پر مشتمل ہے جیسی اس میں اس قسم کے مسائل کے بارے میں اظہار خیالات کیا جاتا ہے۔ جو پیشتر تھے یا فی الحال موجود ہیں ان معنوں میں ہم اس کو علم بیانہ کہہ سکتے ہیں حالانکہ اس میں تفسیر فرقہ اور موازنہ دونوں باتیں ہوتی ہیں یہ ہر مقصد علم سیاسیات کا خواہ اصول معبود اور ارتقاء کا اجرا کیا جائے یا نہ کیا جائے اس کا یہ منشاء اس حد تک ہے جس حد تک ترقی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا یا واقعات کو اچھا یا برا قرار دے کر ان کا مقابلہ نہیں کیا جاتا۔ لیکن ان کے اخلاقی فوائد کا مقابلہ کرنے کی غرض سے بھی سیاسی واقعات کا درس دیا جاتا ہے اور ایسی حالت میں ہم کو محض اس سوال سے سرزد کار نہیں ہونا چاہئے کہ اس قسم کے واقعات پہلے ابھی موجود تھے یا اب وجود میں آیا نہیں بلکہ ہم کو اس سوال پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کا وجود پیشتر فائدہ مند تھا یا اب ہے کہ نہیں۔ یہی مدعی فلسفہ سیاسیات کا بھی ہے جس کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوتا

ہے کہ کیا ہونا چاہئے یعنی جن سے انسان کو ایک اخلاقی معیار کا پتہ چلتا ہے ہم یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ اس قسم کا معیار ہوتا ہے اور تحقیق استفادہ افعال کے علم کی زبان میں اس کی تھوڑی بہت تشبیہ ہو سکتی ہے کیونکہ گریہ بہت کچھ فلسفیانہ پیچیدگی کی گئی ہے لیکن ان تمام باتوں کا بہترین واحد اور قبول عام نتیجہ جن کی اکثر ایسے اشخاص کو خواہش ہوتی ہے جس کو ذرا سا جہی سر و کار سیاسی معاملات سے ہوتا ہے خواہ ناورست ہی کیوں نہ ہو مگر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو فاسخ البالی حاصل ہونا چاہئے۔ اگر کوئی صرف یہ ہی دریافت کرنا چاہتا ہو کہ ایک مذہب جماعت میں کس قسم کی صورت حالات ہونا چاہئے تو اس تصور کی تشبیہ اور بھی تفصیل کے ساتھ کرنا پڑے گی۔ بہر حال یہاں ہم کو صرف یہ واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ اس یا رے میں کہ صورت حالات کس قسم کی قائم ہونا چاہئے کسی معیار کا وجود ہونا بھی ایک سیاسی واقعہ ہے اگرچہ فلسفہ سیاسیات میں اس قسم کے معیار پر بحث کی بھی جاتی ہو تو اس امر کی تحقیق کہ کون کون معیار مقبول ہو چکے ہیں یا ان کی وجہ سے افعال پر کیا اثر پڑتا ہے بہت زیادہ ہوگی ان معیاروں کے انتہائی مقابلہ ایک اعلیٰ درجہ کے یا قیاسی اور وہ کی تجویز کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ لہذا اس مسئلہ میں میں جب ذیل بحث طلب باتیں نظر آتی ہیں۔

(۱) تعلقات افراد (۲) جماعتوں کے روابط (۳) تو اثر واقعات (۴) اخلاقی معیاروں کے اثرات ان کے علاوہ اور کبھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں جن کا ان باتوں سے قریبی لگاؤ ہوتا ہے۔

نصب العین کی نوعیت

یہ ہیں اسوریات لیکن ان گوناگون میں بعض ایسے ہیں جن کو ہم معیار کہتے ہیں اور معیار سے مراد وہ چیزیں یا حالات ہیں جن کو حاصل یا قائم کرنے کی لوگوں کے دل میں خواہش رہتی ہے۔ اور جن سے قانون یا حکومت میں رد و بدل واقع ہو جاتا ہے۔ یا جماعتی تعلقات کے معاملے میں حالات موجودہ کو تبدیل کرنیکی ضرورت ہوتی ہے۔

گویا معیار اولاً ایک تدبیر کی حیثیت سے شروع ہوتا ہے جو ایک شخص کے دماغ میں آتی ہے جو تاریخ صحیح معنوں میں تاریخ ہوتی ہے ہم کو اس میں سے مزاج ابنوہ یا طبع اجتماعی کو خارج کر دینا چاہئے خواہ وہ انشار پر دازی اور شاعری کے لئے مفید بھی ہو جو متعدد امتحان کو ایک ہی جز کی خواہش ہوتی ہو تو ان کا معیار ایک ہوتا ہے لیکن ان کی طبیعت ایک قسم کی نہیں ہوتی اگر ایک گروہ کے متعدد افراد کا طرز عمل ہر شخص کے ذاتی طرز عمل سے جداگانہ ہو تو اس سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان میں کون نئی روح حلول کر جاتی ہے یا ان کے مزاج میں ایک جدید بات پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی وجہ گروہ پیش کے ان حالات کی مدد سے معلوم ہو سکتی ہے جن میں اس وقت ہر شخص گرفتار ہوتا ہے یا جمع کے وجود کا اثر ہر شخص پر پڑتا ہے لیکن آخر الذکر کی قدرتی حالت قائم رہتی ہے۔

لیکن معمولی حالات میں کوئی شخص تنہا نہیں ہوتا۔ ہر انسان پر دوسرے انسان کا اثر پڑتا ہے خواہ وہ کسی زمانہ میں گروہ کے اندر موجود بھی ہوں۔ ہر شخص کے اطوار اس کے معلومات اور خواہشات ان سب چیزوں کے قیام کرنے میں پاس پڑیں کی آبادی کا بھی حصہ ہوتا ہے اسی طرح دنیا میں ہر شخص کوئی مستقل معیار یا پسندیدہ حالت ایسی ہوتی ہے جس سے ایک فرد انسان کے دل میں تحریک ہوتی ہے۔ ہم تمام اشخاص کو اپنے ہمسایوں سے یا تو مدد ملتی ہے یا وہ ہمارے جاوہ ترقی میں ہار جھکتے ہیں۔ لہذا ایسی چیز کے تصور کو معیار سمجھنا چاہئے۔ جس سے انسان کی وہ ترقی ہوسکتی ہے جس کا احساس ان تمام لوگوں کو ہوتا ہے جو ایک دوسرے کے زیر اثر ہیں۔ یہاں ہم ان جملہ عارضی اور چند روزہ ضرورتوں کا ذکر نہیں کرتے جنکی وجہ سے وقتی معیار ظہور پذیر ہو جاتے ہیں اور نہ ہم ایسی بہتر حالتوں کے بارے میں شاعرانہ تخیلات سے کام لیتے ہیں جو واقعی کسی حالت موجودہ میں بدل کرنے کے لئے قوت محرکہ نہیں سمجھی یا محسوس کی گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ معیار کا بیان ہمیشہ شخصی ہوتا ہے۔ لیکن اس قسم کے بعض بیانات میں عام جذبہ اور بعض میں شخصی جوش کا اظہار ہوتا ہے۔

معیار کوئی قسم کے ہوتے ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ کچھ اشخاص صنعت و حرفت کا راستہ اختیار کریں کچھ مذہب پسند ہوں اور بعضے ورزش کو اپنا معیار زندگی قرار دیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صحرا کی فطری دلیلیوں میں اعتقاد نہ رہنے کی وجہ سے بعضوں کو شہر آباد کرنے کی ضرورت کا زیادہ خیال ہو۔ یا وہ سوچ کہ زیادہ بارش

اور ممتاز تصور کرنے کی غرض سے متفق رائے ہو کر ہر کھینچہ کو کلیسا میں حاضری دینا پسند کریں یا وہ اپنی زندگی کے آخری دن تک طالب علم ہی رہنا چاہیں لیکن جتنے بھی معیار دنیا میں ہو سکتے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو سیاسی ہوتے ہیں۔

سیاسی معیار کا وارد مدار سیاسی بے اطمینانی پر ہوتا ہے اس غیر دلچسپی سے یہ مراد ہے کہ لوگوں کو اس بات کا مشاہدہ ہو جائے کہ مختلف مستقل جماعتوں میں ایک ساتھ رہنے والے انسانوں کے تعلقات باہمی میں کوئی خرابی واقع ہے۔ مثلاً یہ معلوم ہو کہ زید بکر اور عمر کو وہاں جانچنا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے جہاں رحمان عسکری اور عابد موجود ہیں۔ یا اولاً کو یہ حق نہیں حاصل ہے کہ وہ ثانی الذکر سے برابری کے پایہ پر گفتگو کر سکیں تو اس سے زید بکر اور عمر ہی نہیں بلکہ رحمن۔ عابد اور عسکری کے دماغ میں بھی ایک یہ عام تصور پیدا ہو جائے گا کہ کاش سب اشخاص کسی نہ کسی لحاظ سے ایک دوسرے کے مساوی ہوتے تو بڑا اچھا تھا۔

دوسری مثال یہ ہے کہ فرض کیجئے کہ ایک جماعت د۔ س۔ ط۔ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے گروہ ب۔ پ۔ ت کے جوہر و ستم کا نشانہ بن رہا ہے تو ایسی حالت میں دونوں جماعتوں کو یہ خیال ہو گا کہ ہر گروہ کو اپنی اپنی امتیازی مصیبتوں کا اظہار کا آزادی کے ساتھ موقع حاصل ہو تو دونوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ گویا جہاں تک سیاست کا تعلق ان افراد سے ہے جو کسی ایک فرقہ میں مل جل کر رہتے ہیں۔

ہونا ایک سیاسی معیار کے دو جدا گانہ جزو ہوتے ہیں۔ کیونکہ ملکن ہے کہ
 کسی وقت ہم ایک جزو کے ان تعلقات پر غور کریں جو دوسرے افراد
 کے ساتھ قائم ہوں اور کسی وقت جماعتوں کے باہمی تعلقات پر نظر
 ڈالیں گویا حریت سے فرد کو دوسرے انسانوں کے طاقت و اختیار کے
 بہ مقابلہ آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان افراد کے گروہ
 بھی ایک دوسرے سے آزاد ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے
 تو غیر ملکی جبر و تشدد کی مخالفت کی جاتی ہے اور اس کے بعد کسی فرقہ
 یا ایک خاص جزو انسان کی اندرونی سختیوں کا مقابلہ کرنے پر زور دیا جاتا
 لگتا ہے۔ یہ دونوں باتیں بالکل جدا گانہ ہیں لیکن حریت انھیں دونوں کے
 میل سے بنتی ہے گویا اس طرح ہم ان کو ایک کلیہ کے اجزائے مشمولہ قرار
 دے سکتے ہیں البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ ان کو منقسم کرنا ایک ایسی تحریک
 کے حصے بن کر کرنا ہے جو درحقیقت واحد ہے معیاروں کی خود سرانہ تقسیم
 اکثر فرقہ دار حکومت کی وجہ سے ہوتی ہے اور ان کا نتیجہ بعض اوقات
 یہ نکلا ہے کہ جماعتی خود اختیاری کی خواہش کے مقابلہ میں اندرونی آزادی
 کی آرزو کے خلاف صدا بلند ہوتی ہے۔ اس طرح ایک فرقہ ایسی ایسی
 باتیں کریگا کہ حقیقی حریت میں قومی آزادی کے تحفظ کی پرواہ ہی نہیں
 کی جاتی بقیہ دوسری جماعت نادانی سے کام لیکر اس قسم کی باتیں
 کر سکتی ہے۔ گویا جماعت میں ایک قوم کا دوسری قوم پر یا ایک فرد کا دوسرے
 فرد پر تشدد کرنا اصل میں کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔ ایک گروہ کی حریت

کی آڑ لیکر اندرونی اصلاح کے علاوہ اور کسی چیز کا طلب گار نہیں ہوگا
 اسی آزادی کے نام پر دوسری جماعت کے دل میں قومی تحفظ کے علاوہ
 اور کسی چیز کا ارمان نہ کہو گا۔ گویا حریت میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں
 اگر ان دونوں اجزاء پر علیحدہ بحث کی جائے تو عقل ایسی تفریق کے ہمیشہ
 قائم رہنے کی ہرگز نہیں اجازت دے سکتی جو جماعتی یا فرقہ دارانہ روایات
 میں پہلے سے بہت زیادہ نمایاں ہے بلکہ اس سے ہم صرف ایک نصب العین
 مختلف پہلوؤں کی زیادہ چھان بین کر سکیں گے۔ جہاں تک کسی معیار کی وجہ
 سے کوئی صورت حالات پیدا ہو جاتی ہے وہاں تک اگر اس میں کوئی
 تغیر واقع ہوتا ہے تو بعض اوقات یہ تغیر حالت مطلوب کے متعلق ایک تنہا
 یا محدود تصور کے سبب سے یا بعض اوقات کسی چھپیدہ اور مرکب خواہش
 سے واقع ہوتا ہے جس سے گروہوں کی انہ سر نو تنظیم بھی ہو جاتی ہے اور
 افراد کے باہمی تعلقات بھی درست ہو جاتے ہیں۔

اکثر استنخاص اس معیار کو اس کے اصلی معنوں میں بھی قوت محرم
 نہیں تصور کرتے ہیں۔ یہ ہمیشہ قریب قریب کسی نہ کسی چھوٹی ضروریات کو
 پورا کرنے کے متعلق ایک قطعی اور محدود خیال میں مضمر ہوتا ہے۔ اس طرح
 ممکن ہے کہ کوئی عظیم شخصیت آزادی کے لئے جدوجہد کرے۔ لیکن ایک
 چھوٹے آدمی کے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنی سبزی کو
 زیادہ قیمت پر فروخت کرنے کی قابلیت حاصل کرنے میں مشغول ہو حالانکہ
 نادانستہ طور پر وہی معیار جو بڑے آدمی کا نصب العین ہے چھوٹے

آدمی پر بھی حاوی ہے۔

مگر جس قدر زیادہ نظر ہم تاریخ کے واقعات گزشتہ پر ڈالتے ہیں وہ خواہشات اسی قدر کم چھپیدہ معلوم ہوتی ہیں بن کے زیر اثر دنیا میں انسان کام کرتے بڑھتے ہیں جہاں امتیاز اور روم کا سوال ہے وہاں فیرتے اور ان افراد کے تعلقات کے اصول پر جو جماعت میں شامل ہیں زیادہ تفصیلی اور جداگانہ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ امتیاز کی حیثیت میں شہر امتیاز کی آزادی اور اہل امتیاز کی انفرادی نجات دونوں چیزیں شامل ہیں۔

نظام روم میں بھی ایک منظم عالم میں روم کی بادشاہت اور اس کے باشندوں کے احکام یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔ لیکن تہذیب میں ترقی ہوتی رہتی ہے انسانوں اور انسانی گروہوں کے تعلقات روز بروز زیادہ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں اس لئے جو لوگ اندرونی آزادی کے لئے جدوجہد کرتے ہیں وہ ان امتیاز سے بالکل جدا ہوتے ہیں جو قومی آزادی کے لئے جان لڑاتے ہیں۔

بعض اوقات یہ دونوں جماعتیں آپس میں مخالف بھی ہوتی ہیں پس زمانہ حال میں جو معیار نمود پذیر ہوئے ہیں ان پر بحث کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آزاد اور گروہوں سے تعلق رکھنے والے معیاروں کے درمیان امتیاز کیا جائے یعنی فرق سمجھ لیا جائے۔

مکن ہے کہ انسان ان پیچیدگیوں کو بلا غور و خوض بیان کرے

جو ان تمام امور میں موجود ہیں۔ مندرجہ بالا چند بندوں کے ساتھ سیاسیات میں حصہ لینا بھی جماعت میں ایک جہذب انسان کا کام ہوگا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ بلند ترین ہی ہو۔ لہذا سیاسی زندگی کے اعلیٰ ترین گروہ یعنی مملکت ان معنوں میں کامل طور پر باختیار نہیں ہوتی کہ جب انسان کو دو طرفہ فراموشی کرنا پڑتی ہے یعنی ایک طرف حکومت اور دوسری طرف کسی دوسری معاشرتی جماعت کی تو حکومت کی اطاعت ہی اعلیٰ ترین تصور نہیں کی جاسکتی۔

مملکت کے بائے میں جو فلسفہ قدیم سے چلا آتا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ حکومت بذات خود مکمل ہوتی ہے لیکن خالص سیاسی زندگی یا سیاسی فریضے کے لحاظ سے بھی زمانہ حال کی کوئی دولت اقتصادی یا سیاسی نقطہ خیال کے مطابق دوسروں سے مستغنی نہیں ہوتی۔ لہذا نشاۃ جدیدہ کے خیال کے مطابق بھی یہ بالاتر میں نہیں ہے افلاطون اور ارسطو دونوں کا خیال تھا کہ حکومت خود اپنی ضرورتاً مہیا کر سکتی ہے۔ اور ان کا خیال کسی قدر ان حکومتوں کے بائے میں درست بھی تھا جن سے وہ واقف تھے لیکن قانون و حکومت کے متعلق بحث و مباحثہ کیلئے مملکتوں کے باہمی تعلقات کو محض ایک ضمیمہ قرار دیتے رہنا ایک گویا متروک خیال کو ہمیشہ کے لئے برقرار رکھنے کے مساوی ہے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ آزادی یعنی غیروں کا محتاج نہ ہونا ہی حکومت کا خاص جوہر ہے۔ آجکل تمام دول برابر حل کر کام کر رہی ہیں اور ہر حکومت کی نوعیت کا دوسروں کی نوعیت پر اثر پڑتا ہے اب یہ معیارات یہ فرق کی شائستگی کے خیال سے اہم ہوتے ہیں۔ جس وقت کوئی انسان جماعت کیلئے کام کر رہا ہو تو اس کی تہذیب اور اس کے

اخلاق اس حالت کے بالمقابل ادنیٰ درجے کے نہ ہونا چاہئے جب وہ خود اپنی ذات کے واسطے جدوجہد کرتا ہے۔

علاوہ پریں ہر کردہ کے ہر رکن کو جہاں تک وہ فرقہ ایک اخلاقی عمت ہو کبھی اپنے نمائندے کے کسی ایسے فعل سے مستعیند ہونے کے لئے مضامند اور تیار نہ ہونا چاہئے جس کے سرزد کرنے میں خود اس کو شرم اور مذامت معلوم ہو

ضمیمہ نمبر ۲

ارتقاء سیاسی کی دلیل

اب تک جو کچھ بھی بتایا جا چکا ہے اس کا مشابہ ہے کہ سیاسی ارتقاء میں دلیل ایک نہایت اہم شے ہے کیونکہ ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ بعض معنوں میں معیار عقل آرائی کا نتیجہ ہوتا ہے جس حکومت کی انسان کو خواہش ہوتی ہے اسکی صورت پہلے ذہن میں قائم ہو جاتی ہے اور اس کا ذہن میں قیام معنی تصور کسی حد تک دلائل و براہین سے ہوتا ہے۔ بہر حال آجکل عموماً اور سیاسیات میں خصوصاً استدلال کی خدمت کی جاتی ہے۔ فلسفہ عامہ میں جو طرز عمل بالعموم اختیار کیا جاتا ہے اس کی جماعت میں برگسن کا نام لوگ بہت آسانی سے پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں برگسن اس طرز عمل کا ایک مجسمہ تھا۔ مگر یہ ہے کہ برگسن بذات خود طریقہ استدلال کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھتا بلکہ اس کے پیروایا کرتے ہیں۔ اس کی زبان سے کم از کم یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے کسی قدر زیادہ دقیق طریقہ موجود ہے اس قسم کا رویہ ان باتوں کے خلاف ہے جو اس کتاب میں درج کی گئی ہیں لیکن اس سے لازمی طور پر

عام سوال نہیں پیدا ہوتا ہے۔ سوریل میکے وگل اور اگر اہم ویلاز کی تصنیفوں میں جہاں سیاسیات کا کسی قدر محدود ذکر کیا گیا ہے۔ دلیل سے کام لینے کے طریقہ کی ان میں بھی کم وقعت کی گئی ہے۔ البتہ یہ ضرور درست ہے کہ ان میں سے کوئی مصنف بھی ان کی زبان کی طرح نامناسب طریقہ سے مستند اصولوں کا حاکم نہیں ہے۔ مگر برکیٹ ارسطو۔ افلاطون۔ کینٹ۔ فیشٹے ہیگل۔ اسپینوز اور مل کے خیال کی مخالفت میں کسی قدر سرگرمی ان مصنفوں نے ضرور دکھائی ہے کہ انسان کو وہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے جسکو عقل قبول کرے۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ فلسفیانہ روایات میں استدلال کو بہت منزلت حاصل ہے۔

اب سوال یہ ہے سیاسی تغیر واقع کیونکر ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ زمانہ پیشین کے فلسفیوں نے اس قسم کے تمام تغیرات میں دلیل کے با اثر ہونے کو بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا تھا لیکن جدید مصنفوں نے بالکل اس کے خلاف کیا ہے ان دونوں میں کسی قسم کی مصالحت کرنے کا دعویٰ کئے بغیر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے۔ وہ طریقہ استدلال کے ان اثرات کی ایک تصحیح شدہ صورت ہے جن سے زندگی میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ آجکل استدلال سے جو نفرت کیجاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کے دل میں اس کی نوعیت کا غلط خیال قائم ہو گیا ہے اس نکتہ کے جو معنی و مفہوم سمجھے ہیں اس کے مطابق ہم یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ استدلال کے طفیل سے معیاروں کا وجود ہوا ہے اس طرح سے ان کا

اثر سیاسی ارتقاء پر پڑتا ہے۔
 حالانکہ یہ ایک چھوٹی سی بات ہے مگر یہ پہلے سے بتا دینا چاہئے کہ استدلال
 سے کلام لینا منطق میں داخل نہیں ہے۔ اس کا طریقہ محتاج بیان نہیں ہو گا۔
 منطق بالکل بیکار شے بھی ہو مگر استدلال کسی طرح بھی غیر موثر نہیں ہے لیکن
 اکثر مصنفوں کا اور خصوصاً ان مصنفوں کا جو واقعات کی تحقیق و تفتیش ان کے
 اسباب - حالات گرد و پیش نیز ان کے نتائج کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ بظاہر
 یہ خیال ہے کہ منطق پر حملہ کر نیسے استدلال کی بے وقعتی ہو جاتی ہے خواہ بابا
 و عقل کے قوانین بیان نہ ناکارہ بھی ہو مگر استدلال سے کام لیتا حقیقتاً اسی کا
 ذریعہ ہو سکتا ہے۔

پس جب یہ کہا جاتا ہے کہ استدلال کا اثر سیاسی ارتقاء پر پڑتا ہو
 تو اس سے خواہ مخواہ مراد کلام یہہ نہیں ہوتا کہ منطق کا قانون اپنا کام کر رہا ہو
 حالانکہ انسان کے دل میں یہ شک و شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ منطقوں نے استدلال
 کی تشریح کرنے میں جو غلطیاں کی ہیں یا جو نقائص ان کے بیان میں رونما
 ہو گئے ہیں ان کو بہت منزلت دیدی گئی ہے۔

نمائندہ استدلال سے کام لینا بحث و مباحثہ نہیں جو جن ملکوں میں سیاسی
 انتظام جماعتوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہاں مناظرہ کے وقت بحث و مباحثہ
 کام لیا جاتا ہے۔ بحث و مباحثہ ایک چیز ہے اور استدلال دوسری شے۔ کیونکہ
 بحث و مباحثہ میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے کسی
 ایسے خیال کے بارے میں عذرات معلوم ہو جائیں جو ان عذرات کی تحقیق کے

قبل ہی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس حالت میں یہ ہی طریقہ قدرتی ہے جب کوئی جماعت ایک پروگرام معین کر دیتی ہے یا کسی روایت کے مطابق کوئی کارروائی برائے عمل پسند کی جاتی ہے اور مقرر یا مصنف کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ اس کی حمایت کرے۔

کیل کا کام یہ نہیں کہ وہ یہ دیکھا کرے کہ مقدمہ سچا ہے یا جھوٹا یا اس موکل حق بجانب ہے یا نہیں اس کا تو کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ شہادت چھپا کر کے اور باقی تمام شہادتوں کو رد کرنے اور نہایت خوبی کیساتھ اپنے موکل کی طرف سے وکالت کرے۔ اگر مقدمہ راست ہی تو کیا ہی اچھی بات ہے لیکن خواہ مقدمہ سچا ہو بھی مگر اس کی کامیابی کیل کی قابلیت بہم رسانی شہادت پر منحصر ہوتی ہے۔ صفائی پر غور کرنے کے قبل ہی اس کے مقدمہ کی حالت تسلیم کر لی جاتی ہے۔ جو شہادت اس کے خلاف گزرتی ہے اس کو صرف ایک ایسا اعتراض قرار دیا جاتا ہے جس کا جواب دینا پڑے گا۔ علاوہ بریں جو کچھ ہمارے کہنے کا منشا ہی اس کو یوں سمجھنا چاہیو کہ ایک ماہر علم الہیات کی جدید حقیقت کے دریافت کے لئے کو شان نہیں ہوتا۔ حقیقت کی اس کو پیشتر سے واقفیت ہوتی ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ اس بات کو صحیح تسلیم کر لیتا ہے جو اس کی عجیب غریب روایت میں حاصل ہے بعدہ وہ اس کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے دلائل کی تلاش میں سرگرواں ہوتا ہے مسئلہ کے ابتدائی پہلوؤں پر غور کرنے کے قبل ہی اس کے نتائج و مبالغہ میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کو وہ منزل جہاں اس کو پہنچنا ہے پہلے سے معلوم ہوتی

صرف ان کے دل میں خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس منزل پر پہنچنے یا اس مقصد کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کو اپنے مسلک کے خلاف جو شہادت ملتی ہے وہ محض ایک ایسی دشواری ہوتی ہے جس کا اس کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے بشرطیکہ وہ اس شہادت کو شیفت پر مبنی نہ قرار دے گویا وہ حقیقت کسی شہادت پر بحث و مباحثہ نہیں کرتا کیونکہ جو شہادت اس کے خیالات کے برعکس ہوتی ہے اسکو وہ شہادت کے زمرہ میں شامل ہی نہیں کرتا۔ بخیر یہی حالت ایک ایسے مدبر کی ہوتی ہے جس کا کسی جماعت سے تعلق ہوتا ہے اس کو ایک بات کرنا ہے اور اس کے کرنے کے لئے اس کو ایسے دلائل کی تلاش رہتی ہے جو اس کے حق میں مفید ہوں۔ لیکن ایسا کرنا استدلال میں داخل نہیں ہے۔ استدلال سے کام لینا تو ایک قسم کی دریافت یا تحقیق میں داخل ہے۔ اس میں ایک نامعلوم اور غیر تحقیق شدہ دنیا میں قدم رکھا جاتا ہے۔ یہ ایک تجربہ ہے جو تاریکی میں اس کے کیا جاتا ہے کہ روشنی نظر آسکے استدلالی طریقہ کے آغاز میں پہلے تو صرف شہادت ایسی چیز نظر آتی ہے جس پر جس غور کرنا پڑتا ہے۔ بالآخر یہ شہادت ہم کو ایسی حالت میں پہنچا دیتی ہے جو پیشتر کبھی نہ ہو جو دھنسی۔ پس حجت و بحث استدلال کے بالکل معکوس ہے۔ یہ استدلال کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے کیونکہ اس سے نمانی الذکر کا طریقہ بالکل الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔

اکثر تو یہ حجت و بحث استدلال فرسودہ کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ کیونکہ جس خیال کو بعض اشخاص اپنا بناتے ہیں کسی ایسے آدمی کے استدلال کا نتیجہ ہوتا ہے جس کی تلاش وہ گزشتہ گمان کے پامال شدہ خیالات کے مدفن

میں کیا کرتا ہے۔ ہم بحث و حجت کے خلاف کچھ نہیں کہتے کیوں کہ اگر آپ اپنی رائے پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو یہ بڑی اچھی بات ہوگی کہ آپ اس کے لئے ثبوت بھی تحقیق کر لیں۔ ایسا کرنے سے آپ کا ساتھ دینے میں لوگوں کو زیادہ خوشی ہوگی کیونکہ آپ مستند اقوال کو کم مائیں گے اس طرز سے آپ ایک زیادہ مہذب شہری بھی ہو جائیں گے۔ کیونکہ غالباً آپ اپنی رائے کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے حجت و تکرار مدت تک قائم رہ سکتی ہے۔ بعض قوموں میں تو گفتگو کا یہ ہی ایک نعم البدل ہے۔

بہر حال حکما کو حقیقت رسی کے ایک وسیلہ کی حیثیت سے بحث و حجت کے نقص کے باعث استدلال کی مذمت نہیں کرنا چاہئے۔ استدلال کسی چیز کے متعلق نصف واقفیت ہو جاتی ہے تحلیل و تالیف سے اس کی تکمیل ہو ا کرتی ہے شہادت اس شخص کے لئے بالکل بیکار شے ہے جس کو آگاہی نہ حاصل ہو۔ خواہ اس شہادت کی تشریح و ترتیب کتنی ہی زیادہ عمدہ کیوں نہ واقع ہو ہی ہو۔

یہ خشک بھی دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کو دعوت نہیں ہوتا۔ حالانکہ بہت سے اشخاص اپنی اس واقفیت کو کام میں نہیں لاتے ہیں لیکن استدلال کی تشریح کسی اور اصلاح سے نہیں ہونا چاہئے اگر کسی شخص کو یہ ذرا بھی نہیں معلوم ہے کہ وہ طریقہ کون ہو سکتا ہے جس کو ابھی تک حجت و بحث سے مختلف بتاتے آئے ہیں تو اب زیادہ خامہ فرسائی بالکل بے سود ثابت ہوگی۔

استدلال کو سمجھنے کے لئے لوگوں نے اس کا استعمال ضرور کیا ہوگا
 ایک طریقہ کی حیثیت یہ بے نظیر ہے کوئی بھی اس شخص کو اس کے معنی نہیں سمجھا
 سکتا جس نے کبھی استدلال سے کام نہ لیا ہو۔ اگر اس کا مفہوم سمجھا یا بھی گیا
 ہوگا تو اس طرح جیسے کوئی کسی نابینا کو رنگ کے معنی بتا سکتا ہے۔ لہذا استدلال
 کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے اور حجت و مباحثہ کے مابین جو
 فرق واقع ہے اس کو بخوبی ذہن نشین کر لیا جائے اس فرق کو سمجھنے کے لئے
 اس کا تجربہ کرنا لازمی ہے۔ لیکن استدلالی طریقہ سے مجبوراً کام لیا جائے۔ یہ وہ
 طرز ہے جس سے ایسے کاروباری معاملہ کو تقویت پہنچتی ہے۔ جو محض زمانہ قدیم سے
 روایتاً نہ چلا آتا ہو۔ یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جس کے ذریعہ سے رسل و رسائل میں
 روز بروز زیادہ آسانی ہوتی جاتی ہے۔ قدرتی طاقتوں کے بائے میں ہمارے
 معلومات سے بدرجہ اتم فائدہ حاصل ہونے لگتا ہے۔ دنیا میں استدلال اس قدر
 کافی مقدار میں موجود ہے کہ لوگ بخوبی اس کی ماہیت سمجھ سکتے ہیں۔ صرف وقت یہ
 ہے کہ بعض مسائل میں اس کا بالعموم استعمال نہیں کیا جاتا ہے لیکن تمام مسئلوں میں
 محض اسی طریقہ سے ہیں اس باتوں کا علم ہو سکتا ہے جن سے بیشتر واقفیت نہیں
 تھی اس کے استعمال کے متعلق جو عام قوانین ہیں وہ منہل میں پائے جاتے ہیں
 اور اکثر یہ بیان بھی کئے گئے ہیں بالآخر یہ امر بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہر
 روشوں میں دماغ سے کام لیا جاتا ہے انہیں کے مانند استدلال کی بھی مخصوص
 درجہ بندیاں اور امراض کی طرح مشہیں ہوتی ہیں۔

طبع

مضمون سیاسیات متغالبہ پر فاضل پروفیسر بنے کمار سکر حنا
کی لکھی ہوئی کتاب

”سیاسی ادارات و نظریات ہنوو“

کا بھی اردو زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے ممکن ہے کہ غمغشا
شائع ہو سکیگا۔

کتاب ملنے کا پتہ۔

”مرشکشی میں“

حمایت نگر۔ حیدرآباد دکن

یہ کتاب

یٹاکڈ ہل کے کاغذ ڈیل ڈمی (سائز ۳۶ ۲۲۸ اینچ)

وزنی ۳۶ پونڈ پر چھاپی گئی ہے

مطبوعه مطبع عهد آفرین حیدرآباد دکن

